جمہوریت

عقل و نقل کے آئینے میں

مصنف

شیخ التفسیر والحدیث

حضرت اقدس مولانا نور محمد صاحب (دامت برکاتہم العالیہ)

ناشر مکتبہ جامعہ دار العلوم وزیرستان

جمہوریت عقل و نقل

کے آئینے میں

مصنف

شیخ التفسیر والحدیث حضرت اقدس مولانا نور محمد صاحب (دامت برکاتہم العالیہ)

مہتمم جامعہ دارالعلوم وزیرستان ایجنسی وانا

فون نمبر : 0965-210786

ناشر

مکتبہ جامعہ دارالعلوم وزیرستان

نام کتاب .... جمہوریت عقل و نقل کے آئینے میں

مصنف .... حضرت اقدس مولانا نور محمد صاحب (دامت برکاتہم العالیہ)

طبع اوّل .... اپریل ۲۰۰۳ء

تعداد ۱۰۰۰

کمپیوٹر کمپوزنگ .... شعیب اللہ خان

...... ملنے کا پتہ ......

مکتبہ جامعہ دار العلوم وزیرستان

نزد حافظ میڈیسن کمپنی اڈا بازار وانا

ضلع ڈیرہ اسماعیل خان

فون نمبر : (0965)210783-210696

ناشر

مکتبہ جامعہ دار العلوم وزیرستان

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سبب تالیف

الحمدللہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانا اللہ
والصلوۃ والسلام علی محمد وآلہ واتباعہ اجمعین

امابعد!

زمانہ قدیم سے باطل قوتوں نے حق کے خلاف ہمیشہ سے جو موثر حربہ استعمال کیا ہے وہ خلاف حقیقت اور منفی پروپیگنڈا ہے۔ ہر دور میں باطل کو مرغوب اور مقبول بنانے کا یہ حربہ اس مہارت اور سلیقے سے استعمال کیا گیا کہ لوگ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ، حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھ بیٹھے۔

فن تلبیس کا بانی ابلیس ہے جس نے انسانیت کی ابتدا اور ظہور حق کے ساتھ ہی خلیفۂ زمین حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں کے خلاف ایک موثر قوت آزمائی کا اعلان کیا اور یہ درحقیقت "پروپیگنڈا مہم" ہی کا منصوبہ تھا جس کے متعلق شیطان نے برملا کہا:

قولہ تعالیٰ! قال فبما اغویتنی لا قعدنّ لھم صراطک المستقیم○ ثم لآتینھم من بین ایدیھم ومن خلفھم وعن ایمانھم وعن شمائلھم ولا تجد اکثرھم شاکرین○ (پارہ:۸۔اعراف۔آیت:۱۶)

"ابلیس نے کہا پس جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا، میں بھی ضرور بیٹھوں گا (اولاد آدم کی) تاک میں تیری سیدھی راہ پر، پھر ان پر حملہ کروں گا ان کے

آگے سے اور پیچھے سے اور ان کے دائیں بائیں سے اور نہ پائے گا تو ان کے اکثروں کو اپنا شکر گذار"۔

یعنی دھوکا دہی، اور پروپیگنڈا مہم کے ذریعے سے انسان پر حملہ آور ہوں گا اور ان کے لئے باطل کو مرغوب اور مزین کر کے راہ حق سے برگشتہ کروں گا۔ ایک دوسری جگہ اس کی دھمکیوں کا بیان ہے:

قولہ تعالےٰ! رب بما اغویتنی لا زیّنن لھم فی الارض ولا غوینّھم اجمعین ○ الا عبادك منھم المخلصین ○ (پارہ ۱۴۔ الحجر۔ آیت ۳۹)

"(ابلیس) نے کہا اے رب جیسا کہ تو نے مجھے (آدم کے سبب) گمراہ کیا میں بھی ان سب کے لئے خواہشات کو مرغوب بناؤں گا اور سب کو گمراہ کروں گا بجز ان میں سے تیرے چنے ہوئے بندوں کو"۔

ابلیس کا یہ اعلان کہ میں اولاد آدم کی اکثریت کو دھوکہ دہی اور پروپیگنڈا کے ذریعے راہ حق سے بہکا کر رہوں گا، صرف زبانی جمع خرچ نہ تھا بلکہ ابلیس نے عملی میدان میں ثابت کر دکھایا جس کی گواہی نہ صرف تاریخ انسانیت دے رہی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

قولہ تعالےٰ! ولقد صدق علیھم ابلیس ظنہ فاتبعوہ الا فریقا من المومنین ○ (پارہ ۲۲۔ السباء۔ آیت ۲۰)

"اور تحقیق شیطان نے ان پر اپنا گمان سچ کر دکھایا، سب اس کے تابع ہو گئے بجز مومنین کے ایک گروہ کے"۔

جس گمراہ کن حربے کی ابتدا ابلیس نے کی تھی آج اس کو طاغوتی قوتوں نے ایک فن کا نام دیا ہے۔ اب اس فن کے ماہرین کا کہنا ہے کہ جو بات عوام میں مقبول اور مشہور کرنی ہو اسے اس کثرت سے دہراؤ اور مختلف خوشنما طریقوں سے یہاں تک اسکی تشہیر کرتے رہو کہ

لوگ اس کی صداقت پر یقین کر لیں۔

سائنسی ایجادات کی بدولت ماضی کی نسبت آج باطل قوتوں کو عوام الناس کے ذہنوں کو زہر آلود کرنے کے لئے بہت زیادہ سہولتیں حاصل ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی، (پرنٹ میڈیا اور لیکٹرونک میڈیا) فلموں، وڈیو اور پریس نے کرہ زمین کو ایک بڑے ہال میں تبدیل کر دیا ہے کس لئے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے درمیان برائے نام فاصلے رہ گئے ہیں ہر خطے کے لوگ دوسرے خطے والوں کو دیکھتے اور سنتے ہیں۔

چونکہ ان تمام نشریاتی اور مواصلاتی اداروں پر طاغوتی قوتوں کا تسلط ہے اس لئے ان کے پروپیگنڈے کے مضر اثرات سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا ہے "الا ماشاء اللہ تعالیٰ"۔

مثال کے طور پر گذشتہ ایک صدی سے "جمہوریت" کے حق میں مسلسل اتنے وسیع پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا گیا کہ آج ہر ایک انسان بن دیکھے جمہوریت کا عاشق بنا ہوا ہے۔ خواہ وہ مروجہ جمہوریت کی حقیقت کو جانتا ہے یا نہیں۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

(ترجمہ۔ عشق صرف محبوب کے حسن و جمال کو دیکھ کر ہی نہیں ہوتا بلکہ محبوب کی دلربائی کی داستانیں سن سن کر بھی کوئی اسکا گرویدہ بن سکتا ہے)

موجودہ دور میں عالمی سطح پر جو اہمیت اور ہر دلعزیزی لفظ "جمہوریت" کو حاصل ہوئی کسی اور کلمہ کو حاصل نہ ہو سکی، تمام خرابیوں اور بربادیوں کی اصل علت اور سبب "جمہوریت" کا نہ ہونا قرار پاتا ہے اور جملہ سیاسی قائدین عوام کو یہ باور کرانے میں رطب اللسان ہیں۔ کہ غریب کی غربت کی داستان ہو یا مظلوم کے ظلم کا افسانہ، نا انصافی کا دور دورہ ہو یا بدامنی اور غنڈہ گردی کا راج، معاشرتی بے چینی ہو یا معاشی زبوں حالی، بدعنوانی اور رشوت ستانی کا بازار گرم ہو یا حکومتی حسن انتظام کا فقدان، ان تمام مشکلات کا واحد حل جمہوریت کی

بحالی یا اس کا نفاذ ہی ہے اور بس۔

نتیجہ یہ کہ آج دکھی انسانیت کی نظریں جمہوریت کے لئے ترس رہی ہیں۔ آج کسی سربراہ مملکت، حکومت، پارٹی اور لیڈر کے لئے جمہوریت نوازی سے زیادہ کوئی صفت قابل رشک اور باعث اعزاز نہیں، یہاں تک کہ اگر کسی ترقی پذیر ملک میں کوئی ایک آدھ خصلت جمہوریت وجود میں آجائے تو مشرق و مغرب کی سپر طاقتیں نہ صرف مبارکباد دیتی ہیں بلکہ جمہوریت کے استحکام کے لئے فیاضانہ طور پر وافر مالی معاونت بھی کرتی ہیں۔ جمہوریت کی بحالی میں اگر کسی نے کوئی کردار ادا کیا ہے تو تمام طاغوتی قوتیں نہ صرف اسے قومی ہیرو کے طور پر پیش کرتی ہیں بلکہ اسے دل کھول کر اعزازات و تمغات سے نوازا جاتا ہے۔ طاغوتی قوتوں کے اس پراپیگنڈے کی کامیابی کا یہ عالم ہے کہ آج خالص اسلامی ممالک میں بھی اگر کوئی پارٹی یا لیڈر عوامی مقبولیت حاصل کرنے کا خواہشمند ہو تو اسے ہزار مرتبہ جمہوریت کی ثناخوانی کرنی ہوگی بلکہ بعض یار لوگ تو دین اسلام کی تعریف اور اچھائی مغرب پر اس انداز سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ "اسلام میں بھی جمہوریت ہے"۔

مسلمانوں کے احساس کمتری کی حد دیکھئے کہ ان کے نزدیک ام السیئات (یعنی مروجہ جمہوریت) کا ام الحسنات اور خیر مطلق ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تو سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس لئے دین اسلام کو "خوبیوں کا گلدستہ" ثابت کرنے کا آسان طریقہ یہ نکالتے ہیں کہ اسے جمہوریت کا حامل قرار دیا جائے یا جمہوریت سے مشابہت دی جائے۔

آج بعض عناصر "اسلامی جمہوریت" کا نعرہ بلند کر رہے ہیں، نہ جانے یہ پیوندکاری اسلام کی ہر دلعزیزی اور کمال ثابت کرنے کے لئے کی جا رہی ہے یا جمہوریت کو مسلمان بنانے کے لئے یہ لوگ ایک بے جا کوشش کے طور پر ایسا کر رہے ہیں۔

خرد کا نام جنون رکھ دیا جنون کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

مروجہ جمہوریت کی تعریف اور پہچان کیا ہے؟ اس کی تاریخ تاسیس، اس کے بنیادی اور ترکیبی اجزاء، اس کے اغراض و مقاصد اور وہ اسباب و عوامل جن کے نتیجہ میں جمہوریت ظہور پذیر ہوئی، کیا ہیں؟ نیز یہ کہ مروجہ جمہوریت اپنانے کے نتیجے میں مسلمان نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ آج کے دگرگوں حالات کے پیش نظر میں نے مناسب سمجھا کہ ان تمام امور پر مستند اور حقائق پر مبنی مواد جمع کیا جائے اور پھر "دینِ جمہوریت" کا "دینِ اسلام" کے ساتھ موازنہ کر کے ایک اجمالی خاکہ قارئین کے سامنے رکھا جائے تاکہ ناظرین خود فیصلہ کریں کہ "دینِ اسلام" اور "دینِ جمہوریت" کی آپس میں کوئی مناسبت ہے بھی یا نہیں۔ اور اگر نہیں؟ تو کس دین کے دامن میں اقوام عالم کی مشکلات کا واحد حل مضمر ہے۔

دوران تحریر میری مخلصانہ کوشش ہوگی کہ ہر قسم کی تنگ نظری اور گروہی تعصب اور جذباتیت سے اپنے ذہن کو صاف رکھوں تاکہ قارئین کے سامنے اصل حقائق پیش کر سکوں اور مجھے قارئین سے بھی یہی امید ہے کہ وہ بھی خالی الذہن ہو کر حقائق سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

فالحمدللہ الذی ھدانا لھذا وھو الموفق للرشاد.

باب اول

جمہوریت کی ابتدا

جمہوریت (Democracy) ایک ایسی اصطلاح ہے جو سب سے پہلے یونان میں رائج ہوئی اور یہیں شہری جمہوری حکومت نے وہیں سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ یہ بات انتہائی دلچسپی کا موجب ہے کہ یونان میں جمہوریت کا آغاز، اس کی نشوونما اور ارتقاء "شرک" کے تصور سے ہوا۔ یونانیوں کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اہل یونان کو بادشاہی جبر واستبداد سے کس طرح نجات دلائی جائے؟ مفکروں اور فلاسفروں کو جو ترکیب سوجھی وہ نہایت دلچسپ تھی۔ انہوں نے مذہبی حوالے سے اس فکر کو عام کیا کہ زندگی، موت، بارش، قحط، صحت، مرض وغیرہ کے الگ الگ خدا ہیں اور ایک خدا دوسرے خدا کے معاملے میں دخل نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک فرد یا خاندان بیک وقت کئی متضاد کیفیات سے دوچار ہوتا ہے مثلاً دولت ہے تو صحت نہیں ایک ہی گھر میں ایک مرتا ہے اور دوسرا جنم لیتا ہے۔ اس طرح ہر ایک خدا اپنے اپنے اختیارات استعمال کر رہا ہے اور اگر سب اختیارات ایک خدا کے پاس ہوتے تو دنیا میں متضاد کیفیات رونما نہ ہوتیں۔ لوگ جب آہستہ آہستہ اس منطق کے قائل ہو گئے اور دل کی گہرائیوں سے اس کے حامی بن گئے۔ تو اب ان ارباب فکر و فلسفہ کو اپنی بات آگے بڑھانے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے اگلے مرحلے میں عوام کو یہ بات باور کرائی کہ جب خدا خود تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتا اور نظامِ کائنات چلانے کے لئے اس نے دوسرے خداؤں کو اختیارات سپرد کر رکھے ہیں تو یونان کا بادشاہ خدا سے زیادہ طاقتور اور بڑا تو نہیں جو اکیلا ہی تمام اختیارات کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ اس طرح لوگوں نے بادشاہ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا

کہ معاشرے میں اختیارات کی تقسیم ہونی چاہئے۔ اس سے یونان کے "جمہوریت آشنا"
ہونے کے تاریخی اور فلسفیانہ پس منظر کا سراغ ملتا ہے۔ (ماخوذ از "ماہنامہ المرشد" لاہور اپریل ۱۹۹۰ء)
اس تاریخی پس منظر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جمہوریت کی خشت اول
"شرک" پر رکھی گئی ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

جمہوریت کی تعریف اور پہچان

جمہوریت عربی زبان کا لفظ ہے جو لفظ "جمہور" کے آخر میں "یت" کا لاحقہ لگا کر بنایا گیا ہے۔ جمہور کے معنی ہیں عوام، لوگ، خلق اور اکثریت وغیرہ۔ انگریزی میں جمہوریت کا ہم معنی لفظ "ڈیموکریسی" (DEMOCRACY) ہے یہ لفظ لاطینی زبان کے دو لفظوں سے مرکب ہے (DEMO) یعنی عوام اور "کراتو" (KRATU) یعنی طاقت جو بعد میں کریسی (KRACY) بنا۔ مرکب لفظ کا معنی ہے "عوام کی طاقت" ایک دوسرا لفظ ہے "ری پبلک" (REPUBLIC) یہ بھی دو لفظوں سے مرکب ہے (REAL) یعنی حقیقی (PUBLIC) یعنی عوام، مرکب لفظ کا معنی ہے حقیقی عوام، غرض یہ کہ جمہوریت اور اس کے ہم معنی لفظوں میں لغت کے اعتبار سے عوام یا اکثریت کا مفہوم شامل ہے۔

یہ تو لفظ جمہوریت کے لغوی معانی ہیں جس سے بحث کرنا میرا موضوع نہیں۔ میرا "موضوع بحث" جمہوریت کا وہ مفہوم ہے جو علم سیاست کی اصطلاح میں مراد لیا جاتا ہے۔ علم سیاست میں جمہوریت ایک خاص طرز حکومت (A Form Of Government) ہے۔ جس کی سب سے بہتر تعریف وہ سمجھی جاتی ہے جو جمہوریت کے گڑھ "امریکہ" کے مقتول صدر ابراہام لنکن نے کی ہے۔

"DEMOCRACY IS THE GOVERNMENT OF THE PEOPLE BY THE PEOPLE AND FOR THE PEOPLE

"جمہوریت وہ طرز حکومت ہے۔ جو عوام کی ہو، عوام کے ذریعے ہو، اور عوام کے لئے ہو، یعنی وہ حکومت جس میں حاکمیت، شارعیت، قانون سازی، اقتدار اعلیٰ اور اتھارٹی صرف اور صرف عوام کے پاس ہو۔ اس حکومت کی تاسیس و بقا اور مستحکم رکھنے کی طاقت کا سرچشمہ عوام ہوں اور اس حکومت کا قبلہ مقصود بھی عوام ہی ہوں یعنی عوامی رضا مطلوب ہو"۔

(ماہنامہ الحق فروری ۱۹۷۳ء ص:٣١)

جمہوریت کی اقسام

مختلف ناموں اور عنوانوں کے ساتھ جمہوریت کی کئی اقسام بیان کی گئی ہیں۔

١۔ براہ راست جمہوریت :

یعنی ایک ایسی طرز حکومت جس میں سیاسی فیصلوں کا حق براہ راست مجموعی طور پر شہریوں کو حاصل ہوتا ہے اور "اکثریت کی حکومت" کے اصول کو ضابطہ قرار دیا جاتا ہے۔

٢۔ نمائندہ جمہوریت :

یعنی وہ طرز حکومت جس میں سیاسی حقوق انفرادی طور پر استعمال نہیں کیے جاتے بلکہ یہ منتخب نمائندوں کے ذریعہ سے استعمال کیے جاتے ہیں اور وہ عوام کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔

٣۔ متوازن یا آئینی جمہوریت :

یہ ایک ایسا طرز حکومت ہے۔ جو عام طور پر نمائندہ جمہوریت ہی ہوتی ہے۔ مگر وہاں اکثریت کی قوت اور ان کا عمل ایک خاص آئینی دائرہ کار کے اندر ہوتا ہے اور آئینی طور پر ایک ایسا دائرہ کار متعین ہوتا ہے۔ جس کے اندر محدود طور پر تمام لوگ انفرادی اور

اجتماعی حقوق سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ حقوق آزادی اظہار رائے اور مذہب سے متعلق
ہوتے ہیں۔

۴۔ سماجی یا معاشی جمہوریت :

لفظ جمہوریت کا استعمال نظام کی ان سیاسی اور سماجی خصوصیات پر بھی کیا جاتا ہے۔ جو
حکومت کی سینہ تین تعریفوں میں نہیں آتیں۔ لیکن ان کا مقصد معاشی اور سماجی تفریقات کا
خاتمہ مقصود ہوتا ہے۔ خاص طور پر وہ تفریقات جو انفرادی ملکیت اور ان کی تقسیم سے پیدا
ہوتے ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا آف فلاسفی ص: ۱۱۷)

بعض محققین نے جمہوریت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ سیاسی جمہوریت (Political Democracy)

۲۔ معاشی جمہوریت (Economical Democracy)

۳۔ معاشرتی جمہوریت (Social Democracy)

(جمہوریت پاکستان میں ص: ۹۹ از ڈاکٹر وحید عشرت)

بعض اہل علم نے جمہوریت کی درج ذیل اقسام بیان کی ہیں۔

۱۔ پارلیمانی جمہوریت (Parlimentary Democracy)

۲۔ صدارتی جمہوریت (Presidential Democracy)

۳۔ منضبط جمہوریت (Controlled Democracy)

۴۔ براہ راست جمہوریت (Direct Democracy)

(ماہنامہ المرشد لاہور اپریل ۱۹۹۰ء)

مگر یاد رہے کہ جمہوریت کا اصل جوہر اور خمیر حاکمیت عوام ہے۔ خواہ اس کی کتنی ہی
اقسام ہوں یا کیسے ہی نام رکھ دیے جائیں فرق صرف اتنا ہے کہ کہیں حالات کے تقاضوں
کے پیش نظر جمہوریت کی خودسری کو کچھ لگام دی جاتی ہے۔ اور کہیں آزادی کو۔

.. بہر رنگ کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

جمہوریت کی نشاۃ ثانیہ

اگرچہ جمہوریت کی ابتدا اڑھائی ہزار سال قبل مسیح، یونان میں ہوئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ یونانی فلاسفر افلاطون کی کتاب "جمہوریت" آج بھی دنیا میں شوق سے پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن اس وقت جمہوریت ایک منظم یا منقسم شکل میں بطور نظام حیات نمودار نہیں ہوئی تھی۔ جمہوریت کی نشاۃ ثانیہ کا سہرا ان لوگوں کے سر ہے جنہوں نے اٹھارویں صدی عیسوی میں انقلاب فرانس برپا کیا۔ مسٹر روسو کی کتاب "معاہدہ عمرانی" انقلاب فرانس کے انقلابیوں کے لئے انجیل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں جمہوریت کو بہترین حکومت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بحوالہ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر۔ صفحہ ۲۲۵۔ اور رسالہ الحق فروری ۱۹۷۳ء)

موجودہ ترقی یافتہ جمہوریت، زندگی کے کسی ایک شعبے کا نہیں بلکہ مکمل ضابطہ حیات اور مخصوص عقائد اور نظریات کا مجموعہ ہے اس لئے آئندہ مباحث میں اسے "دین جمہوریت" کے نام سے ذکر کروں گا۔

دینِ جمہوریت کا اساسی اور بنیادی عقیدہ

دین جمہوریت کا بنیادی اور اساسی عقیدہ یہ ہے کہ "مذہب" اور "جہاں بانی" (یعنی زندگی کے مسائل چلانے کا نظم وضبط) دو الگ الگ چیزیں ہیں نہ صرف یہ کہ ان کا آپس میں کوئی رابطہ و تعلق نہیں بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں جو کبھی یکجا نہیں ہو سکتیں۔

یورپ کے مادہ پرست فلاسفروں میں سے یورپ کے مایۂ ناز فلاسفر "میکاولی" (Machiavelli) کو سیاسیات، حکمرانی اور جہانبانی کے علوم میں امام یکتا مانا جاتا ہے، انہوں نے پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر اور سولہویں صدی کے اوائل میں دین و سیاست کی تفریق کی دعوت شروع کی اور اخلاق کی دو قسمیں بنا ڈالیں۔

۱۔ عوامی (Public)

۲۔ شخصی (Private)

اور طے کر دیا کہ اگرچہ مذہب کی ضرورت ہے لیکن یہ انسان کے لئے محض ایک پرائیوٹ یعنی ذاتی وانفرادی معاملہ ہے جس کو امور سیاست میں دخل نہیں دینا چاہئے، حکومت ہر چیز پر مقدم اور ہر شے سے بیش قیمت ہے۔ مذہب کا تعلق اخروی زندگی سے ہے۔ ہماری دنیاوی زندگی سے اس کو کوئی سروکار نہیں، دین دار اور نیکوکار انسان کا وجود حکومت کے لئے کچھ مفید نہیں اس لئے کہ وہ دین کے احکام کا پابند ہوتا ہے اور ضرورت کے وقت اخلاقی اصول کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ حکمرانوں کو لومڑی کی صفات اپنانی چاہئیں اور اگر حکومت کا فائدہ ہو اور کوئی سیاسی مصلحت مقتضی ہو تو عہد شکنی، دروغ گوئی، فریب کاری، خیانت اور نفاق میں پس و پیش نہیں کرنا چاہئے۔

خلاصہ یہ کہ سولہویں صدی میں یورپ کے سائنس دانوں اور فلاسفروں نے پورے منصوبے اور منظم طریقہ پر فلسفیانہ انداز اور سائنٹیفک بنیادوں پر خالق کائنات کو دنیا کے سارے معاملات سے بے دخل کر دیا اور فکر و عمل، علوم و فنون، حکمرانی اور اخلاقی، اقتصادی، سماجی اور انتظامی مسائل کا حل خالص الحاد اور مادیت پرستی پر تعمیر کرنا شروع کیا۔

بحوالہ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر اور انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام)

دینِ جمہوریت کے بنیادی اصول وارکان

جمہوری نظام میں انسانی ذات کی قدر و قیمت اور اس کی بزرگی کو بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اور اسی سے جمہوریت کے تمام قوانین کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ اس نظریہ کی رو سے فرد آزاد پیدا ہوا ہے اس لئے اپنے آزادانہ اختیار اور ارادے کا استعمال اس کا فطری حق ہے اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ فرد کو عمومی نوعیت کی آزادی حاصل ہو تاکہ فرد اپنی ذات کا مکمل طور پر مالک ہو۔ اس پر کسی بیرونی طاقت کو اقتدار اور برتری حاصل نہ رہے۔ اس عمومی آزادی یا حریت عامہ کی فہرست اگرچہ بہت طویل ہے مگر یہاں چند وہ بنیادی اور اساسی آزادیاں اجمالاً ذکر کی جاتی ہیں۔ جن کی تفصیل اگلی مباحث میں آرہی ہے۔

دینِ جمہوریت کا ایمانِ مجمل

۱۔ عقیدے کی آزادی :

یعنی ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ جو بھی عقیدہ رکھنا چاہے رکھ سکتا ہے خواہ سابقہ عقیدہ ترک کر کے نیا عقیدہ کیوں نہ اختیار کرے، یہ اس کا قانونی حق ہے اس لئے اس کو ایسا کرنے سے کوئی منع نہیں کر سکتا۔

۲۔ آزادیٔ رائے :

یعنی ہر فرد کا قانونی حق ہے کہ اس کے ذہن میں جو کچھ ہو اس کا اظہار، تحریر و تقریر یا دیگر نشریاتی ذرائع سے کر سکتا ہے۔ آزادیٔ رائے کا یہ حق کسی تقیید کا پابند نہیں، البتہ کسی کے ذاتی معاملات سے متعلق نہ ہو۔

۳۔ آزادیٔ ملکیت :

ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ جو چیز جتنی مقدار میں اور جس طریقے سے اپنی ملکیت

میں لانا چاہے لا سکتا ہے۔

۴۔ شخصی آزادی :

ہر فرد کو قانونی حق حاصل ہے کہ اپنی ذات کے بارے میں اپنی مرضی سے جو کچھ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔

البتہ مذکورہ آزادیاں اکثریت کے وضع کئے ہوئے اصول و قواعد کے اندر ہونی چاہئیں ان آزادیوں کو "حریت عامہ" اور "بنیادی حقوق" کا نام دیا جاتا ہے۔

جمہوریت کے قوام کے لئے بنیادی شرط

چونکہ انسان اپنی ضروریات میں انفرادی طور پر خود کفیل نہیں ہے بلکہ قدرت نے ہر ایک کو دوسرے کا محتاج بنایا ہے اس لئے اجتماعی زندگی میں دوسروں کے تعاون کے بغیر انسان کے لئے چارہ کار نہیں۔ اور اجتماعی زندگی کے لئے قوانین اور قوانین نافذ کرنے والے ادارے یعنی حکومت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب چونکہ کسی ملک کے جملہ باشندوں کی خواہشات نہ تو معلوم کی جا سکتی ہیں اور نہ وہ یکساں ہوتی ہیں کہ ہر ایک کی خواہش نفس کے مطابق اس کی آزادی کے لئے ملکی قوانین بنائے جائیں اور نہ ہی ہر ایک کو حاکم بنایا جا سکتا ہے۔ اسلئے .... اکثریت کو جمہوریت میں کل کا درجہ دیا جاتا ہے۔ رائے کی سادہ اکثریت سے ممبران منتخب کئے جاتے ہیں۔ اور پھر پارلیمنٹ کی اکثریت کی مرضی سے قوانین بنتے ہیں جب اکثریت کی خواہش کے مطابق قانون بنتا ہے تو گویا یہ قانون ملک کے پورے باشندوں کی مرضی سے بنا ہوا ہوتا ہے۔

یہ ہے جمہوریت کے اجزاء ترکیبی کا ایک اجمالی خاکہ اور وہ اساس جس پر "دین جمہوریت" کی سربفلک عمارت کھڑی کی گئی ہے اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی وہ نئی روشنی جس کا ہر ایک ثناخواں ہے۔

دین جمہوریت کی غرض وغایت

جتنے بھی الحادی ازم اور خدا بیزار نظریات ہیں خواہ ان کا تعلق ماضی قدیم سے ہو یا زمانہ وسطی سے یا زمانہ حال سے ہو، سب میں یہ بات قدر مشترک ہے کہ انسان کو مذہب اور روایات واقدار کی اطاعت سے دور رکھا جائے۔ اس لئے کہ انسان کی حیوانی خواہشات ہمیشہ سے اس بات کی شدت سے متقاضی ہیں کہ اس چند روزہ زندگی میں شتر بے مہار بن کر مادی لذتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے لہذا یہ تمام ازم کسی بھی مذہبی، سماجی، عقلی اور رسمی بندش کے قطعاً روادار نہیں۔ دراصل دین جمہوریت کے وجود میں آنے کا بنیادی سبب بھی یہی ہے۔ لیکن یورپ میں جمہوریت کے فروغ کی چند تجدیدی اور حقیقی وجوہات بھی ہیں۔ انہی وجوہات اور اسباب نے یورپ میں جمہوریت کے پنپنے، جڑ پکڑنے اور مستحکم ہونے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے بلکہ اس مادر پدر آزاد جمہوریت کو پروان چڑھایا ہے جس نے اخلاق و کردار کا جنازہ نکال کر رکھ دیا۔

باب دوم

کلیسائی نظام کی افراط و تفریط

عیسائیت میں مذہبی اقتدار کا درجہ کلیسا کو حاصل ہے مذہبی پیشواؤں میں سب سے اعلیٰ و برتر کو "پوپ" یا "پاپا" کہا جاتا ہے۔ اس سے کمتر درجے والوں کو "بشپ، پادری" اور "اسقف" کا نام دیا جاتا ہے۔ مسیحی عقیدے میں "پوپ" دنیا میں عیسیٰ علیہ السلام کا نمائندہ ہوتا ہے۔ ۴۶۱ء میں سب سے بڑا پوپ "لیو اعظم" تھا۔ اس نے شہنشاہ سے ایک فرمان حاصل کر لیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ پوپ کی طرف سے جو بھی فیصلے صادر ہوں انہیں قانون کا درجہ حاصل ہوگا۔ اسی لئے یہ کہا تھا کہ رسول کے جانشین جو کچھ کہتے ہیں اور کرتے ہیں اسے خود رسول کی طرف سے سمجھنا چاہیے۔ (انسائیکلوپیڈیا۔ جلد دوم ص: ۱۵۳)

پوپ ہفتم گریگوری نے سنہ ۱۰۷۵ء میں کلیسا اور پوپ کے متعلق حسب ذیل ہدایات جاری کیں۔

(۱) رومی کلیسا سے کبھی غلطی ہوئی ہے اور نہ غلطی ہو سکتی ہے۔

(۲) پوپ تمام معاملات کے فیصلے کا آخری مجاز ہے اور اس کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہو سکتی۔

(۳) پوپ کے حکم کے بغیر کوئی عام مجلس نہیں بلائی جا سکتی۔

(۴) پوپ تمام بشپوں کی برطرفی، بحالی اور تبادلے کا مختار ہے۔

(۵) تمام رئیسوں اور حکمرانوں کو پوپ کی اطاعت کا اقرار کرنا چاہیے۔

(۶) صرف پوپ شہنشاہ کو معزول کرنے کا مجاز ہے۔

(انسائیکلوپیڈیا۔ جلد دوم ص: ۱۹۱)

پوپ نہم "پائس" نے سنہ ۱۹۷۰ء میں ویٹیکن میں ایک کونسل طلب کی جس نے پوپوں کے معصوم ہونے کے عقیدے کا اعلان کیا۔ (انسائیکلوپیڈیا۔ جلد سوم ص۔ ۶۲)

رہبانیت :

رہبانیت کے متعلق "ولیم ایل لینگر" لکھتا ہے۔

"عام لوگوں کے اخلاقی حالات اچھے نہ تھے اور مذہبی پیشوا اس سلسلے میں ہر اصلاح کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے۔ بعض پیشواؤں نے رہبانیت پر زور دیا یعنی ایسی زندگی بسر کرنا جو دنیا کی تمام خواہشات سے پاک ہو انہوں نے خالص اور اپنی دنیتری سے سروکار رکھا اس غرض کے لئے بیابیا خانقاہیں بن گئیں جن میں لوگوں کو رہبانیت کی تعلیم دی جاتی تھی"۔

(انسائیکلوپیڈیا۔ جلد دہم، ص۔ ۱۵۳)

چوتھی صدی عیسوی کی ابتدا میں رہبانیت کی بنیاد ڈالی گئی آگے چل کر اس بدعتی تحریک نے مردم آزاری، علم بیزاری اور فطرت دشمنی کی بھیانک شکل اختیار کی۔ درحقیقت یہی تحریک بعد میں یورپ کے مادہ پرست، خدا بیزار اور الحادی قوتوں کے وجود میں آنے کا سبب بنی اس لئے یہاں اس کی کچھ تفصیل ناگزیر ہے۔

"لیکی" کی کتاب "تاریخ اخلاق یورپ" ترجمہ مولانا عبدالماجد دریاآبادی رحمہ اللہ سے عیسائیوں کی رہبانیت میں غلو اور افراط کے چند نمونے پیش خدمت ہیں۔

"راہبوں اور زاہدوں کی مجموعی تعداد میں مورخین کا اختلاف ہے تاہم ان کی کثرت اور تحریک رہبانیت کی اشاعت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سینٹ جیروم (جو تحریک رہبانیت کے چار بانیوں میں سے ہے) کے زمانہ میں ایسٹر "عیسائیوں کا ایک متبرک تہوار" کی تقریب پر پچاس ہزار راہبوں کا مجمع ہوتا تھا۔

سینٹ سراپین راہب کی ماتحتی میں دس ہزار راہب تھے چوتھی صدی کے اختتام پر

تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ جتنی مصر کی شہری آبادی تھی تقریباً اتنی ہی ان راہبوں اور زاہدوں کی تعداد تھی اس کے نتیجہ میں دو سو سال تک یورپ میں دنیا بیزاری، نفس کشی، جسم کشی اور غلاظت جیسی چیزیں دلاہت کی معراج اور انسانیت کا کمال سمجھی جاتی تھیں مورخین نے اس کی بڑی لرزہ خیز مثالیں پیش کی ہیں۔

رہبانیت کے چند لرزہ خیز نمونے

"سینٹ میکیریس راہب" کے متعلق مشہور ہے۔ کہ وہ چھ ماہ برابر ایک دلدل میں سویا کرتا تھا تاکہ اس کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں وغیرہ ڈسیں نیز یہ کہ ہمیشہ ایک من لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتا تھا۔

سینٹ یوسیبس جو بزرگ سینٹ میکیریس اسکندروی راہب کے مرید تھے تین سال تک ایک خشک کنویں کے اندر مقید رہے اور ہمیشہ اپنے اوپر دو من لوہے کا وزن لادے رہتے تھے۔

مشہور راہب یوحنا کے متعلق منقول ہے کہ وہ مسلسل تین سال تک کھڑے ہوئے عبادت کرتے رہے اس عرصہ میں لحہ بھر کے لئے بھی نہ بیٹھے نہ لیٹے جب بہت تھک جاتے تو چٹان پر اپنے جسم کو سہارا دے لیتے۔

بعض زاہد کسی قسم کا لباس استعمال نہیں کرتے تھے اور ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے لمبے بالوں سے لیتے تھے اور چوپاؤں کی طرح ہاتھ پیر کے بل چلتے تھے۔ راہبوں کے مسکن عام طور پر جنگلوں میں وحشی درندوں کے غار، خشک کنویں یا قبرستان ہوتے تھے ان اہل زہد کا ایک طائفہ صرف گھاس کھاتا تھا۔

جسم کی طہارت روح کی پاکیزگی کے منافی سمجھی جاتی تھی اور جو راہب مرتبہ زہد و رہبانیت میں جتنی ترقی کرتا جاتا اسی قدر وہ مجسمہ غلاظت، عفونت اور گندگی بنتا جاتا ہے۔

سینٹ اتھینیس نہایت فخر سے بیان کرتا ہے کہ سینٹ انتونی بایں کبر سنی عمر بھر کبھی بھی اپنے پیر دھونے کی عصیان کا مرتکب نہیں ہوا۔

سینٹ ابراہام نے پچاس سالہ مسیحی زندگی میں اپنے چہرے یا پیر پر پانی کا ایک قطرہ نہیں پڑنے دیا۔

راہب الیگزنڈر بڑے تاسف اور تحیر سے گویا ہیں کہ ایک وہ زمانہ تھا جب ہمارے اسلاف منہ دھونا حرام جانتے تھے اور ایک ہم لوگ ہیں کہ حمام جایا کرتے ہیں۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص ۲۵۲)

رہبانیت نے غسل کو اتنا بڑا گناہ ٹھہرایا تھا کہ جب پاپائے روم نے سسلی اور جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ثانی پر تیرھویں صدی عیسوی میں کفر کا فتویٰ لگایا تو الزامات کی فہرست میں یہ بھی درج تھا کہ وہ مسلمانوں کی طرح ہر روز غسل کرتا ہے۔

جب اسپین میں اسلامی سلطنت کو زوال آیا تو بادشاہ فلپ دوم نے سولہویں صدی عیسوی میں وہاں کے تمام حمام گرا کر بند کر دیئے اور انہوں نے اشبیلیہ کے عیسائی گورنر کو محض اس لئے معزول کیا کہ وہ روزانہ ہاتھ منہ دھوتا تھا۔

(تہذیب اسلام۔ از مارماڈیوک پکتھال ص ۷۰۳)

غلیظ جسم اور میلے لباس کی وجہ سے جوؤں کی وہ کثرت تھی کہ جب کنٹربری (برطانیہ) کا لاٹ پادری باہر نکلتا تھا تو اس کی قبا پر سینکڑوں جوئیں چلتی پھرتی نظر آتی تھیں۔

(معرکہ مذہب و سائنس۔ از ڈاکٹر ڈریپر ص ۶۱-۳ ۵۲۵)

انگلستان کے ایک مورخ اے ایچ سٹرلنگ لکھتا ہے کہ راہبوں کے گروہ جابجا گھومتے نظر آتے تھے۔ یہ جہاں بھی کوئی کتاب، فن یا آرٹ کا نمونہ پاتے اسے جلا دیتے تھے۔

(تاریخ ہیروز آف ہسٹری ص ۶۲)

ڈاکٹر رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے کہ راہبوں کی علمی سرگرمیاں یہ تھیں کہ وہ یونانیوں

اور رومیوں کی کتابیں جلا کر ان کی جگہ مسیحی اولیاء کی داستانیں رکھ دیتے تھے چونکہ اس زمانے میں کاغذ نایاب تھا اس لئے چرمی جھلی پر لکھی ہوئی کتابیں کھرچ ڈالتے پھر ان پر دعائیں اور اولیاء کی داستانیں لکھ دیتے تھے۔ (تشکیل انسانیت از بریفالٹ۔ ص۔ ۲۱۷)

علامہ ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں۔

راہب معلموں کا بھیس بدلے ہوئے پھرتے تھے اور بچوں کو بہلا پھسلا کر اپنے حلقہ میں شامل کرتے تھے والدین کا اپنی اولاد پر کوئی اختیار باقی نہیں رہ گیا تھا جو اولاد انہیں چھوڑ کر تارک الدنیا ہو جاتی تھی اس پر عوام میں ہر طرف سے آفرین اور واہ واہ ہوتی تھی پہلے جو اثر واقتدار بزرگ خاندان یا والد کو حاصل ہوتا تھا وہ اب پادریوں اور راہبوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ پادری رہبانیت کے لئے لڑکوں کا اغوا کرتے تھے۔

ایمبروز میں اس قسم کے اغوا کا جنون اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اسے دیکھ کر مائیں اپنے اپنے بچوں کو گھر کے اندر بند کر دیتی تھیں۔ تحریک رہبانیت کا اخلاقی نتیجہ یہ ہوا کہ مردانگی اور جوانمردی کے متعلق جتنے کمالات ہیں مثلاً زندہ دلی، خندہ پیشانی، خوش طبعی، شیریں گوئی، فیاضی، شجاعت، جرأت، کسب حلال اور جہاں بانی، یکسر عوام کی نظر میں معیوب اور بے دینی قرار پا گئے اس لئے کہ یہ زاہدان خشک ہر وقت ان کو دنیا سے بیزاری کا درس دیتے اور خود ان کے قریب تک نہیں جاتے تھے۔

رہبانی طرز معاشرت کا دوسرا اہم نتیجہ یہ ہوا کہ خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور دلوں میں رحمت و شفقت اور ادب و احترام کا جذبہ ماند پڑ گیا۔ اس زمانہ میں والدین اور اولاد فراموشی، سنگدلی اور بیزاری کا دور دورہ تھا اپنی ماؤں کی دل شکنی، بیویوں کے حقوق کی پامالی اور اپنی اولاد کو زندگی میں یتیم، بے والی اور بے وارث محض دوسروں کے رحم پر چھوڑ دینا عبادت کا منتہا اور زندگی کا مقصد سمجھا جانے لگا تھا۔

"لیکی" نے اپنی تالیف "اخلاق یورپ" میں اس بارے میں جو واقعات لکھے ہیں ان کو

پڑھ کر آج بھی آنسو بہنے کے لئے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ وہ عورتوں کے سایہ تک سے بھاگتے تھے عورت کا سایہ پڑ جانے سے یا گلی کوچوں میں اتفاقاً سامنا ہو جانے سے وہ سمجھتے تھے کہ ساری عمر کی زہد و ریاضت کی کمائی خاک میں مل جاتی ہے۔ اپنی ماؤں، بیویوں اور حقیقی بہنوں سے بات کرنا بھی گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ فطرت دشمنی اور غلاظت پسندی کا اثر یہ ہوا کہ تمدن اور آبادی کو سخت تنزل ہوا۔ براعظم یورپ کی آبادی ہزار سال میں بھی اور ملک انگلستان کی آبادی پانچ سو سال میں بھی دو گنی نہ ہو سکی اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں بڑا دخل اس بات کو تھا کہ راہب تجرد اور کنارہ کشی کی زندگی کی بڑی تبلیغ کرتے تھے اور ساتھ ہی کلیسا نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا کہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو طبیب یا اس کے پیشہ سے مانوس نہ ہونے دیا جائے اس لئے کہ اس کا خانقاہوں کی آمدنی پر (جو دعا و تبرکات کے ذریعہ ہوتی تھی) اثر پڑتا تھا اور طبیب اس منافع میں کلیسا کا مدمقابل بن سکتے تھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام یورپ میں وبائی امراض پھیلے اور موت کی گرم بازاری ہوئی۔

بحوالہ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ ص: ۲۵۳)

احبار و رہبان کے قول و عمل میں تضاد

اعتدال سے ہٹ کر جو عمل شدت اور جذباتیت سے شروع کیا جائے اس کا ردعمل بھی شدید اور جذباتی ہوتا ہے۔ اہل کلیسا نے فطرت کے خلاف اپنے آپ پر اور مسیحیت کے پیروکاروں پر دنیا بیزاری اور خود ساختہ زہد و تقویٰ کا ایک ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا لیکن دنیا نے جلد ہی اس کا شدید ردعمل بھی دیکھ لیا گویا ان کی رہبانیت کا ردعمل اس قرآنی آیت کی عملی تفسیر ہے جس میں ارشاد ہے:

قولہ تعالیٰ: ورهبانية التي ابتدعوها ما كتبنها عليهم الا ابتغاء رضوان الله فما رعوها حق رعايتها ○ (سورۃ الحدید، آیت: ۲۷)

"اور ترک دنیا جو انہوں نے خود اختراع کی ہم نے وہ ان پر فرض نہیں کی تھی مگر انہوں نے رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا پس اسے نباہ نہ سکے جیسا نباہنا چاہئے تھا"۔

علامہ ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں۔

"تھوڑے دنوں کے بعد خود مذہبی مرکزوں اور حلقوں میں وہ تمام عیوب اور عیش پرستی شروع ہو گئی جس کے خلاف رہبانیت کی تحریک شروع کی گئی تھی یہاں تک کہ وہ اخلاقی گراوٹ و پستی اور عیش و عشرت پرستی میں خالص دنیادار حلقوں سے بھی کہیں آگے نکل گئے حکومت کو مجبوراً ان مذہبی دعوتوں کا سلسلہ بند کرنا پڑا۔ جن کا مقصد مسیحیوں میں اخوت و محبت پیدا کرنا تھا اسی طرح شہداء و اولیاء کے عرس اور ان کی برسیاں ممنوع قرار دی گئیں کیونکہ یہ خالص مذہبی تقریبات فسق و بے حیائی کا نمونہ بن گئی تھیں بڑے بڑے پادریوں پر سنگین اخلاقی جرائم کا الزام تھا"۔

سینٹ جیردم کا قول ہے کہ "اہل کلیسا کے تعیش کے سامنے امراء اور دولت مندوں کی عیش و عشرت بھی شرماتی ہے"۔

خود پوپ اخلاقی گراوٹ میں مبتلا تھے اور دولت کی ہوس اور مال کا عشق تو ان پر اتنا غالب تھا کہ مذہبی منصب اور عہدے معمولی سامان تجارت کی طرح بکتے تھے اور کبھی کبھی ان کا نیلام ہوتا تھا (پوپ ان عہدوں کے عوض رشوت لیتے تھے) نیز جنت کے سرٹیفکیٹ بے تکلف بکتے تھے مذہبی عہدہ دار سخت رشوت خور اور سود خور تھے (سود دراصل عیسائی مذہب میں بھی حرام تھا) فضول خرچی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ مملکت فرانس کی پوری آمدنی بھی ان پاپاؤں کے اخراجات کے لئے کافی نہ ہوتی تھی۔ (معرکہ مذہب و سائنس)

اے ایچ سٹرلنگ لکھتا ہے کہ "یہ پوپ اس قدر حریص تھے کہ ۶۰۰ء میں پوپ کی مملوکہ زمین اٹھارہ مربع میل تھی اور وہ یورپ کا سب سے بڑا زمیندار تھا"۔ (تاریخ ہیروز آف

ہسٹری۔ ص: ۱۵۰)

غلام جیلانی برق لکھتا ہے "ان کے پادری فریب اور جعلسازی سے کام لیتے تھے پوپ جنت کی راہداریاں اور گناہ کے پرمٹ (اجازت نامے) فروخت کرتا تھا۔ ۱۵۱۷ء میں جرمنی کے مشہور پادری مارٹن لوتھر اسی لئے تو پوپ سے باغی ہوا تھا کہ جرمنی میں پرمٹ اور جنت کی راہداریاں فروخت کرنے کا ٹھیکہ کسی اور کو مل گیا اور لوتھر کی درخواست مسترد کردی گئی تھی۔ پھر کیا تھا، لوتھر نے بغاوت کی بنیاد یہی ٹھہرائی کہ پوپ ایسی گھٹیا تجارت وغیرہ میں ملوث ہے جس کا مذہب میں کوئی جواز نہیں ہے۔ پھر اس نے پچانوے سوالات کا ایک پوسٹر تیار کیا جس میں پوپ کو چیلنج کیا اور ۳۱ اکتوبر ۱۵۱۷ء کو گرجے کے دروازے پر چسپاں کردیا چونکہ لوتھر، ارباب کلیسا کا اندرونی رازدار تھا اس لئے کلیسا کی دورنگی کے وہ راز طشت ازبام کئے جو ننگ انسانیت تھے اور جس کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

(یورپ پر اسلام کا احسان۔ ص: ۱۵۵)

ارباب کلیسا کے یہ اعمال قرآنی آیات کی جیتی جاگتی تفسیر نہیں تو اور کیا ہیں؟

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

یا ایھا الذین آمنوا ان کثیرا من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ۝

(پارہ: ۱۰، سورہ توبہ، آیت: ۳۴)

"اے ایمان والو! تحقیق اکثر احبار، رہبان (اہل کتاب کے علماء اور درویش) لوگوں کے مال ودولت ناحق اور باطل ذرائع سے کھاتے ہیں اور لوگوں کو راہ خدا سے باز رکھتے ہیں"۔

حافظ محمد اقبال رنگونی لندن مانچسٹر سے لکھتے ہیں:

"مانچسٹر کے علاقہ برانزوک کے چرچ کی جانب سے یہ خبر ملی ہے کہ ہفتہ میں دودن

خدااور جنس (God And Sex) کے عنوان پر درس دیا جائے گا اس درس میں زنا بالجبر، زنا برضا، ہم جنس پرستی، چھوٹے بچوں کے ساتھ غیر اخلاقی حرکات اور طلاق جیسے اہم موضوعات بیان ہونگے علاوہ ازیں وڈیو فلم بھی دکھائی جائیں گی اور ایک ماہر جنسیات بطور خاص مدعو کیا جائے گا"۔

"ریو مارٹن گوڈر (REVMARTIN GOODER) کا کہنا ہے کہ یہ موضوعات ہماری زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں جب خدا نے شہوت پیدا کی تو اس نے کوئی غلطی نہیں کی، خدا چاہتا ہے کہ ہم اس کی بنائی ہوئی قدرت سے خوب نفع لیں" اخبار نے اس پر یہ سرخی جمائی (CHURCH GUIDE TO GOOD SEX)۔(مانچسٹر ایوننگ نیوز)

مضمون نگار مزید لکھتا ہے کہ "جم بیکر امریکہ کے سب سے بڑے ٹیلی وژن اسٹیشن کے پادری تھے۔ ان کا ٹی وی اسٹیشن دنیا میں سو سے زیادہ شہروں میں دیکھا جاتا تھا جس پر بیکر عیسائیت کی تبلیغ (تبلیغ عیسائیت) کرتے تھے ان کی شہرت میں اضافہ ہوا تو لالچ اور بے راہ روی بھی حد سے تجاوز کرنے لگی انہوں نے ٹی وی سینٹر کے لئے چندہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا ان کا ماہانہ چندہ ۳۰ لاکھ امریکی ڈالر سے بھی تجاوز کر گیا۔ جم بیکر نے اسی مال مفت پر تعیش کا سلسلہ شروع کر دیا عالیشان محلات کی تعمیر ہوئی، چہرے کی پلاسٹک سرجری کرائی گئی۔ جنسی بے راہروی میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ عورتوں اور مردوں سے یکساں جنون کے ساتھ تعلقات بڑھائے۔ جم بیکر کے پاکباز چہرے سے اس وقت نقاب اٹھا جب ایک کال گرل نے اپنے اور جم بیکر کے تعلقات کا ذکر کیا۔

"جیسیکا ھان" نامی کال گرل کا کہنا ہے کہ اسے ان بوڑھوں مردوں اور عورتوں پر رحم آیا جو اپنی عاقبت بہتر بنانے کی غرض سے خود فاقے کرتے رہے اور پوری پنشن کی رقم بیکر صاحب کے ہاتھوں میں دیتے رہے۔

اس کال گرل کا دھماکہ کرنا تھا کہ کئی عورتوں اور مردوں نے بھی جم بیکر سے اپنے

ویسے ہی تعلقات کا اقرار کیا۔ پادریوں کی کمیٹی نے بیکر کو اپنے گروپ سے خارج کر دیا اور اس کے چرچ کا بائیکاٹ کیا لیکن بیکر آزاد تھا کیونکہ امریکی قانون کے مطابق دو مردوں کا آپس میں یا مرد، عورت کے درمیان ناجائز تعلقات کوئی جرم نہیں۔ پھر بھی اس کی بدنامی کافی ہوئی لیکن وہ قانونی طور پر آزاد تھا۔ پھر اس پر خرد برد اور فراڈ کا مقدمہ دائر کیا گیا انکوائری شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس نے چرچ کے کروڑوں ڈالر خرد برد کئے ہیں اور وہ چندہ جو چرچ کی تعمیر اور عیسائیت کی تعلیم کے لئے جمع کیا گیا تھا۔ عالیشان محلات کی تعمیر اور کال گرلز کی نذر ہو گیا ہے۔ اس بات کا ثبوت ملتے ہی جم بیکر کو گرفتار کر لیا گیا۔ سال بھر تک کیس کی سماعت ہوتی رہی، جم بیکر نے اپنے آپ کو نفسیاتی مریض ثابت کرنے کے لئے بھی ڈرامے رچائے مگر ناکامی ہوئی چنانچہ پینتالیس سال قید اور پانچ لاکھ ڈالر جرمانہ کی سزا ہوئی اس طرح ایک معزز عیسائی پادری بدنام ترین شخص ثابت ہوا۔

جم بیکر کی گرفتاری اور جنسی اسکینڈل میں ملوث کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ اس کے رقیب پادری "سواگرٹ" کا ہے۔ جو اس کے بعد اس سے بڑے پادری بن گئے۔ ان کا پروگرام بھی ٹی وی کے کئی اسٹیشنوں سے نشر کیا جاتا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ ٹی وی پر تبلیغ کرتے وقت جب چاہتے ہیں رو لیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں ڈانس کر لیتے ہیں۔ رلانا اور ہنسانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

مسٹر سواگرٹ کے جنسی اسکینڈل بھی کوئی مخفی راز نہیں مگر ثبوت نہیں تھا چنانچہ ان کے پیچھے بھی خفیہ مشن شروع ہوا اور چند ہی روز میں ثبوت مل گیا جوں ہی سواگرٹ کو اس کا پتہ چلا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ قبل اس کے کہ اس ثبوت کو منظر عام پر لایا جاتا مسٹر سواگرٹ نے ٹی وی پر اقرار جرم کر لیا اور زار و قطار رو کر خدا سے معافی مانگنا شروع کر دی۔ تاہم جمز سواگرٹ پر کوئی ایسا جرم ثابت نہ ہوا جو امریکی قانون کے تحت قابل گرفت ہو، اس لئے وہ ابھی تک آزاد ہیں۔ (روزنامہ جنگ لندن۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۸۹ء ص:۵)

اندازہ لگایئے جب متبرک اور مقدس عبادت خانوں کا یہ حال تھا اور ہے تو دوسری محفلوں کا کیا حال ہوگا۔

کلیسا کے علمائ نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری

مسیحی علماء دین کی سب سے خطرناک غلطی "جس سے انہوں نے اس مذہب کے نمائندے ہو کر اس کو زبردست نقصان پہنچایا" یہ تھی کہ اس زمانے کے لحاظ سے کائناتی، تاریخی، جغرافیائی، طبعی اور سائنسی علوم کے متعلق جو نظریات انسانوں میں مسلمات کے مرتبہ کو پہنچے تھے اور سمجھا جاتا تھا کہ اس بارے میں یہ یقینی اور قطعی حد ہے۔ جس میں مزید پیش رفت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ ایسی مسلمات کو انہوں نے مسیحی تعلیمات میں اس طرح شامل کیا کہ گویا یہ آسمانی تعلیمات کے اجزا ہیں اور پھر انہوں نے حقیقی وحی کے ساتھ اپنی تحریروں اور مندرجات کو بھی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی کہنا شروع کیا۔ شاید انہوں نے نیک نیتی سے مسیحی مذہب کی تعلیمات کو عظمت دلانے اور ان کی مقبولیت کی غرض سے ایسا کیا تھا اور یقیناً اس زمانے میں وقتی طور پر ان کا یہ مقصد حاصل بھی ہوا ہوگا۔ لیکن آگے چل کر یہی عمل اور تحریف نہ صرف ان کے لئے اور دین مسیحیت کے لئے بلکہ جملہ ادیان سماوی کے جھٹلانے کا سبب اور بہانہ بن گیا۔ قرآن کریم نے ارباب کلیسا کے اس عمل کی تباہ کاری کو نہایت جامع اور موثر پیرائے میں پیش کیا ہے:

فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ

(البقرہ، آیت: ۷۹)

"پس تباہی ہے ان (اہل کتاب کے علما) کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب اللہ میں لکھ دیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا نازل کردہ ہے"۔

کلیسا نے صرف اسی الحاق اور تحریف پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام جغرافیائی، تاریخی

اور طبعی علوم کی معلومات جو اس زمانے میں مشہور اور (مسلمات میں سے) مسلمہ تھیں یا آسمانی کتابوں کے مفسرین نے ان کا ذکر بطور تشریح و توضیح کیا تھا ان سب کو خدائی تعلیمات اور اصول دین میں شامل کر لیا جن پر اعتقاد رکھنا ہر مسیحی کے لئے جزو ایمان قرار دیا گیا اس موضوع پر انہوں نے کتابیں تصنیف کیں اور اس جغرافیہ کو جس کی حقیقت میں کوئی آسمانی سند نہ تھی، مسیحی جغرافیہ کا نام دیا اور اس کے ماننے پر اس قدر اصرار کیا کہ جن لوگوں نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور یہی عمل مذہب اور عقلیت (سائنس) کے نامبارک معرکہ کا سبب بنا۔ جس میں مسیحی تحریف شدہ مذہب اور ارباب مذہب نے وہ شکست کھائی جس کے بعد رہتی دنیا تک پھر نہ انہوں نے عروج پایا اور نہ پا سکیں گے گویا

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مذہب اور سائنس کا معرکہ اور کلیسا کے مظالم

اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک طرف تو ارباب کلیسا یونان کی نظریاتی سائنس اور علوم طبعی کو آسمانی وحی کی سند فراہم کر کے انہیں جزو ایمان قرار دے چکے تھے، تو دوسری طرف یورپ میں حقائق پر مبنی عقلیت (مشاہداتی سائنس) کا کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ علما طبعیات اور سائنسی محققین تقلید محض کی زنجیریں توڑ رہے تھے اور بڑی جسارت کے ساتھ ان بے اصل نظریات کی تردید شروع کی جنہیں ارباب کلیسا خدائی تعلیمات قرار دے کر جزو ایمان ٹھہرا چکے تھے۔ وہ ان پر حقارت آمیز انداز سے علمی تنقید کر رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے جدید علمی انکشافات، سائنسی تحقیقات اور تجربوں سے عوام کو روشناس کرانے کا اہتمام بھی کیا۔ اب چاہئے تو یہ تھا کہ مسیحی علما وسعت نظر سے کام لیتے تنقیح اور چھانٹ کرتے حقیقی خدائی تعلیمات ڈھونڈ نکالنے کے لئے عیسائیت کی تحریف شدہ تعلیمات پر نظر ثانی کرتے اس عمل میں انہیں قرآنی تعلیمات سے کافی مدد مل سکتی تھی اس

لئے کہ ان دنوں اسلام یورپ میں داخل ہو چکا تھا لیکن اس کے برعکس ان کی تنگ نظری، کم ظرفی اور رجعت پسندی کے نتیجہ میں مذہبی حلقوں میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ ارباب کلیسا نے جو وسیع اختیارات اور طاقت کے مالک تھے ایسے تمام محققین اور ان کی تصدیق کرنے والوں کی تکفیر اور ارتداد کے فتوے جاری کئے۔ ان کو قتل کرنے، زندہ جلانے اور ان کے مال وجائداد ضبط کرنے کے احکامات جاری کئے۔ اور احتساب کی عدالتیں قائم ہوئیں۔

پاپائے اعظم نے حکم جاری کیا کہ ان ملحدین اور مرتدین کو سزا دی جائے جو شہروں، گھروں، تہہ خانوں، جنگلوں، غاروں اور کھیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان عدالتوں نے اپنا فریضہ پوری سرگرمی اور مستعدی سے انجام دیا اس کے جاسوس براعظم کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تھے اور اس بارے میں محکمۂ احتساب نے تفتیش اور تجسس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس محکمہ نے جن لوگوں کو سزا دی ان کی تعداد تین لاکھ سے کم نہیں، جن میں بتیس ہزار کو زندہ جلایا گیا ان زندہ جلائے جانے والوں میں ہیئت وطبعیات کے مشہور عالم برونو (BRUNOE) بھی شامل تھے جس کا سب سے بڑا جرم کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔

محکمۂ احتساب کے حکام نے اسے اس سفارش کے ساتھ دنیاوی حکام کے سپرد کیا کہ اسے نہایت نرمی کے ساتھ سزا دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے ایسی سفارش کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس کو آگ میں جلایا جائے۔

مشہور طبعی عالم گلیلیو (GALILIO) کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ وہ آفتاب کے گرد زمین کے گھومنے کا قائل تھا۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر۔ ص: ۲۶۳ تا ۲۶۵)

ڈاکٹر ڈریپر لکھتا ہے کہ "پاپائے روم کے ہاں ہر وہ عیسائی کافر تھا جو کلیسائی ذہن سے

بالاتر ہو کر سوچتا، علمی کتابیں لکھتا، سائنسی نظریات پیش کرتا، مسلمانوں کی تہذیب یا کسی اور بات کو سمجھتا، یا باہر روڈ نہاتا، ایسے کافروں کو سزا دینے کے لیے پاپائے ۱۴۷۸ء میں ایک مذہبی عدالت قائم کی۔ اس نے پہلے سال دو ہزار اشخاص کو زندہ جلایا اور ستر ہزار کو قید و جرمانے کی سزا دی۔ اس طرح دس برس میں اس نے سترہ ہزار کو آگ میں پھینکا، ستانوے ہزار تین سو اکیس افراد کو قید و بند کی سزا دی اور ساتھ ہی مختلف علوم کی چھ ہزار کتابیں جلا دیں۔

پاپا کی مرکزی عدالت نے ۱۴۸۱ء اور ۱۸۰۸ء کے درمیانی عرصہ میں تین لاکھ چالیس ہزار نفوس کو نہایت المناک سزائیں دیں ان میں سے بتیس ہزار کو زندہ جلا دیا۔

(معرکہ مذہب و سائنس۔ ص: ۲۵۰ تا ۲۸۶)

پاپ مذہبی ادب کے بغیر باقی تمام اقسام کے علم کا دشمن تھا اور اس مذہبی تاثر اور تعصب کا جذبہ عیسائی عوام اور افواج میں بھی بھرا ہوا تھا۔ ۱۱۳۷ء میں فرانس کے پادری سینٹ برنارڈ کی تنگ نظری کا یہ عالم تھا کہ وہ عوام کو ملکی قوانین (دیوانی وغیرہ) کے مطالعہ سے بھی منع کرتا تھا۔ (تشکیل انسانیت۔ ص: ۲۲۲ از رابرٹ بریفالٹ)

طرابلس میں اس دور کی عظیم لائبریری تھی جس میں مختلف موضوعات پر کتابوں کی تعداد تیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ جب صلیبی لشکر اس شہر میں پہنچا تو اس عظیم لائبریری کو آگ لگا کر خاکستر کر ڈالا۔ اس طرح مسلمانوں کی چھ سو سالہ محنت کو ضائع کر دیا گیا۔

برطانیہ کا ایک فلسفی "ڈرہیبیا" اسپین کے مشہور مسلمان فلسفی ابن رشد (۱۱۹۸ء) کا شارح تھا اس نے اپنی تصانیف میں فلسفہ و مذہب میں اتحاد کی کوشش کی تھی تو پادریوں نے اس کی بیشتر کتابیں جلا دیں۔

یونان کی "ہائی پیشیا" نامی ایک لڑکی اسکندریہ میں تحصیل علوم کے لیے آئی اور برسوں کی محنت کے بعد وہ ایک ممتاز فلسفی بن گئی۔ اسے افلاطون اور ارسطو کے فلسفے اور ریاضی و ہندسہ میں بڑا ادراک حاصل تھا، اسکندریہ کے بشپ "سائرل" نے اس لڑکی کو کافرہ

قرار دیا اور ایک روز جب وہ فرائض تدریس انجام دینے کے لئے اپنی درس گاہ کی طرف جا رہی تھی تو سائرل کے بھیجے ہوئے چند سنگدل راہبوں نے اسے پکڑ لیا، پہلے ننگا کر کے بازار میں گھسیٹا پھر اسے گرجے میں لے گئے وہاں تیز چھریوں سے اس کی کھال کھرچی۔ پتھر سے اس کا سر توڑا۔ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے اور انہیں آگ میں پھینکا۔

گلیلیو ۱۶۴۲ء فلارنس (اٹلی) کا وہ مشہور ہیئت دان ہے جس نے دوربین ایجاد کی تھی۔ جب اس نے "کاپرنیکی" کے نظام شمسی کی تائید کی کہ سورج کے گرد زمین، چاند وغیرہ سیارے گردش کر رہے ہیں تو پوپ نے اسے گرفتار کر کے مذہبی عدالت کے سامنے پیش کیا۔ اس نے وہاں ڈر کے مارے توبہ کر لی مگر اس نے بعد میں اپنی کتاب "نظام عالم" شائع کی جس پر اسے جیل میں پھینک دیا گیا جہاں اس نے انتہائی دکھ اٹھانے کے بعد سسک سسک کر اپنی جان دیدی۔ (معرکہ مذہب و سائنس۔ ص: ۱۵۰،۲۰۷،۲۰۶،۲۰۷،۲۷۳)

پادری مارٹن لوتھر جب پوپ سے باغی ہوا اور اس نے پاپائیت اور رہبانیت کی بعض خرافات پر تنقید شروع کی، جس کی ابتداء ۱۵۱۷ء میں مالی لالچ کی بنا پر ہوئی تو پوپ نے لوتھر پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ لوتھر بھاگ کر سیکسنی کے ایک سردار کے ہاں پناہ لینے میں کامیاب ہوا چونکہ لوتھر گھر کا بھیدی تھا اس لئے کلیسا والوں کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کیا۔ لوتھر ۱۸ فروری ۱۵۴۶ء کو اپنی موت مرا۔ لیکن پاپائیت اور رہبانیت کے خلاف اس کی تعلیمات اور تنقیدات کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا اور اس کی تحریک (پروٹسٹنٹ) کے پیروکاروں میں اضافہ ہوتا رہا۔ جب پوپ نے اپنے اقتدار کو خطرے میں دیکھا تو فرانس کی حکومت کو "پیروکاران لوتھر" کے قتل عام کا حکم دیا۔ اس طرح ۲۴ اگست ۱۵۷۲ء کو فرانس میں پچاس ہزار پیروکاران لوتھر بے دردی سے قتل کر دیئے گئے۔

(معرکہ مذہب و سائنس اور یورپ پر اسلام کا احسان)

مذہب کے خلاف بغاوت

ارباب کلیسا نے یہ راہ اختیار کی کہ ہر وہ زبان کاٹ دی جائے جو اُن کی بتائی ہوئی تعلیمات کے خلاف بولے، ہر وہ آنکھ پھوڑ دی جائے جو اس کے پیش کیے ہوئے حقائق کے برعکس حقیقتوں کا مشاہدہ کرے اور ہر اس دماغ کو پاش پاش کر دیا جائے جو ارباب کلیسا کے دیئے ہوئے تصورات سے بالاتر سوچے۔

اس روش کا جو نتیجہ برآمد ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ یورپ کے سنجیدہ طبقے نے سوچنا شروع کیا کہ اگر دین و مذہب، کی تعلیمات یہی ہیں، جو کلیسا کی مقدس کتابوں میں ثبت ہیں اور مذہبی نمائندے ان کی صداقت اور حفاظت کی خاطر اس انتہاپسندی تک جا پہنچے ہیں، (حالانکہ ان کا بے بنیاد ہونا مشاہدہ اور تجربہ جیسے قطعی دلائل سے ثابت ہے) تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ ارباب کلیسا دین و مذہب کے نام پر جو کچھ پیش کر رہے ہیں، وہ جھوٹ اور بے بنیاد ہیں۔

اب براعظم یورپ میں عقل و نقل یعنی سائنس اور مسیحیت میں ہمہ گیر جنگ شروع ہوئی عقل تو مشاہدات، تجربات اور سائنٹیفک بنیادوں پر ثابت شدہ حقائق کے اسلحہ سے لیس تھی جب کہ محرف مسیحی مذہب کے اندر قدیم یونانی نظریات، فلسفہ کے مفروضات اور کلیسا کے احبار و رہبان کے قصے کہانیاں تھیں جن کی پشت پر وحی آسمانی کی سند نہ تھی بلکہ ان کے پاس نمائشی آلات جنگ کے سوا کچھ نہ تھا اور اس مقابلے کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہ نکل کے رہا۔

پندرہویں عیسوی صدی

جناب عبدالحمید صدیقی صاحب لکھتے ہیں "گویا اہل کلیسا کی حماقت کی وجہ سے پندرہویں صدی عیسوی میں ایک ایسی جذباتی کشمکش شروع ہوئی جس سے چڑ اور ضد میں

بہک کر "تبدیلی" کے جذبات خالص الحاد کے راستے پر پڑ گئے اور اس طویل کشمکش کے بعد مغرب میں تہذیب والحاد (Secularism) کا دور شروع ہوا"۔

آگے لکھتے ہیں:

"ہر وہ تحریک جس کا آغاز اس مفروضہ پر کیا گیا، کہ کوئی خدا نہیں، کوئی الہامی ہدایت نہیں، کوئی واجب الاطاعت نظام اخلاق نہیں، کوئی حشر نہیں اور کوئی جوابدہی نہیں، ترقی پسند تحریک کہلائی اس طرح یورپ کا رخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف پھر گیا۔ خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات وذہنیت، اخلاق واجتماع، علم وادب، حکومت وسیاست، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں الحاد پوری طرح غالب آگیا اگرچہ یہ سب کچھ تدریجی طور پر ہوا۔ ابتدا میں اس کی رفتار بہت سست تھی لیکن آہستہ آہستہ اس طوفان نے سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا"۔ (انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام۔ ص:۲۱)

سید ابوالحسن علی ندویؒ اس کیفیت کی منظر کشی یوں فرماتے ہیں:

"آخر کار روشن خیالوں اور ترقی پسندوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے مذہب وقدامت کے نمائندوں کے خلاف علم جنگ بلند کر دیا۔ وہ مذہبی گروہ کے اس تشدد وجمود اور محکمۂ احتساب کے مظالم سے ایسے بیزار اور مشتعل ہوئے کہ ان کو تمام عقائد، علم، اخلاق وآداب سے نفرت ہو گئی جن کی نسبت اس گروہ کی طرف کی جاتی یا ان کا تعلق ان سے ثابت ہوتا۔ ان کے دل میں ابتدائی طور پر تو مسیحی مذہب سے اور پھر رفتہ رفتہ مذہب سے مطلق عداوت اور نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا، اور وہ جنگ جو ابتدائی طور پر علوم اور عقلیت کے علم برداروں اور مسیحی مذہب (درحقیقت مذہب سینٹ پال) کے نمائندوں کے درمیان تھی، نے بعد میں علم ودین کی باہمی جنگ کی صورت اختیار کر لی، روشن خیالی اور عقلیت کے علم برداروں نے بطور خود یہ طے کر لیا کہ علم ومذہب ایک دوسرے کی ضد اور مقابل واقع ہوئے ہیں، جو کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور دونوں ایک دوسرے کے رقیب ہیں جن میں کبھی

صلح نہیں ہو سکتی، اس لئے علم اور عقلیت کے ساتھ وفاداری کے لئے ضروری ہے کہ مذہب سے منہ موڑ لیا جائے۔

ان کے سامنے جب دین و مذہب کا نام آتا تو دفعتاً نمائندگان مذہب اور ارباب کلیسا کے لرزہ خیز مظالم کی یاد تازہ ہو جاتی اور ان بے گناہ علماؔ اور محققین کی صورتیں ان کی آنکھوں میں پھر جاتیں جنہوں نے انتہائی مظلومیت اور بے بسی کی حالت میں ان جلادوں کے ہاتھوں پُر اذیت موت پائی۔ مذہبی گروہ کا نام سنتے ہی ان کی نگاہوں کے سامنے پُر غضب چہرے، چڑھے ہوئے تیور، شرر فشاں آنکھیں، تنگ سینے اور پادریوں کے بھدے دماغ آجاتے۔ چنانچہ مذہب سے وحشت اور نفرت کو انہوں نے ایک اصول زندگی کے طور پر تسلیم کر لیا اور آنے والی نسلوں کے لئے بھی نفرت و کراہت کا یہی ترکہ اور سرمایہ چھوڑا۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ ص: ۲۶۵)

باب سوم

نت نئے ازم

لبرل ازم (Liberalism) :

جب یورپ میں دین اور مذہب کے خلاف اور اللہ تعالیٰ اور پیغمبروں سے بیزاری کا ہمہ گیر طوفان بپا ہوا، اس وقت مذہب اور دین کے خلاف یورپ نے لبرل ازم کا نعرہ بہت کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ لبرل ازم کے لئے عربی اور اردو میں متعدد اصطلاحی نام ایجاد ہوئے مثلاً "وسیع النظری" "وسیع المشربی" "اعتدال پسندی" "روشن خیالی" "ترقی پسندی" اور "آزاد خیالی" وغیرہ۔ اسی طرح دین ومذہب اور اللہ تعالیٰ اور پیغمبروں پر پختہ یقین رکھنے والے اور دین پر عمل کرنے والوں کے لئے نئی اصطلاحات ایجاد ہوئیں مثلاً "قدامت پسند" "رجعت پسند" "فرسودہ خیال" یا "مذہبی جنون" یہ اور اس جیسے دوسرے جادوئی اور پرکشش الفاظ کو سنتے ہی جدید تعلیم یافتہ نوجوان آج بھی مسحور ہو کر پہلی قسم کے القاب کا مصداق بننے اور دوسری قسم کے القاب سے اپنے آپ کو بے داغ رکھنے کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔

لبرل ازم نے ابتداءمیں تو اس لئے مقبولیت اور جاذبیت حاصل کرلی، کہ عوام کلیسا اور پاپائیت کے ناروا بندھنوں، جبر وتشدد اور تنگ نظری سے کافی حد تک تنگ آچکے تھے اور کسی طریقے سے آزادی چاہتے تھے لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس آزاد خیالی نے ذہنی اور اخلاقی انارکی کی شکل اختیار کرلی اور اب روشن خیالی کے یہ معنی قرار پائے کہ انسان کو ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہونا چاہئے خواہ وہ پابندیاں مذہب اور دین کی عائد کردہ ہوں یا سماج اور رسم ورواج کی۔ گویا آج آزادی اور روشن خیالی کا مفہوم "نری حیوانیت" یا "مادر پدر آزادی" ہی ٹھہرا۔ حد یہ کہ ہر وہ چیز جو پہلے سے چلی آرہی تھی وہ چاہے اپنے اندر صداقت

وافادیت کے کتنے ہی پہلو کیوں نہ رکھتی ہو، اسے بہر حال رد کر دینا اور اس کے مقابلے میں کوئی انوکھی اور نئی بات کہنا ہی روشن خیالی کی سب سے بڑی دلیل ٹھہری۔ اس نظریہ کا اثر اس قدر ہمہ گیر تھا کہ زندگی کے تمام شعبے اس سے متاثر ہوئے۔
("یورپ میں آزاد خیالی کی تحریک" ازلاسکی)

لبرل ازم اور ہیگل کا فلسفہ تاریخ

آزاد خیالی کی تحریک کے لئے ہیگل کے فلسفے نے زبردست علمی سند فراہم کی، اس فلسفے نے دینی اور مذہبی نظریات پر ایسا مدلل اور منظم فکری حملہ کیا، جس کی ضرب ذہن پر بہت کاری ہے۔ اس سے انسان کے دینی تخیل اور مذہبی افکار کی جڑ ہی کٹ کر رہ جاتی ہے۔ ہیگل کے فلسفے کا لب لباب یہ ہے۔

"ہر قدیم کے مقابلہ میں جدید بہتر اور مفید ہوتا ہے۔ لہٰذا اقدامت پرستی اور رجعت پسندی، کند ذہنی اور بھدے پن کی نشانی اور حماقت کی علامت ہے۔ اور تجدد پسندی، روشن فکری اور معقولیت کی دلیل ہے"۔

سرسری نگاہ سے تو یہ بات بڑی دلکش اور مدلل معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی تہہ میں جاکر ٹٹولنے پر اس کلیے کا کھوکھلا پن بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ جہاں تک انسانی ایجادات کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں تو ہیگل کی بات درست ہے۔ اس لئے کہ انسان کا علم محدود اور بہت کم ہے۔ اس میں تجربات، مشاہدات اور وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے آج اگر انسان کوئی چیز ایجاد کرتا ہے۔ تو اس میں کئی نقائص اور عیوب نمودار ہوتے ہیں، اور اس طرح انسان پہلے سے بہتر چیز بنا لیتا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اس لئے اس حد تک تو ہیگل کا نظریہ درست ہے۔ لیکن......

اللہ تعالیٰ کا علم ماضی اور مستقبل پر حاوی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی ایجادات کی افادیت

بلحاظ ماضی اور مستقبل یکساں ہوتی ہے بلکہ مستقبل میں ان کی افادیت فزوں تر ہو جاتی ہے۔
لہٰذا اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں میں ہیگل کا فلسفہ درست نہیں مانا جا سکتا۔ مثلاً......
کائنات کو ہی لیجئے سورج، زمین، پانی، ہوا، معدنیات اور نباتات و حیوانات بہت ہی پرانے ہیں۔ لیکن ہر آنے والا دن ان کی نفع بخش اہمیت کو بڑھا دیتا ہے۔
انسان اور اس کی شکل و صورت کو ہی لیجئے، کیا کوئی روشن خیال اس سے بہتر انسانی شکل کا تصور کر سکتا ہے؟ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ انسان کے چہرے میں ناک یا آنکھیں یا کان بے محل ہیں؟ کوئی جدت پسند ہے جو کہے کہ ناک کھوپڑی کے اوپر اور آنکھوں میں سے ایک پیشانی پر اور ایک سر کے پچھلے حصے میں ہونی چاہئے؟...... جواب
یقیناً نفی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم

"بے شک ہم نے انسان کو بہتر قوام کے ساتھ پیدا کیا ہے"۔

اگر خدا کی پیدا کردہ مذکورہ چیزوں کی طرف ہی رجوع کیا جاتا تو معلوم ہو جاتا، کہ ان سے اپنی ضروریات بہتر طور پر پورا کرنے میں پوری انسانیت منہمک ہے۔ اور مزید فوائد کے حصول کے لئے کوشاں ہے اور اس میں مزید اضافہ انسانیت کا کمال سمجھا جاتا ہے۔

اور کائنات سے بے رخی اور لا تعلقی کو انسانیت کی حماقت اور زوال سمجھا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ ہیگل کا فلسفہ غلط ہے۔

اسی طرح دین اور مذہب جب اللہ تعالیٰ کی حقیقی تعلیمات اور وحی پر مبنی ہوں تو یہ اللہ تعالیٰ کی ایجاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ضرورت اور افادیت میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وفی انفسکم افلا تبصرون.

"تم اپنے نفسوں میں جھانک کر نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ کی ایجادات جتنی

قدیم تر ہیں اتنی ہی مفید ہیں"۔

یورپ پر لادین ازموں اور نظریوں کی یلغار

یورپ نے جب دین، مذہب اور اخلاق کا لبادہ اتار پھینکا، تو ان کے ذہنوں سے موت کے بعد زندگی اور جنت ودوزخ کا تصور بھی یا تو مٹ گیا یا برائے نام باقی رہا۔ مذہب عبادت خانوں کی چار دیواری میں محدود اور انسان اور خدا کے آپس کے انفرادی تعلق کے ساتھ مقید ہوگیا، اور حیات دنیوی میں بھرپور اور بے لاگ لذت وراحت، عیش وعشرت اور خواہشات نفس کی تکمیل اور مادی رسائی میں جدید اور خوب تر کے حصول کے لئے مسابقت معراجِ انسانیت اور معیارِ کمال ٹھہرا۔

دوسری طرف سائنس دانوں کی نت نئی تحقیقات وایجادات اور میکیاولی، ہیگل، فرائڈ اور ڈارون جیسے فلاسفروں کے منظم اور مدلل فلسفوں نے دین ومذہب کے بچے کھچے اثرات بھی محو کردیئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں نت نئے ازموں اور نظریات کی بھرمار ہوگئی، ان میں سے چند کو عالمی شہرت حاصل ہوئی، جن کے آہنی پنجوں کی گرفت میں ملت اسلامیہ سمیت تمام اقوام عالم پھنس کر رہ گئیں اور ان کے ہولناک نتائج پوری انسانیت کو بھگتنے پڑ رہے ہیں۔ ان ازموں میں سے مندرجہ ذیل نظریات نے عالم گیر شہرت حاصل کرلی۔

۱۔ لبرل ازم : (Liberalism)

اس کا تفصیلی ذکر ہوچکا ہے۔

۲۔ میٹریل ازم : (Materialism)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کائنات میں قوت کا سرچشمہ مادہ ہے۔ جو قدیم اور ازلی ہے۔ فنا نہیں ہوتا، ہر موجود کا وجود اسی کے وجود کا محتاج اور مرہون منت ہے۔ اور مادہ اپنے

وجود میں کسی غیر کا محتاج نہیں ہے گویا مادہ کا وجود "لذاتہ" ہے اور وہی بے نیازی اور صمدیت کی صفات کا حامل ہے۔

۳۔ نیشنل ازم : (Nationalism)

یعنی رنگ و نسل، زبان اور وطن کی بنیاد پر ہر قوم کو حق ہے۔ کہ ان پر اپنوں کی حکومت ہو نیز یہ کہ قوم و وطن کا تقدس ہر دوسری چیز سے بالاتر و مقدم ہے۔ اور ہر وہ قول و فعل اور خیال جو قوم اور وطن کے دنیاوی مفاد میں ہو وہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ قوم پرست اور وطن پرست پر لازم ہے اور جو بھی چیز قوم و ملک کے لئے مفید نہ ہو وہ ناجائز ہے۔

۴۔ سیکولر ازم : (Secularism)

یعنی حکومت و ریاست کے تمام معاملات سے دین و مذہب اور خدا (جل جلالہ) اور رسول ﷺ کے قوانین اور مرضی اور منشاء کو بے دخل کر دیا جائے، دین و مذہب کو فرد کا نجی معاملہ ٹھہرا کر عبادت خانوں تک محدود کر دیا جائے، اور حکومتی اور دنیاوی جملہ معاملات کا انتظام آزادانہ روش پر چلایا جائے۔

۵۔ کیمونزم یا سوشلزم : (Communism or Socialism)

یہ دونوں بنیادی عقائد کے لحاظ سے ایک ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے، کہ سوشلزم کی انتہا اور تکمیل کیمونزم ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ "زن"، "زمین" اور "زر" مشترک امور ہیں، ان پر نہ کسی انسان کی جاگیرداری ہے اور نہ مذہبی قوانین کی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام کی نبوت حقیقت میں کوئی صداقت ہی نہیں (العیاذ باللہ)۔

جملہ فسادات کی جڑ :

چونکہ تمام باطل نظریات اور ہر باطل ازم کی پیداوار کا سبب در حقیقت مروجہ جمہوریت ہی ہے، لہٰذا میں نے جو کچھ عرض کرنا ہے وہ جمہوریت کے متعلق ہے باقی ازموں کی تردید میرا موضوع بحث نہیں البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ "جب ماں مر جاتی ہے تو اس کے

شکم کے اندر بچہ خود بخود مر جاتا ہے"۔

قصہ کوتاہ :

کلیسا اور پاپائیت کے بندھن میں بندھی ہوئی یورپی اقوام نے جب مذہب اور دین سے رشتہ توڑ ڈالا اور مذکورہ مختلف فلسفوں، ازموں اور نظریوں نے ان کی وحدت کو مزید پارہ پارہ کیا، تو انہیں اس خلفشار کا شدت سے احساس ہوا اور وہ دوبارہ یورپ کے بکھرے ہوئے دانوں کو وحدت کے کسی ایک دھاگے میں پرونے کے لئے بیتاب ہو گئے۔

دین کلیسا کی جگہ دین جمہوریت

جدت پسندی، حریت عامہ اور اباحیت مطلقہ سے جب مذاہب کا بندھن اور وحدت ٹوٹ گئی اور مختلف قسم کے ازموں اور تنظیموں کے نقطہ ہائے نظر کی بھرمار شروع ہوئی، تو اس کے نتیجہ میں متحدہ یورپ نسلی، قومی، جغرافیائی اور نظریاتی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ اب ایک طرف تو ان گنت نظریات میں مسابقت اور رقابت شروع ہو گئی، اور دوسری طرف دین مسیحیت سے آزادی حاصل کرنے سے ایک ہمہ گیر خلاء کے فطری احساس نے اہل یورپ کو گھیر لیا۔ کیونکہ بقول شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ "انسانی طبیعتیں ہمیشہ کسی چیز سے اس وقت دست بردار ہوتی ہیں، جب ان کو اس کا بدل ملتا ہو"۔

(کتاب اقتضاء الصراط المستقیم۔ ص: ۱۴۲)

اب یورپ کے جدت پسند دانشوروں نے ایک ایسے نظام زندگی کی ضرورت محسوس کی، جس میں نہ صرف اس وقت کی اباحیت مطلقہ اور ملحدانہ و مادہ پرستانہ نظریات سمو دینے کی اہلیت ہو، بلکہ مذہبی اور خدا پرست حلقوں کے لئے بھی اس میں پوری جاذبیت اور کشش ہو۔ نیز اس میں آفاقی اور عالم گیر ہونے کے ساتھ ساتھ نت نئے ازموں اور نظریوں کو ہضم کرنے اور ہر جگہ اور ہر زمانے میں ہوا کے رخ کے ساتھ بدلتے رہنے کی مناسب لچک

ہو تاکہ یہ چیز اقوام عالم میں مذہبی اور دینی نظم وربط کا نعم البدل بن سکے، اور کسی کو مذہب اور دین کی عدم موجودگی کا احساس نہ ہو۔

گویا کہ یورپ والوں کو اب ایک ایسے نظام کی ضرورت تھی، جو متضاد عقائد و نظریات رکھنے والوں کے لئے "صلح کامل" اور "حد اوسط" ہو اور "با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام" کا مصداق ہو۔

آپ جانتے ہیں کہ کوئی بھی حقیقت زمان اور مکان کی تبدیلی سے نہیں بدلتی مثلاً روشنی اپنے اسباب کے وجود کے بعد ہر جگہ اور ہر وقت اپنی حقیقت اور آثار و خصوصیات کا مظہر ہوتی ہے۔ اسی طرح اندھیرا زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہو کر اپنے اسباب کا تابع ہے۔ اہل یورپ کے لئے بھی ایک عالمگیر نظام میں زمان و مکان اور مختلف اقدار و روایات کی قیود، رکاوٹ بن سکتے تھے۔ لیکن یورپ والوں نے مذکورہ مشکل کو حل کرنے کے لئے شرط اول یہی ٹھہرائی کہ وہ نظام کسی بھی حقیقت پر مبنی نہ ہو۔ لہٰذا یورپ والوں کے مطلوبہ معیار پر اگر کوئی نظام صحیح اترتا ہے، تو وہ صرف اور صرف جمہوریت ہے۔ یعنی بلحاظ اکثریت عوام کی حاکمیت اور شارعیت ان کی رضامندی سے ہو۔

اب جہاں اور جب عوام کی اکثریت فیصلہ دیں کہ ماں، بہن اور بیٹی سے نکاح درست ہے، تو جمہوریت کی رو سے یہ فیصلہ بالکل درست ہو گا۔

اور جہاں اور جب عوام کی اکثریت فیصلہ دے، کہ مذکورہ نکاح ناجائز ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے، از روئے جمہوریت یہ فیصلہ بالکل درست ہو گا، اس طرح یورپ کے جدت پسندوں کی مشکل کو "جمہوریت" نے اس خوش اسلوبی سے حل کیا کہ بت خوش، بت پرست خرم اور بت شکن بھی راضی، جمہوریت کے نغمے پر، منکر خدا اور موحد، دیندار اور بے دین، عالم اور جاہل، امیر و فقیر، ظالم و مظلوم سب کے سب رقصاں و شاداں ہیں اور ایک ہی اسٹیج سے جمہوریت کے ثناخواں ہیں، اور ہر ایک فرقہ اپنے

مسائل کا حل جمہوریت ہی سے وابستہ کرتا ہے، اس طرح تمام فرقے یکجا نظر آتے ہیں۔

من تو شدم تو من شدی من جان شدم تو تن شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

عقل سلیم حیرانگی کے چوراہے پر

کوئی بھی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان اگر چند لمحوں کے لئے اپنے ذہن کو ہر قسم کے میلانات اور رجحانات سے خالی کرے اور پھر کرہ ارض پر موجود آسمانی اور انسانی ادیان، مذاہب اور نظریات مثلاً اسلامی شریعت، یہودیت، عیسائیت، بدھ مت، ہندوازم، سیکولرازم، کمیونزم، سوشلزم وغیرہ، نظام ہائے حیات پر ایک نظر ڈالے تو اسے قطعی یقین ہو جاتا ہے، کہ یہ گروہ اپنے اپنے ادیان اور نظریات پر قائم ہوتے ہوئے کسی ایک نظام حیات پر متفق نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ایسا ہونا ممکن ہے، لیکن اس کے باوجود آج یہ سب جمہوریت کے نہ صرف ثناخواں ہیں، بلکہ اس کے لئے کوشاں بھی ہیں، اور صبح جمہوریت کی طلوع کے لئے ترس رہے ہیں، نیز کسی اسلامی ملک میں جمہوریت کی آمد پر اس ملک کے مسلمان سربراہ اور مسلمان عوام بلکہ خالص مذہبی اور دینی جماعتیں جتنی خوش وخرم ہوتی ہیں، اس سے کہیں زیادہ امریکہ اور دیگر مغربی اقوام خوشی کا اظہار کرتی ہیں، اور ہر طرف سے تہنیت اور مبارکبادی کے پیغامات موصول ہوتے ہیں، اور کسی اسلامی مملکت میں نووارد جمہوریت کے پھلنے پھولنے کے لئے بہ دل وجان کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ اس میں حیرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ

"اگر جمہوریت مسلمان ہے تو کفار اس پر کیوں خوش ہوتے ہیں، جبکہ وہ اسلامی نظام کا نام سننے سے الرجک ہیں، اور اگر جمہوریت کافر ہے، تو مسلمان اور خاص کر دینی اور مذہبی جماعتیں کیوں اس کے شیدائی ہیں؟" حالانکہ تاہنوز تو مسلمان ممالک میں نام کی جمہوریت ہے اور یہ لوگ حقیقی جمہوریت کا رونا روتے ہیں۔ اگر مسلم ممالک میں حقیقی جمہوریت آگئی،

پھر تو قرآنی اور اسلامی نظام کا خدا ہی حافظ۔

ابلیس کی تلقین جمہوریت

روزنامہ مشرق میگزین صفحہ ۳، ۱۱ نومبر ۱۹۸۸ء میں جناب عامل صدیقی امروہوی کی ایک نظم شائع ہوئی تھی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ابلیس اپنے چیلوں پر اس لئے برہم ہے کہ وہ جمہوریت کو اس کی حقیقی شکل میں نافذ نہیں کر سکے، اگر ایسا کرتے تو آج نظامِ اسلام کا نام تک کوئی نہ لیتا۔

نظم آپ بھی پڑھ لیجئے۔

فتنۂ اسلام کا ہے توڑ جمہوری نظام
میری موسیقی کی دھن پر رقص کرتے ہیں عوام
نوجوان جتنے نظر آتے ہیں پاکستان میں
مبتلا کرتے انہیں اعصاب کے ہیجان میں
عقل سے کرتے اگر تم واقعی اس کام کو
بھول جاتے لوگ اپنے آپ ہی اسلام کو
میری حکمت بے ضرر میری شریعت بے نظیر
کاکل پیچاں میں کھو جاتی ہے مذہب کی لکیر
عقدہ جمہوریت سے پاک واقف ہو نہ جائے
ڈر رہا ہوں میں کہ میری اصل طاقت کھو نہ جائے

قصہ مختصر :

جدت پسندوں کو داد کا مستحق کہنا پڑے گا کہ جس زہریلے نظام کو انہوں نے دین اور مذہب کی بیخ کنی کے لئے اپنایا، اسی نظام کو اہل دین و مذہب تریاق سمجھ کر اپنانے کے لئے

کوشاں ہیں۔

جمہوریت کے ذریعے نفاذ اسلام کی واضح مثال

جو چیز جس مقصد کے لئے وجود میں لائی جاتی ہے، یا حاصل کی جاتی ہے، وہی اس چیز کا ثمرہ اور حاصل ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ''فن طب'' کی غرض وغایت انسانی جسم کی کارکردگی اور اس میں خلل پڑنے یعنی بیمار ہونے پر اس کا علاج کرنا ہے، یہی علم طب کا ثمرہ اور مقصود ہے۔

اب اگر کوئی شخص مذکورہ فن سے مذکورہ ثمرات کے حصول کی امیدیں وابستہ کرلیتا ہے، تو یہ ایک منطقی بات ہے اور تقاضائے عقل کے عین مطابق ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص طبی علوم میں اس لئے مہارت حاصل کرنے لگے، کہ وہ اس علم کے ذریعے ایک بہترین عمارت تعمیر کرسکے گا، یا ایک مثالی پل بنا سکے گا یقیناً ایسا سوچنے والے کو احمق قرار دیا جائے گا۔ اور اسکی غلط سوچ کی ہم تین وجوہات بیان کریں گے۔

۱۔ اس کو غرض وغایت اور ثمرہ یعنی نتیجہ کے اتحاد کا علم نہیں ہے۔

۲۔ اس کو کسی نے فن طب کی غرض وغایت غلط سمجھائی ہے۔

۳۔ یہ شخص بے وقوف اور عقل سے کورا ہے۔

یہی مثال ان لوگوں کی ہے جو جمہوریت سے اسلامی شریعت کی امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہیں، اور بڑی نیک نیتی سے جمہوریت کے نفاذ کی جدوجہد کررہے ہیں۔

الغرض دین کلیسا اور پوپ مذہب سے نجات حاصل کرنے کے لئے جو تحریک چلائی گئی وہ جمہوریت ہی تھی، لہٰذا جمہوریت کا لازمی ثمرہ مذہبی قیود اور پابندی سے آزاد معاشرے کا قیام ہی ہے۔ (فاعتبروا یا اولی الالباب)

حریت پسندوں کی جلد بازی

حریت پسندوں کی تنگ نظری، جلد بازی اور انتقام پسندی کی انتہا دیکھے کہ انہوں نے بغیر تحقیق اور جستجو کے کلیسا اور پوپ کا انتقام، دین اسلام اور علماً اسلام سے لیا۔ جس کے نتیجے میں حریت پسندوں نے جس نگاہ سے کلیسا اور پوپ کو دیکھا اسی نگاہ سے وہ دین اسلام اور علماً اسلام کو دیکھنے لگے۔ حالانکہ بحیثیت سائنس دان اور فلاسفر، ہر لبرل شخص پر فرض تھا کہ دین اسلام اور قرآن کریم کی تعلیمات کے متعلق وہ پہلے تحقیق اور ریسرچ کرتا، جو کوئی مشکل کام نہ تھا اس لئے کہ یورپ میں اسلام کی روشنی ساتویں صدی عیسوی میں ہی پہنچ چکی تھی، مسلمانوں نے اندلس (اسپین، سسلی، قرطبہ، غرناطہ) پر چھ سو سال سے زیادہ عرصہ تک مثالی حکمرانی کی ہے۔

اگر یورپ کے حریت پسند اور روشن خیال قرآنی تعلیمات کا مطالعہ کرتے تو ان پر بہت جلد واضح ہو جاتا کہ کلیسا نے رہبانیت کا غیر فطری طرز حیات، ترک دنیا، نفس کشی، مجاہدات اور کائنات کے بارے میں عجیب وغریب قصے خود اپنی طرف سے گھڑ رکھے ہیں، ان کا آسمانی وحی سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ سب کچھ کلیسا کی خرافات ہیں، اور یقیناً حریت پسند کلیسا کی بے جا قدغنوں اور زنجیروں کو توڑنے اور ناقابل برداشت بوجھ سے اپنے کندھوں کو آزاد کرانے میں قرآن کریم کو اپنا معاون اور ہمنوا لیاتے۔

مثال کے طور پر چند آیات درج کرتے ہیں

قولہ تعالیٰ: ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم۝

(الاعراف۔ آیت:۱۵۶)

”(نبی علیہ السلام) اہل کتاب کو اس بوجھ سے نجات دلاتا ہے جس کے تلے

وہ دبے ہوئے ہیں ان کو ان پھندوں سے آزاد کراتا ہے جو ان پر پڑے ہوئے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: ورھبانیۃ ن ابتدعوھا ما کتبنھا علیھم الا ابتغآ رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا ۝ (پارہ، الحدید۔ آیت:۲۶)

"اہل کلیسا نے رہبانیت کو خود گھڑ لیا تھا ہم نے اس کا حکم نہیں دیا تھا مگر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کو پھر انہوں نے خود ساختہ رہبانیت کو بھی نہیں نبھایا (یعنی درون پردہ کچھ اور کرتے رہے)"۔

قولہ تعالیٰ: قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق ۝ (الاعراف۔ آیت:۳۱)

"اے پیغمبر اہل کتاب سے کہدے کہ اللہ کی زینت کو کس نے حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہے؟ اور کس نے کھانے پینے کی ستھری چیزیں حرام کی ہیں؟"

آپ دیکھیں کہ یورپ کے حریت پسندوں نے جن ناروا کلیسائی قیود اور پابندیوں کے خلاف ساتویں صدی عیسوی میں آواز اٹھائی ان بندھنوں کے من گھڑت ہونے اور اس کے خلاف مہم چلانے کی ابتدا قرآن کریم نے بہت پہلے کر دی تھی۔ قرآن نے سائنس دانوں کو بار بار دعوت دی ہے کہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں فکر و تدبر کر کے اس پر ریسرچ کی جائے تاکہ کائنات کے منافع اور اس کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور حکمرانی کا مشاہدہ کیا جائے۔

قولہ تعالیٰ: ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا ۝ (آل عمران۔ آیت:۱۹۰)

"(اللہ کے بندے وہ ہیں) جو زمین و آسمان کی تخلیق (عجائب کائنات) میں

غور و خوض کرتے ہیں (اور مشاہدہ کے بعد اعلان کرتے ہیں) اے ہمارے
رب تو نے جس خوبی کے ساتھ کائنات کو وجود بخشا ہے یہ خود اس کی دلیل
ہے کہ یہ باطل طریقہ سے (بائی چانس) پیدا نہیں ہوئی"۔

قرآن کریم کائنات اور مادیات کے متعلق ریسرچ اور تحقیق کی دعوت تو دیتا ہے۔
البتہ قرآن اس کی تفصیلات نہیں بتاتا۔ کیونکہ مادیات عقل کے دائرہ کے اندر ہیں، اور
قرآن کریم جہاں کائنات کا ذکر کرتا ہے وہ بطور "مظاہر قدرت" کے کرتا ہے قرآن کریم
بلکہ وحی آسمانی کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے جہاں مادیات اور عقل کی رسائی نہیں ہو پاتی اس
طرح قرآن گویا اپنے پیروکاروں کو سائنس دان بننے کی دعوت دیتا ہے۔

یورپ کے اسکالر اور محققین اپنی اس تحقیق کا مدار جو وہ مادیت اور سائنسی مفروضوں
پر کرتے ہیں اگر اس کا ہزار واں حصہ قرآن کریم پر کر لیتے تو آج دنیا مادہ پرستی، شہوت پرستی
اور بے اطمینانی کی اس دلدل میں پھنسی ہوئی نہ ہوتی، خدا بیزاری، لادینی اور اخلاق باختگی جیسے
ننگ انسانیت نظریوں اور فلسفوں کی زنجیروں میں نہ جکڑی ہوتی، اور نہ ہی آسمانی دین کو خیرباد
کہنے سے پیدا شدہ خلاء کو پر کرنے کے لئے دین جمہوریت اپنانے کی ضرورت پیش آتی۔

جمہوریت ایک دین اور نظام حیات ہے

یہ امر وضاحت طلب ہے کہ بعض لوگوں کے خیال میں جمہوریت سے مراد ایک
خاص قسم کی حکومت ہے اور بس۔ حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ جمہوریت ایک مکمل دین اور نظام
زندگی ہے۔ ایک مخصوص عقیدہ اور ارکان اس کی بنیاد ہیں، اس عقیدہ سے پھوٹنے والے
احکامات زندگی کے ہر ایک شعبے پر حاوی ہیں۔

پروفیسر ڈوئی (Dewey) اپنی کتاب "اخلاق جمہوریت" (Etics Of Democracy)
میں بعض لوگوں کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ کہنا کہ جمہوریت صرف

ایک خاص طرز کی حکومت ہے بالکل اسی طرح جیسے یہ کہا جائے کہ مکان صرف اینٹوں کا مجموعہ ہے یا گرجا ایک ایسی عمارت کا نام ہے جو کلس اور ممبر پر مشتمل ہو"۔

(بحوالہ انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام۔ ص:۹۵)

علامہ حافظ ابو صالح جمہوری نظام معیشت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ جمہوریت میں "سعادت سے مراد یہ ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ جسمانی لذائذ و لذات کو حاصل کرے اور یہ چیز فرد کے لئے اس وقت تک ممکن الحصول نہیں ہو سکتی جب تک اس کو زیادہ سے زیادہ عمومی نوعیت کی آزادیاں نہ مل جائیں، اور جب تک ان کی حفاظت نہ کی جائے تاکہ اس طرح انسان اپنی حیات کی تنظیم کر سکے، اپنے سرمایہ کو بڑھا سکے اور اپنی بھوک کو تسکین و تشفی دے سکے اس سے معلوم ہوا کہ جمہوریت ایک ہمہ گیر نظریۂ حیات ہے"۔

(جمہوریت اسلام کے آئینے میں۔ ص:۲۹)

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ دینِ جمہوریت دینِ کلیسا کے خلاء کو پُر کرنے کے لئے وجود میں لایا گیا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جمہوریت ایک مکمل ضابطۂ حیات اور دین ہے صرف طرز حکومت تک محدود نہیں ہے۔

علامہ عبدالحمید صدیقی لکھتے ہیں:

"جمہوریت کا رفیع الشان قصر جس بنیاد پر اٹھایا گیا وہ یہ ہے کہ مملکتی اقتدار کا اصل منبع مشیت عامہ (General Will) ہے، جو کثرت رائے سے متعین ہوتی ہے یہ مشیت عامہ سیاہ و سفید کی مالک اور بداخلاقی کو اخلاق اور ناحق کو حق قرار دینے کی پورے طور پر مجاز ہے۔

(انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام۔ ص:۵۹)

جمہوریت جس بنیاد پر قائم ہے وہ "حریت عامہ (عمومی آزادی) ہے۔ اسی حریت عامہ نے کہیں سرمایہ دارانہ نظام کی صورت اختیار کر لی ہے، جو ملکیت کی آزادی کا نتیجہ ہے، اور کہیں اشتراکی نظام کی شکل اختیار کر لی ہے جو عقیدے کی آزادی اور اکثریت کے فیصلے کا

نتیجہ ہے، تو جیسا کہ سرمایہ دارانہ نظام یا اشتراکی نظام ایک مکمل دین اور نظام حیات ہے، بالکل ویسے ہی یہ کہنا درست ہے کہ جمہوریت ایک مکمل دین اور نظام حیات ہے، اور جو لوگ جمہوریت کو اسلامی نظام ثابت کرنے کی لاحاصل کوشش کرتے ہیں ان کے نزدیک تو بات واضح ہے اس لئے کہ جب دین اسلام ایک مکمل دین اور ضابطۂ حیات ہے تو جمہوریت بھی ایک مکمل دین اور ضابطۂ حیات ہو الہٰذا یہ بات صحیح نہیں ہے کہ جمہوریت صرف ایک طرز حکومت کا نام ہے۔

نظریوں کی قدر و قیمت کے لئے معیار اور کسوٹی

چیزوں کی قدر و قیمت کی بین الاقوامی متفقہ کسوٹی، دو باتیں ہیں۔

۱۔ وہ چیز (نظریہ وغیرہ) کسی حقیقت اور صداقت پر مبنی ہو۔

۲۔ وہ حقیقت (جو اساس اور بنیاد ہے) قیمتی اور محترم بھی ہو۔ آگے چل کر اس محترم حقیقت پر مبنی نظریات اور اس سے نکلنے والی کلیاں اور شاخیں لامحالہ قیمتی ہونگی۔ اور اگر کوئی عقیدہ وغیرہ کسی بے قدر و قیمت حقیقت پر مبنی ہو تو وہ عقیدہ بھی بے قدر و قیمت ہوگا۔ اور اگر کوئی نظریہ سرے سے کسی حقیقت اور صداقت پر مبنی ہی نہ ہو، تو وہ صرف بے قدر و قیمت ہی نہیں بلکہ بے بنیاد اور بے اصل بھی ہوگا۔ نیز اگر کوئی نظریہ حقیقت اور صداقت کے خلاف جھوٹ اور فریب کی بنیاد پر مبنی ہو تو اسے جھوٹ اور باطل کہا جائے گا۔

اس تفصیل کی وضاحت کے لئے ایک سادہ مثال لیجئے۔ سورج نکلا ہوا ہے دن ہے اب یہاں دو حقیقتیں ہیں ایک یہ کہ دن ہے دوسری یہ کہ رات نہیں ہے۔

اب جو شخص عقیدہ رکھتا ہے کہ "دن ہے" یا یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ "رات نہیں ہے" تو یہ دونوں نظریئے اور عقیدے حقیقت اور صداقت پر مبنی ہیں۔ اور اگر کوئی عقیدہ رکھتا ہے کہ "دن نہیں ہے" یا یہ کہ "رات ہے" تو یہ عقیدہ اور نظریہ باطل اور جھوٹ ہے اور تیسرا

شخص وہ ہے جو کہتا ہے کہ مجھے کوئی علم نہیں کہ دن ہے یا رات ہے جو کوئی رات ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے یا دن ہونے کا وہ بے شک رکھے۔ میں نہ تو کسی کی تصدیق کرتا ہوں اور نہ تردید مجھے حقیقت کا علم نہیں ہے۔

ایسے نظریئے کو "لاادری" اور "لاعلمی" کا نظریہ اور عقیدہ کہا جاتا ہے۔ ان نظریوں اور عقیدوں میں ظاہر ہے کہ سب سے بدتر اور بے کار نظریہ "لاادری" کا ہے کیونکہ اس نظریئے کا حامل شخص بے کار اور بے ہمت ہوتا ہے کسی حقیقت تک پہنچنے کے لئے سرے سے جدوجہد ہی نہیں کرتا اور اس کی روش ہمیشہ منافقانہ اور دورنگی ہوتی ہے۔ ایسے شخص میں کوئی ثابت قدمی اور استقلال نہیں ہوتا بلکہ ہوا کے رخ کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

علامہ شیرازی نے کیا خوب کہا ہے ؎

معشوق ما بشیوهٔ مغرب برابر است
با ما شراب خورد و با زاہد نماز کرد

وہی بات ہوئی کہ

؎ با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام

"حقیقت کل" کے متعلق جمہوریت "لاادری" کے راستے پر

جملہ کائنات کے مبدأ یا حقیقت کل یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے متعلق بانیان جمہوریت نے کسی حقیقت تک پہنچنے کا دشوار گذار راستہ چھوڑ کر آسان تر راستہ اختیار کرلیا ہے اور وہ ہے عقیدہ "لاادری" مجھے معلوم نہیں، میں نہیں جانتا۔

اس بات کی واضح دلیل عقیدے کی آزادی ہے چونکہ جمہوریت کا ایک رکن عقیدے کی آزادی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اس کی نازل کردہ کتابیں، اس کے بھیجے ہوئے انبیاء علیہم السلام، حشر و نشر، جنت و دوزخ، جزا اور سزا، حلال

وحرام، جائز وناجائز جیسے بنیادی عقائد پر پختہ عقیدہ رکھنے والے صحیح مسلمان اور کٹر مذہبی جس کو یورپ بنیاد پرست کہتا ہے اگر ایسے عقیدے کا حامل انسان دین جمہوریت کی طرف متوجہ ہو تو جمہوریت اس کے لئے باہیں پھیلا کر اس کو اپنی آغوش میں لیتی ہے، اگر عین اسی وقت مذکورہ عقائد کا منکر کٹر دہری دین جمہوریت کی آغوش میں آنا چاہے تو جمہوریت ایسے آدمی کو بھی بہ دل وجان اپناتی ہے اس طرح بہ یک وقت دو متضاد نظریے رکھنے والوں کو جمہوریت دعوت دیتی کہ آؤ تم دونوں میرے مخلص بندے ہو اور میں تمہارا ابے ہمتا مشکل کشا ہوں، دونوں کے نظریات اور عقیدے میرے نزدیک حق بجانب ہیں۔ میں (یعنی جمہوریت) کسی ایک کے عقیدے اور نظریے کو نہ تو غلط کہہ سکتی ہوں اور نہ اسے رد کرتی ہوں۔

یہ جمہوریت کا وہ بنیادی اصول ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس تفصیل کے بعد اس دعوے کو ماننا پڑے گا کہ جمہوریت کی اساس عقیدہ ''لاادری'' ہے۔

اور اگر کوئی کہتا ہے کہ جمہوریت کے نظریے کی اساس ''حقیقت کل'' کے بارے میں کسی ٹھوس صداقت پر بنی ہے۔ تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ جمہوریت اپنے پیروکاروں اور اپنے چیلوں کے ساتھ منافقت اور دورنگی سے پیش آتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمہوریت کی اساس اور عقیدہ ''لاادری'' ہے۔ لہٰذا جمہوریت بے بنیاد اور بے اصل نظریہ ہے۔ لہٰذا بین الاقوامی معیار پر تولنے کے بعد ثابت ہوا کہ نظریہ جمہوریت ایک بے قدر و قیمت نظریہ ہے۔ (قل هل عندكم من سلطان)

دو متضاد چیزوں کا بہ یک وقت جمع ہونا محال ہے

پوری انسانیت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ دو چیزیں جب ایک دوسرے کی مکمل ضد ہوں تو ان کا بیک وقت ایک جگہ جمع ہونا محال اور باطل ہے۔ بلکہ ایسی دو متضاد چیزوں میں سے اگر کسی جگہ ایک موجود ہوگی تو دوسری لامحالہ منفی ہوگی۔ مثلاً ہر عدد ''جفت'' ہوگا یا ''طاق''، ''جفت''

کا مطلب ہے وہ عدد جو دو پر پورا پورا تقسیم ہو سکے مثال کے طور پر "چار" کا عدد جفت ہے۔ "طاق" وہ عدد ہوتا ہے جو دو پر پورا پورا تقسیم نہ ہو سکے مثال کے طور پر "تین" کا عدد طاق ہے۔

پس معلوم ہوا کہ "جفت" اور "طاق" ایک دوسرے کی ضد ہیں لہٰذا ان دونوں کا بیک وقت ایک عدد کے اندر جمع ہونا محال ہے یعنی یہ ناممکن ہے۔ کہ ایک عدد ایک وقت میں جفت بھی ہو اور طاق بھی ہو۔

نیز یہ بھی منطقی طور پر تسلیم شدہ حقیقت ہے، کہ جس چیز سے یا جس بات اور نظریئے سے دو متضاد چیزوں کا بیک وقت جمع ہونا لازم آئے وہ نظریہ اور وہ بات خود باطل اور محال ہے۔ یہ دونوں باتیں اہل علم کے نزدیک ایسی مسلمہ حقائق ہیں کہ اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

جمہوریت متضاد نظریوں کا مجموعہ ہے

جمہوریت کے بنیادی عنصر یعنی "حریت عامہ" نے اس کے اندر اعتقادی اور عملی طور پر متضاد اور ایک دوسرے کے مخالف عقیدوں اور نظریوں کو بیک وقت جمع کر دیا ہے۔ اس طرح نظریۂ جمہوریت ایک باطل اور محال بات کو مستلزم ہے جو "جمع بین الضدین" ہے یعنی دو متضاد چیزوں کا جمع ہونا اس لئے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جمہوریت کا نظریہ خود باطل ہے۔

کچھ دیر کے لئے جمہوریت کا تصور چھوڑ کر دوسرے نظاموں اور نظریوں کا مطالعہ کیجئے کہ کسی اور نظام میں بھی دین جمہوریت کی طرح کے تضادات ہیں۔ مارکس ازم کو لیجئے کیا وہاں کسی سچے مومن کے لئے گنجائش ہے؟ کیا کسی مسلمان کو کمیونسٹ نظریئے کا ممبر اور وفادار رکن تسلیم کیا جاتا ہے؟ کیا کسی غیر کمیونسٹ کو کسی اہم عہدے اور منصب پر فائز کیا جاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔

کیا یہودیت میں یہ گنجائش ہے، کہ یہودیت کے خلاف عقیدہ رکھنے والوں کو یہودیت کا ممبر اور یہودی برادری کا رکن سمجھا جائے؟ کیا عیسائیت یا اسلام میں یہ گنجائش ہے کہ مذکورہ ادیان کے مسلمہ عقائد کے خلاف کوئی شخص عقیدہ بھی رکھے اور پھر بھی عیسائیت یا اسلام کا باقاعدہ ممبر رہ سکے۔ یعنی اسے عیسائی بھائی یا مسلمان بھائی سمجھا جائے؟ ہرگز نہیں۔

یہ اس لئے کہ ان ادیان اور نظریوں کی بنیاد اور اساس ایک ٹھوس عقیدہ ہے۔ (خواہ وہ صحیح ہو یا غلط) لہٰذا اس بنیادی عقیدہ کے خلاف عقیدہ رکھنے والے کے لئے اس دین میں ایک ممبر کی حیثیت سے شریک ہونے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

جمہوریت کی اساس اور بنیاد کوئی بھی ٹھوس حقیقت نہیں ہے، بلکہ وہ لاادریت کے چوراہے پر کھڑی ہے، اسی لئے وہ متضاد نظریات کا مجموعہ ہے لہٰذا دین جمہوریت عقلی لحاظ سے ناقابل قبول اور باطل نظام حیات ہے۔

دین جمہوریت کا ایمان مفصل

دین جمہوریت کے بنیادی ارکان جنہیں اصول کا درجہ حاصل ہے، چار ہیں۔

۱۔ عقیدے کی آزادی

۲۔ رائے کی آزادی

۳۔ ملکیت کی آزادی

۴۔ شخصی یا انفرادی آزادی

ان اصولوں سے خود بخود مساوات، عدلیہ کی آزادی، تقریر و تحریر کی آزادی وغیرہ کئی جزئیات نکل آتے ہیں، ان آزادیوں کو حریت عامہ یا عمومی آزادی (General Will) اور بنیادی حقوق جیسے نام دیئے جاتے ہیں۔

دین جمہوریت کا رکن اول "عقیدے کی آزادی"

عقیدے کی آزادی سے مراد یہ ہے کہ ہر فرد کو آزادی حاصل ہے، کہ وہ جیسا عقیدہ چاہے رکھے کسی شخص یا اتھارٹی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس شخص کو کوئی خاص عقیدہ کے اختیار کرنے یا ترک کرنے پر مجبور کرے۔ ہر فرد کو مکمل اختیار ہے اور اس کی مرضی ہے کہ صبح کو عیسائیت کا عقیدہ اختیار کرے اور شام کو اس کا انکار کر دے۔

چنانچہ ہر ایک کو اختیار ہے کہ آج وہ یہودیت کا پیروکار بنے تو کل اسلام کو اپنا دین بنا لے یا اگر وہ مسلمان ہو کر ہندو، سکھ، عیسائی، یا مرزائی بننا چاہتا ہے تو بے شک بن سکتا ہے۔ اسی طرح وہ کسی دین اور مذہب کی بعض باتوں اور تعلیمات سے انکار کرتا ہے، تو بخوشی کرے نیز اگر اس شخص کے اقوال، اعمال اور عبادات اللہ تعالیٰ کے احکامات اور پیغمبر خدا کی ہدایات کے صریح منافی ہوں، تو بھی کوئی اس پر نہ تو گرفت کر سکتا ہے اور نہ اعتراض کیونکہ یہ از روئے جمہوریت اس کا بنیادی حق ہے۔

(۱) قرآن مجید نے منافقت کی اس روش کو منافقین کے سرخیلوں کی تعلیم قرار دیا ہے ارشاد ربانی ہے:

وقالت طائفة من اھل الکتاب آمنوا بالذی انزل علی الذین آمنوا وجه النھار واکفروا آخره لعلھم یرجعون ○

(آل عمران۔ آیت: ۷۲)

"اور کہا بعض اہل کتاب نے مان لو جو کچھ اترا مسلمانوں پر دن چڑھے اور منکر ہو جاؤ آخر دن میں شاید وہ پھر جائیں"۔

البتہ یہ عقیدے کی آزادی دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ ایک یہ کہ اپنے قول وعمل کے ذریعے کسی دوسرے شخص کے عقائد کو برا بھلا نہ کہے۔ دوسری شرط یہ کہ اس

شخص کا یہ عقیدہ وہاں کے ان عوامی قوانین کے خلاف نہ ہو جو کہ عوام نے اکثریت کے بل بوتے پر بنالئے ہیں۔

انتباہ :

دین جمہوریت کی اس پوشیدہ شیطانیت اور کفر کو دیکھئے کہ خدا تعالیٰ اور پیغمبر خدا کے قوانین کے خلاف عقیدہ رکھنے اور عمل کرنے کی تو ہر کسی کو اجازت ہے، مگر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے خلاف کسی کو عقیدہ رکھنے یعنی عمل کرنے کی قطعاً اجازت نہیں، اس کا صاف مطلب یہ نکلتا ہے کہ دین جمہوریت میں الوہیت کا مقام عوامی اکثریت کو حاصل ہے۔ (العیاذ باللہ)

دین جمہوریت کا رکن دوم "آزادی رائے"

آزادی رائے کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ میں اٹھنے والے احساسات و جذبات کا جن الفاظ و معانی اور جس اسلوب میں چاہے اظہار کرے خواہ وہ بذریعۂ تحریر ہو یا بذریعۂ تقریر، وہ سنجیدہ ہو یا اس میں مزاح کا عنصر پایا جاتا ہو۔ وہ اس پر یقین رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو پھر اس کا تعلق حکومت کے ساتھ ہو یا اقتصادیات، عمرانیات اور دین، مذہب کے ساتھ۔ فرد جس کسی کی بھی رائے کے ساتھ مذاق کرنا چاہے یا اس کو احمقانہ قرار دے تو اسے اس بات کی مکمل آزادی ہے۔

اس آزادیٔ رائے کے نتیجے میں ہر طرف پروپیگنڈا، بہتان تراشی، عیب جوئی، غیبت اور تحقیر و تذلیل کا بازار گرم رہتا ہے۔ شریف انسان کی عزت و وقار محفوظ نہیں۔ اس لئے کہ نہ خوف خدا ہے نہ قانون کی گرفت۔ عام انسان تو کیا، اللہ تعالیٰ، اس کے رسولوں اور مقدس کتابوں تک کو معاف نہیں کیا جاتا۔ بطور مثال "شیطانی آیات" کو ہی لے لیجئے۔

سلمان رشدی شاتم رسول ﷺ کی کتاب "شیطانی آیات"

آزادیٔ رائے کے اسی حق کے بل بوتے پر جمہوریت کے گڑھ برطانیہ میں سلمان رشدی جیسے گستاخ رسول ﷺ کو نہ صرف کتاب کی اشاعت کی اجازت ملی بلکہ اس کی ہمت افزائی بھی کی گئی۔ اس کے تحفظ کے لئے ہمہ وقت سرکاری پولیس کی گارڈ متعین کردی گئی۔ اس کے لئے کئے جانے والے حفاظتی اقدامات پر ماہوار لاکھوں ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی طور پر مذکورہ کتاب پر پابندی لگانے اور رشدی کو قرار واقعی سزا دلوانے کے لئے امت مسلمہ سراپا احتجاج بن گئی۔ مظاہرے شروع ہوئے، جن میں شمع نبوت کے بیسیوں پروانے شہید ہوئے مگر برطانیہ نے بڑی ڈھٹائی سے دین جمہوریت کے بنیادی رکن آزادی رائے کو بہانہ بنا کر امت مسلمہ کے اس اجماعی مطالبہ کو رد کیا اور پورے یورپ نے نہ صرف برطانیہ کی ہاں میں ہاں ملائی بلکہ "شیطانی آیات" نامی کتاب کو اپنے ہاں چھپوانے اور شائع کرنے کی پیش کش کی اور یورپ کے سربراہان حکومت بشمول امریکہ کے صدر بش نے ان مسلمان لیڈروں کو اعلانیہ دھمکی دی، جنہوں نے مرتد رشدی کے خلاف اسلامی فتویٰ شائع کیا۔ اس طرح تمام یورپی ممالک یک زبان ہو کر دین جمہوریت کے ایک اہم رکن اور اپنے ایمان کو بچانے کے لئے میدان میں اتر آئے، انہوں نے نہ تو ایک ارب کلمہ گو مسلمانوں کے جذبات کا احترام کیا، نہ سیاسی مصلحتوں کو دیکھا اور نہ مسلمان ممالک کے ساتھ تعلقات کی پرواکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوریت کی جیت ہوئی اس لئے کہ بشمول اسلامی ممالک تمام جمہوری ممالک کے دستور سازوں کے ایمان کا اور اقوام متحدہ کے منشور کا یہ بنیادی جز ہے کہ "رائے کی آزادی" ہر کسی کا بنیادی حق ہے۔

کاش کہ اس مرحلہ پر مسلمانوں کی حمیت اسلامی جوش میں آتی اور وہ ایسی جمہوریت پر تین حرف بھیجتے جس کے بنیادی ارکان کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اور محمد ﷺ کو تحقیر و تذلیل

کا ہدف بنایا جاسکتا ہو مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا۔

اسی آزادیٔ رائے کے تحت پریس، جملہ نشریاتی اداروں، آزادانہ انتخابات، اور آزاد عدالتوں وغیرہ کی نام نہاد آزادیاں بھی آتی ہیں۔

دین جمہوریت کا رکن سوم ''آزادی ملکیت''

آزادیٔ ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد کو آزادی ہے، کہ وہ جو کچھ اپنی ملکیت میں لانا چاہے (خواہ از روئے اسلام قطعی حرام ہو) جتنی مقدار میں چاہے، جس طریقے سے چاہے، لا سکتا ہے۔ نیز ہر فرد کو اپنے اموال سے اپنی پسند کے مطابق تصرف کرنے کی بھی اجازت ہے۔ خواہ وہ اپنے اموال کو ضائع کرے یا کسی بے راہ روی پہ خرچ کرے نیز وہ دولت وجائداد کو جس حد تک بڑھا سکے اس پر کوئی پابندی نہیں۔

اس آزادیٔ ملکیت کے نتیجہ میں آج انسان ہر وہ حربہ اپنانے میں فخر محسوس کرتا ہے جس کے نتیجہ میں دولت حاصل ہو۔ رقص و سرور، ننگی تصویریں، ویڈیو فلمیں، قحبہ خانے (زناکاری کے اڈے)، ربوٰ (سود)، نشہ آور چیزوں کا دھندا، بلیک مارکیٹنگ، ملاوٹ، عصمت فروشی اور مصنوعی گرانی وغیرہ یہ سب بداخلاقیاں اس لئے ہیں کہ دین جمہوریت کا فلسفۂ حیات مادی ترقی، عیش و عشرت اور خواہشات نفس کی تکمیل کے سوا اور کچھ نہیں۔

آزادی ملکیت کے پجاریوں کا بڑا مفاد انسانیت کی مجبوری سے وابستہ رہتا ہے، اس طرح وہ من مانے دام وصول کرتے ہیں۔ جس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

چالیس لاکھ بوری ''کافی'' ضائع کرنا

مشہور مصنف جان گنتھر (Gunther) سرمایہ داروں کی ان اخلاق سوز حرکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"۱۹۱۴ء میں برازیل کے ارباب ثروت (سرمایہ داروں) کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ پیداشدہ کافی (Coffee) کو کس طرح کم کیا جائے۔ پہلے انہوں نے اس کو دفن کرنے کا عزم کیا مگر مصیبت یہ تھی کہ ۴۰ لاکھ بوریوں کو دبانے کے لئے کافی رقبۂ زمین درکار تھی۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسے سمندر میں پھینک دیا جائے مگر یہ تدبیر نہ چلی کیونکہ اس سے بیشمار مچھلیوں کے تباہ ہونے کا خطرہ تھا۔ چونکہ اس پودے میں پانی کی زیادہ مقدار موجود ہوتی ہے اس لئے اس کو جلانا بھی آسان نہ تھا آخر کار مٹی کا تیل ڈال کر اس کو جلایا گیا۔ اس طرح برازیل کو ہر سال اس زائد پیداوار سے نجات حاصل کرنے کے لئے تقریباً دو لاکھ پونڈ کی مالیت کا تیل صرف کرنا پڑا"۔ (In Side Latin America)

پھل ضائع کرانا :

ایک اور مصنف سرمایہ داروں کی خود غرضی کے متعلق لکھتا ہے کہ:

"۱۹۳۴ء میں لیورپول کی بندرگاہ سے دس لاکھ سنگتروں کو سمندر کی موجوں کی نذر کر دیا گیا تاکہ رسد بڑھنے نہ پائے اور اس طرح قیمتوں میں کوئی کمی واقع نہ ہو۔ انہی سنگتروں کے لئے لورپول کے بچے ترس رہے تھے اور ان کے لئے یہ ایک نایاب جنس تھی"۔

(بحوالہ انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام)

جمہوریت پرستوں کا اعتراف

آزادی ملکیت کے تحت جس طرح کمانے پر کوئی اخلاقی بندش نہیں اسی طرح خرچ کرنے، اسراف اور تبذیر پر بھی کوئی بندش نہیں ہوتی خواہ غریب مرتے رہیں۔

۳۹ ویں ملکہ برطانیہ الزبتھ کی تاج پوشی

برطانیہ کی ملکہ کی تاج پوشی کی محفل میں چونتیس کروڑ روپے کی شراب صرف

ہوئی۔ (روزنامہ امروز۔ ۳ جون ۱۹۵۳ء)

امریکہ میں کتوں کے کمبلوں اور تفریح پر سالانہ باون لاکھ ڈالر کی رقم خرچ ہوتی ہے۔ (نقاد لاہور۔ جولائی ۱۹۵۳ء)

اس رقم کا تخمینہ پاکستانی روپے میں تقریباً نواب نو کروڑ روپے بنتے ہیں۔

۱۹۵۸ء میں سرکاری رپورٹ کے مطابق یورپی دنیا صرف قانونی جوابازی پر ہر سال تیس ارب ڈالر کی رقم خرچ کرتی ہے۔ (کوہستان۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۵۸ء)

سگریٹ :

یورپ کے سرمایہ دارانہ جمہوریت کی صف اول کی مملکتوں میں سگریٹ نوشی پر خرچ ہونے والی رقم اگر دنیا بھر کے غریبوں میں تقسیم کی جائے تو کوئی بھی بھوکا اور ننگا نہ رہے گا۔ (روزنامہ انجام۔ ۱۰ فروری ۱۹۵۵ء)

اسی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں سالانہ ۴ کھرب ۳۲ ارب سگریٹ، جاپان میں ۹ ارب، برطانیہ میں ایک کھرب گیارہ ارب، فرانس میں ۳۶ ارب، مغربی جرمنی اور اٹلی میں ۳۶ ارب، میکسیکو میں ۲۷ ارب ۸۰ کروڑ، کینیڈا میں ۲۱ ارب، جنوبی کوریا میں ۱۴ ارب ۳۰ کروڑ اور فلپائن میں ۱۳ ارب ۳۰ کروڑ روپے کے سگریٹ پیے جاتے ہیں۔ یہ تو ۲۷ سال پہلے کی حالت ہے آج تو یہ مقدار چار گنا بڑھ چکی ہو گی اس طرح سالانہ کھربوں روپے دھوئیں کی نذر کر دیئے جاتے ہیں۔

روزنامہ جنگ لاہور ۱۱ اپریل ۱۹۸۹ء کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ایک گھنٹے کے اندر ۲ لاکھ ۶۰ ہزار روپے کے سگریٹ پیے جاتے ہیں۔

جنگ لندن ۱۲ جون ۱۹۸۹ء کی ایک رپورٹ کے مطابق سابق وزیراعظم پاکستان بے نظیر بھٹو، بے نظیر سوسائٹی کے سالانہ ڈنر پر مدعو تھیں اخباری اطلاع کے مطابق "یہ ڈنر

فی پلیٹ ایک ہزار ڈالر کا تھا اور اس میں ایک ہزار سے زیادہ شرکاء تھے۔

سود کے جواز کا اعلان

پاکستان میں سابق وزیراعظم محمد نواز شریف کے دور حکومت میں وفاقی وزیر برائے اقتصادی امور سردار آصف احمد علی نے ایک اخباری کانفرنس میں بہ بانگ دہل اعلان کیا کہ "سود جائز ہے" اور وجہ یہ بیان کی کہ "اگر سود کو ختم کر دیا جائے، تو پاکستان کے پورے مالیاتی نظام کی بنیادیں ہل جائیں گی"۔ (روزنامہ پاکستان لاہور۔ ۱۶ جنوری ۱۹۹۲ء)

اس پر ملک بھر کے علماء کی طرف سے کفر اور ارتداد کے فتوے لگے تو کچھ دنوں کے بعد حکومتی اتحادی ایم این اے اور نیشنل عوامی پارٹی کے صدر اجمل خٹک نے اخباری بیان میں فرمایا کہ "سود حرام ہے لیکن معاشی ڈھانچہ کو برقرار رکھنے کے لئے اجتہاد کرنے کی ضرورت ہے"۔ (جنگ لاہور۔ ۸ مارچ ۱۹۹۲ء)

دین جمہوریت کا رکن چہارم "شخصی آزادی"

شخصی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کے اعتبار سے دوسروں کے ساتھ معاملات طے کرنے میں جو چاہے اور جہاں تک چاہے بغیر کسی جبر و اکراہ، بہ رضا و رغبت اپنے ارادے کو بروئے کار لائے اور اسے عملی جامہ پہنائے۔ اسے حق حاصل ہے کہ وہ ہر قسم کی تفریح، لہو ولعب اور کھیل کود میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ زنا، بدکاری، جسم فروشی، لواطت، مرد کا مرد سے نکاح، انسان کا حیوان سے نکاح، فاعل بننا، یا مفعول بننا سب کچھ شخصی آزادی کے تحت جائز ہے۔

شخصی آزادی کو فرائڈ کے فلسفۂ جنسیت نے سند مہیا کی :

"فرائڈ" کے حیاسوز اور عریاں، فلسفۂ جنسیات کو وہ قبولیت حاصل ہوئی کہ نہ صرف یورپ کی یونیورسٹیوں میں بلکہ پورے ایشیا بشمول مسلم جمہوری ممالک کی یونیورسٹیوں میں اس کو نفسیات کا ایک لازمی جز قرار دیا گیا ہے۔

فرائڈ کہتا ہے کہ انسان کے اندر "لاشعور میں" شہوت رانی کے جذبے کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ خواہشات اور شہوت پرستی کی ابلتی ہوئی جنسی دیگ ہے۔ اس کے اندر کوئی منظم اور کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہیں، صرف جنسی خواہش پورا کرنے کا جذبہ موجزن ہے۔ اس فطری مطالبے کو مذہب اور معاشرے کے ڈھکوسلوں سے روکنے کے نتیجہ میں انسان بے چینی و بے قراری میں مبتلا ہوتا ہے، اس کا دماغی توازن بگڑنے لگتا ہے اکثر اوقات وہ پریشانی، ہسٹریا، جنون اور دماغی امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے، حالانکہ جنسی خواہش پورا کرنا ایسا ہے جیسا پیاس بجھانے کے لئے پانی کا ایک گلاس پی لینا خواہ وہ کہیں سے مل جائے۔ فرائڈ اس پر مزید ایسے ننگ انسانیت اور احمقانہ دعوے اور دلائل پیش کرتا ہے۔ کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، مثلاً وہ کہتا ہے کہ شیر خوار بچہ ماں سے اور بچی باپ سے جو زیادہ محبت کرتی ہے وہ اسی مخفی شہوت رانی کے جذبے کے تحت ہوتا ہے۔ یا بچے کا پاخانہ کرنے اور دودھ پیتے وقت ماں کا پستان چوسنے میں بھی یہی جنسی جذبہ کارفرما ہوتا ہے (العیاذ باللہ)

کتنے احمقانہ دلائل ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی انسان حیوانات یا پرندوں کی مشفقانہ پرورش کرتا ہے، تو وہ حیوان مثلاً کتا یا تیتر وغیرہ اسی محسن کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے اگر یہ جذبۂ جنسیت کے تحت نہیں بلکہ پرورش اور شفقت کا نتیجہ ہے، تو پھر اولاد کی محبت کی بھی یہی اساس ہے۔ رہی یہ بات کہ بچی باپ اور بچہ ماں سے زیادہ محبت کرتا ہے، تو یہ مشاہدہ کے خلاف اور ناقابل تسلیم دعویٰ ہے۔ (فرائڈ کا فلسفۂ جنسیت اور ڈاکٹر رفیع الدین کی تالیف قرآن اور علم جدید۔ ص: ۲۰)

ڈارون کے فلسفہ "ارتقاء" نے رہی سہی کسر پوری کردی :

فرائڈ کے فلسفۂ جنسیت کو ڈارون کے فلسفۂ ارتقاء نے مزید تقویت پہنچادی جس کا لب لباب یہ ہے کہ "انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے"۔

جب حیوان پر شہوت رانی کے سلسلہ میں کوئی قید وبند نہیں تو انسان پر اسی حیوانی جذبے کے بارے میں کیوں کر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ بلکہ انسان کو بھی جس سے بھی جفتی کرنے کا موقعہ میسر آئے کرنی چاہئے۔

ان جیسے فحش فلسفوں نے مذکورہ شخصی آزادی کو گویا کہ ایک منطقی اور سائنٹیفک سند مہیا کرکے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

یورپ میں لواطت کا قانون :

چنانچہ شخصی آزادی کے نتیجہ کے طور پر ۱۴ جولائی ۱۹۶۷ء کو انگلینڈ کے ہاؤس آف کامنز (دارالعوام) نے ۱۴ مخالف اور ۶۹ موافق ووٹوں کی اکثریت سے تالیوں کی گونج میں اور پرجوش خیر مقدم کے ساتھ یہ بل منظور کرلیا کہ بالغ مرد باہمی رضامندی سے جنسی تلذذ حاصل کرسکتے ہیں اور قانون کو اس پر اعتراض کا کوئی حق نہیں۔

بل کی منظوری کے وقت ہاؤس کی گیلریاں لوگوں سے کھچاکھچ بھری ہوئی تھیں۔ اس کے بعد اس بل نے ہاؤس آف لارڈز (دارالامراء) سے گذر کر ملکہ عالیہ کے دستخط سے قانون کی شکل اختیار کرلی۔ (اسلام اور عصر حاضر۔ ۵۱)

امریکہ کے سپریم کورٹ کے جج نے دو لاکھ ننگی اور گندی تصویروں کو دیکھ کر کہا کہ نیویارک "سدوم" اور "عموریا" بنتا جارہا ہے۔ (یہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی ان بستیوں کے نام ہیں جو بچہ بازی کی پاداش میں تباہ ہوئے)۔ (صدق جدید۔ ۳ دسمبر ۱۹۵۴ء)

"اغلام بازی (بچہ بازی) تہذیب فرنگ کا جز بن گیا ہے"۔

(لندن ٹائمز۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۵ء)

برطانیہ میں مادرزاد ننگوں کی تعداد پانچ لاکھ ہے۔ (نوائے وقت۔ ۲۲ مئی ۱۹۵۳ء)

انگلستان میں کلیسا، گرجے، پارلیمنٹ اور سب شعبوں میں لواطت عام ہے۔

(رسالہ صدق جدید۔ ۶ جنوری ۱۹۵۶ء)

صحبت ہم جنس (Homosex uality) جس کا رواج زیادہ تر مردوں میں تھا اب عورتوں میں عام ہو رہا ہے۔ (انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام۔ ص: ۳۰۸)

مرد کا مرد سے اور عورت کا عورت سے نکاح :

کوپن ہیگن (اف پ) ڈنمارک میں اب مرد، مردوں اور عورت، عورتوں سے شادیاں کر سکیں گی۔ اس بارے میں قانون نافذ ہو گیا ہے۔ یہ شادیاں گرجا گھروں میں نہیں ہو سکیں گی، لیکن اس کے علاوہ ہر طرح سے قانونی ہوں گی وراثت، ٹیکس، طلاق وغیرہ کے تمام قوانین کا اطلاق ان پر ہو گا البتہ انہیں کسی کو متبنّٰی (منہ بولے بیٹا) بنانے یا مصنوعی طریقے سے بچہ پیدا کرنے کا حق نہیں ہو گا۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ دنیا کے دوسرے حصوں سے بھی ایسے جوڑے شادی کرنے ڈنمارک نہ آجائیں یہ شرط بھی لگائی گئی ہے کہ جوڑے میں سے ایک ڈنمارک کا شہری ہو۔ قانون کے نفاذ کے پہلے دن کوپن ہیگن کے میئر نے ایک درجن ایسے جوڑوں کی شادی کرائی ان میں ایک پادری اور ایک ماہر نفسیات کا جوڑا بھی شامل تھا۔ (اخبار جنگ۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۹ء ص: ۲ کالم ۲)

ہیجڑوں سے نکاح :

پاکستان بھی ایک جمہوری ملک ہے اور چشم بد دور عوام بڑی تیزی سے یورپ کے

دوش بدوش کھڑا ہونے کے لئے کوشاں ہیں۔

جنگ لاہور ۱۱ مارچ ۱۹۹۲ء صفحہ ۸ کالم ۴ کی خبر ہے کہ:

"ضلع فیصل آباد میں مختلف مقامات پر ۳۰۰ نوجوانوں نے ہیجڑوں سے شادی کر لی۔ شادی کی باقاعدہ رسومات ادا کی جاتی ہیں، نکاح ہیجڑوں کا گرو پڑھاتا ہے، مگر یہ صرف زبانی کلامی ہوتا ہے۔ اخبار نے مزید لکھا ہے کہ دولہا ہزاروں روپے کے زیورات پہناتا ہے۔

مرد کا کتیا سے نکاح :

"یہ دو نسلوں کے درمیان بہترین رابطہ ہے"۔

یورپ کے متمدن اور ترقی یافتہ معاشرے کے انیس سالہ نوجوان نے اپنی کتیا سے شادی رچالی۔ دولہا کا نام "مارک شیڈ" اور دلہن جو اعلیٰ نسل کی کتیا ہے، کا نام "ہیکسی" ہے شادی کے دن مارک شیڈ سیاہ رنگ کے سوٹ میں ملبوس اونچا ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔ جب کہ اس نے اپنی "زوجہ" کے گلے میں سفید رنگ کی پٹی ڈال رکھی تھی شادی کی تقریب مقامی شادی ہال میں ہوئی جس میں ۶۰ مہمانوں نے شرکت کی۔ تقریب کے بعد مارک نے اپنی "دلہن" کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "بے شک تم کتیا ہو، لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔

"مارک" جو آرٹس اور ڈیزائننگ کا طالب علم ہے، نے اپنی شریک حیات کے بارے میں مزید کہا کہ "لوگ عورت سے محبت کرتے ہیں جب کہ میں اپنی کتیا سے محبت کرتا ہوں۔ ایک انگریزی جریدے کے مطابق شادی کی دوسری تقریب (ولیمہ) "مارک" کے گھر واقع "آکسفورڈ شیکس" میں ہوئی جس میں "مارک" کی ۴۳ سالہ والدہ محترمہ "میم ارین" نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا جبکہ دولہا کی بہنیں ۱۲ سالہ "لی" اور "ناہن" اور بھائی "جوڈی" نے شراب سے مہمانوں کی تواضع کی۔ مارک کے ایک دوست نے جب "ہیکسی" سے پوچھا

کہ "کیا وہ اسے بحیثیت خاوند قبول کرتی ہے تو "ہیکسی" نے جواب میں اپنا سر زمین پر جھکا لیا جس کے بعد تمام مہمانوں نے بیک آواز خوشی سے گانا اور ناچنا شروع کر دیا"۔

(۶ مارچ ۱۹۸۹ء روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی)

دین جمہوریت کی "شخصی آزادی" "فرائڈ" اور "ڈارون" کے فلسفوں نے "حیوانی ازدواج" کا دروازہ کھول کر ایک طرف تو یورپ کے خاندانی نظام کو تباہ و برباد کیا۔ اور دوسری طرف یورپین فلاسفروں نے "نیچرل" فلسفے بیک ٹو نیچر (Back to Nature) کے رنگین پردے میں پوری دنیا میں اباحیت مطلقہ (ہر چیز بلا استثنٰی جائز ہے) کا بیج بو دیا، اس نے لوگوں کو نہایت دلچسپ انداز میں درس دینا شروع کیا کہ آزاد محبت عین تقاضائے فطرت ہے۔ یہ نکاح وغیرہ اور حلال و حرام کی پابندیاں محض مصنوعی ہیں، یہ تاریخ کے تاریک ادوار کی یادگار ہیں۔ اس کا نتیجہ اتنا تباہ کن نکلا کہ یورپ کے دانشوروں نے بھی اس آزاد تہذیب کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کی۔

آزادئ عام کے خلاف یورپ کا واویلا :

یورپ کا مشہور مفکر "برٹرینڈرسل اپنی کتاب، اجتماعی تعمیر نو کے اصول" میں لکھتا ہے "ہماری سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں سب سے زیادہ بگاڑ اس طبقے (نوجوان طبقے) کے اخلاق میں پیدا ہو رہا ہے، جو ہمارے لئے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ ایک یقینی امر ہے کہ اگر ہمارا معاشی اور اخلاقی نظام اسی طرح قائم رہا تو آئندہ نسلیں اپنے اخلاق و کردار کے اعتبار سے انتہائی گھٹیا ثابت ہوں گی"۔

امریکہ میں ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ایک کتاب شائع ہوئی جس کا نام ہے (U.S.A Confidential)۔ اس کتاب کے مصنفین نے امریکی زندگی کا ایسا گھناؤنا نقشہ پیش کیا ہے جس کے تصور سے بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے

لگایا جاسکتا ہے کہ صرف مارچ ۱۹۵۲ء میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ کتاب کے مصنفین لکھتے ہیں کہ:

"آج ہمارے ہاں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا افراط ہے۔ اب عورتوں کو آزادی ہے، اس لئے وہ ہمارا پیچھا کرنے میں آزاد ہیں، مردوں کی چشم التفات ان کے لئے ایک ایسی جنس نایاب ہے جس کا انہیں سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے"۔

آپ کو بیواؤں کے ہاں جانے کی ضرورت نہیں آپ ٹیلیفون پر انہیں گھروں پر بلا تکلف بلا سکتے ہیں۔ اس تغیر نے اس پیشہ کے معاشی پہلو میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا ہے۔ اب نہ تو مکان کی ضرورت ہے اور نہ سرمائے کی۔ چکلوں میں سوائے نچلے طبقے کے کوئی نہیں جاتا۔

بیواؤں کو اب کمپنی گرلز (Company Girls) کے لقب سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ ان سے سارا معاملہ ڈاکٹر کی طرح فون پر طے ہو جاتا ہے۔ اور ڈاکٹر کی طرح ہی انہیں مہینے کے آخر میں بل کی ادائیگی کر دی جاتی ہے۔

بعض لوگ انہیں کال گرلز (Call Girls) یا پارٹی گرلز کے ناموں سے بھی موسوم کرتے ہیں، کیونکہ ضرورت کے وقت انہیں دعوتوں میں بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ یہ مہذب رنڈیاں، تلاش روزگار میں ایک ریاست سے دوسری ریاست میں جاتی رہتی ہیں۔ قریب قریب یہی حالت انگلستان کی بھی ہے۔

(Patsolan) لکھتا ہے:

"ایک شخص کے لئے یہ قطعاً ناممکن ہے کہ وہ لندن کے مرکزی بازار میں سے گذر جائے اور کوئی خاتون اس کو "خوش آمدید" نہ کہے۔ اگر قارئین مجھ پر اعتماد نہ کریں تو میں انہیں آج بھی اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ وہ گیارہ بجے رات کے بعد پیکاڈلی، لسرزئر، لکوائر اور ریجنٹ اسٹریٹ میں سے گذر کر دیکھیں۔ انہیں میرے اس دعویٰ کی صداقت کا

خود بخود یقین ہو جائے گا"۔

یورپ کی طبعیات کی ایک ماہر خاتون "مسز ہڈسن" کہتی ہے:

"ہماری تہذیب کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ نہ معلوم یہ ساری عمارت کب پیوند خاک ہو جائے۔ اس کے بقا کی بس ایک ہی صورت ہے، کہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول پر پابندی عائد کر دی جائے، کیونکہ اس تہذیب کے لوگوں کی تمام تر توجہات جنسی تعلقات، قحبہ گری اور عصمت فروشی، مختصر یہ کہ جنسی خواہشوں پر مرتکز ہو کر رہ گئی ہیں اس معاملہ میں اور بھی بے اعتدالیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مثلاً مردوں اور عورتوں کا خود اپنے ہی ہم جنسوں کی طرف مائل ہونا۔ انسانی صلاحیتوں کا یہ زیاں بڑا ہی تشویشناک ہے۔ جنسی تعلقات کی یہ نوعیت اور اس کے بدترین آثار ونتائج کو دیکھ کر ہمارے ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ آیا یہ ہماری تہذیب کے ملیامیٹ ہونے کے آثار و شواہد ہیں؟"

(Mrs. Hudson Sgaw Sex and Common Sense)

مردسے عورتوں کا زنا بالجبر :

امریکہ میں ۲۱ سالہ نوجوان "ہیر وٹن" کے ساتھ تین دوشیزاؤں نے سات مرتبہ زنا بالجبر کیا۔ (پاسبان، کوئٹہ۔ ۴ مئی ۱۹۵۲ء)

یورپ میں حرامی بچوں اور اسقاط حمل کی بھرمار :

گذشتہ جنگ عظیم میں امریکی فوجیوں نے جاپانی ماؤں سے خفیہ اور اسقاط کی صورت کے علاوہ بیس لاکھ حرامی بچے چھوڑے۔ (نوائے وقت لاہور۔ ۲ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

"روزنامہ پاکستان ۲۵ دسمبر ۱۹۹۱ء کی خصوصی اشاعت ولادت قائداعظم صفحہ ۲ کالم ۴" پر دین سائنس اور فطرت کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ:

"برطانیہ کی فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ڈرودین میسی نے کہا ہے کہ برطانیہ میں ہر تین منٹ بعد ایک لڑکی اسقاط حمل کراتی ہے کمسن حاملہ لڑکیوں کی تعداد خطرناک حد تک پہنچ گئی ہے، معاشرہ تباہ ہو جائے گا"۔

اس حساب سے گویا کہ برطانیہ میں ہر چوبیس گھنٹوں کے اندر چار سو اسی اور سالانہ ۱۷۵۲۰۰ (ایک لاکھ، پچھتر ہزار دو سو) حرامی بچوں کا اسقاط کیا جاتا ہے۔ اور جو لڑکیاں اپنے وقت پر حرامی بچہ جنم دینا پسند کرتی ہیں خدا جانے ان کی تعداد کتنے لاکھ تک پہنچتی ہو گی۔

ایک اور اخباری خبر بھی پڑھ لیجیے۔

"نیویارک انٹرنیشنل ڈیسک امریکہ میں گذشتہ پندرہ برسوں کے دوران نو عمر "ٹین ایج" (یعنی ۱۳ سال سے ۱۹ سال تک) ماؤں کی شرح میں ریکارڈ اضافہ ہوا اس کے ساتھ غیر شادی شدہ ماؤں کی تعداد بھی بڑھی ہے۔ ۱۹۸۹ء کے دوران پیدا ہونے والے ہر چار بچوں میں سے ایک غیر شادی شدہ ماں سے ہے۔ حال ہی میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۹ء میں پندرہ سے سترہ سال کی ہر ہزار لڑکیوں میں سے ۳۶۵ مائیں بن چکی تھیں جو ۱۹۸۸ء کی شرح سے آٹھ فیصد زیادہ ہے جبکہ اٹھارہ سے انیس سال کی عمر کی لڑکیوں کی ماں بننے کی شرح میں چھ فیصد اضافہ ہوا ہے اور اس عمر کی ہر ہزار لڑکیوں میں ۸۶۵ مائیں بن چکی ہیں"۔ (روزنامہ پاکستان۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۹۱ء)

یہ خبر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"ایک اندازے کے مطابق دنیا میں ہر سال پچیس کروڑ افراد جنسی تعلق کی وجہ سے جراثیم منتقل ہونے سے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور ۲۰۰۰ء تک تین کروڑ افراد ایڈز کا شکار ہو جائیں گے"۔ (روزنامہ پاکستان۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۹۱ء)

یہ ہے دین جمہوریت کے ایک بنیادی رکن "شخصی آزادی" کے بھیانک نتائج کی ایک جھلک۔ دین جمہوریت میں ان آزادیوں کو "بنیادی انسانی حقوق" کا تقدس حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں علیہم السلام کی برملا توہین :

دین جمہوریت کے مذکورہ ارکان انسان کے وہ بنیادی حقوق تصور کیے جاتے ہیں جن پر کسی قسم کی پابندی لگانے کا حق یا اتھارٹی نہ تو اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، نہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے انبیاء علیہم السلام کو، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی کسی "وحی" کو البتہ جمہوریت کے منتخب کردہ مقننہ (قانون ساز ادارہ یعنی اسمبلی) کو یہ حق اور اتھارٹی حاصل ہے کہ وہ مذکورہ آزادیوں اور بنیادی حقوق میں اکثریت کے بل بوتے پر جس طرح چاہے کمی، بیشی، تغیر اور تبدیلی کرے یا اس کو محدود اور مقید کردے۔

اس موقعہ پر ان مسلمانوں اور خاص کر بعض ان علماء کی آنکھیں کھلنی چاہئیں جو جمہوریت کو مسلمان سمجھتے ہیں، یا اسے مسلمان بنانے کی فکر میں ہیں۔ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ اور پیغمبر خدا ﷺ نیز قرآن وسنت کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے، کہ جمہوریت کی دی ہوئی کسی بھی آزادی پر اللہ تعالیٰ پیغمبر خدا ﷺ اور قرآن وسنت، تو کوئی پابندی نہیں لگا سکتے مگر مسلمان اسمبلی کی اکثریت کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ وہ جمہوریت کی کسی بھی آزادی پر قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں اگر پابندی لگانا چاہے تو لگا سکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دین جمہوریت نے اس مرحلہ پر اللہ تعالیٰ، پیغمبر خدا ﷺ اور قرآن وسنت کی جو توہین کی ہے، یہ خالص دہریت سے بڑھ کر جرم ہے، اس لئے کہ کمیونزم یا سوشلزم تو سرے سے اللہ تعالیٰ، انبیاء علیہم السلام اور کتب ساوی کی صداقت کے قائل نہیں ان کی طرف سے یہ توہین اتنا جرم نہیں جتنا کہ جمہوریت کی طرف سے۔ اس لئے کہ جمہوریت تو اللہ تعالیٰ، انبیاء علیہم السلام اور وحی کی اگر تصدیق نہیں کرتی تو انکار بھی نہیں کرتی وہ تو حقیقت کل کے بارے میں "لاادری" کے چوراہے پر ہے۔ اور اس کے باوصف خالق کائنات کا مقام انسان جیسی مظلوم اور جہول مخلوق کے مقام سے بھی نیچے سطح پر لے آنا

کتنی افسوسناک بات ہے۔ خدا، رسول کے ساتھ اہل اسلام کی شکایت کس سے کروں؟ انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ۔(یوسف۔ آیت:۸۶)

"تحقیق میں تو شکایت وشکوہ اور اظہار غم اللہ ہی سے کرتا ہوں"۔

علامہ ابوصالح لکھتے ہیں:

"پس اس نظریہ (نظریۂ جمہوریت) کی رو سے یہ خود افراد ہی ہوا کرتے ہیں جو دستور سازی بھی کیا کرتے ہیں، اور نظام ہائے حیات کو تعین بھی کیا کرتے ہیں پھر وہ انتظامی ڈھانچہ یعنی اسمبلی، کہ جسے لوگوں نے تنخواہ دار کے طور پر منتخب کیا ہوتا ہے، وہ نظام ہائے حیات اور احکام کو عامۃ الناس پر لاگو کیا کرتے ہیں اور اس عمل میں دین اور رجال دین یا چرچ کے انتظامی ڈھانچے یا اصحاب تقدس (انبیاء علیہم السلام) میں سے کسی کو بھی دخل دینے کی نہ تو قوانین سازی کے حوالے سے اجازت ہوتی ہے، اور نہ ہی ان کے نفاذ کے حوالے سے انہیں کسی طرح کی مداخلت کرنے کا اختیار ہوا کرتا ہے"۔ (جمہوریت اسلام کے آئینے میں۔ ص:۲۰)

علامہ عبدالحمید صدیقی رقم طراز ہیں:

"حاکمیت جمہور کا منشا یہ ہے کہ ایک قوم کے عوام اپنی خواہشات اور اپنی آراء میں ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں، وہ جس شے کو چاہیں کثرت آراء سے اپنے لئے خود حلال یا حرام ٹھہرا سکتے ہیں مذہب یا اخلاق کا کوئی ضابطہ ان کے فیصلے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا"۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

"مملکتی اقتدار کا اصل منبع مشیت عامہ (General Will) ہے جو کثرت رائے سے متعین ہوتی ہے، یہ مشیت عامہ سیاہ وسفید کی مالک اور بداخلاقی کو اخلاق اور ناحق کو حق قرار دینے کی پورے طور پر مجاز ہے"۔ (انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام۔ ص:۲۹و۵۹)

دین جمہوریت میں چوری ڈکیتی ایک فیشن

وہ افعال اور حرکات جو کسی مذہبی ماحول اور معاشرہ میں ننگ انسانیت اور باعث عار سمجھے جاتے تھے۔ آج جمہوری ماحول اور معاشرے میں باعث فخر و کمال سمجھے جانے لگے ہیں آج کے متمول خاندانوں سے تعلق رکھنے والے افراد اور نوجوان صرف بطور فیشن چوری، ڈاکہ زنی اور تخریب کاری کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

ترجمان اسلام ۲۱ اپریل ۱۹۶۱ء کی خبر کے مطابق صدر کینڈی کی صدارتی تقریب جو واشنگٹن میں منائی گئی۔ اس میں گیارہ ہزار پیالے، چھ ہزار شیشے کی ٹرے، چھ سو رومال اور ایک بڑی مشین چوری ہو گئی۔ اندازہ لگایئے کہ امریکہ جیسی جمہوریت اور معقولیت کے گڑھ میں صدارتی تقریب کے مہمانوں کی (جو یقیناً امریکہ کے شرفاء اور متمول افراد ہونگے) جب اخلاقی حالت یہ ہے، تو جمہوریت کے نظام میں ان کے خوشہ چینوں اور ان کے تلامذہ کی کیا حالت ہو گی۔

پاسبان کوئٹہ ۴ جنوری ۱۹۵۰ء کے مطابق امریکہ کے محکمۂ تحقیقات کی رپورٹ ہے کہ امریکہ میں ہر سیکنڈ میں ایک بڑا جرم ہوتا ہے۔ ہر ۲۴ گھنٹے میں ۴۶۳ موٹر کاریں چرائی جاتی ہیں۔

روزنامہ سچ ۱۱ اپریل ۱۹۷۲ء کی اشاعت کے مطابق امریکہ میں سالانہ اوسطاً ایک لاکھ ڈاکے پڑتے ہیں اور پانچ لاکھ چوریاں ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ یہ کئی دہائیاں پہلے جمہوریت کے بہتر زمانے کے واقعات ہیں آج کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت سے اشتراکی جمہوریت نے جنم لیا

سرمایہ دارانہ جمہوریت کی بے قید ملکیت اور معیشت نے اگر ایک طرف ایک

مخصوص اور قلیل طبقے کو امیر ترین اور بے انتہا عیاش بنا دیا تو دوسری طرف ہر جمہوری ملک میں عظیم اکثریت ان لوگوں کی ہے جو خون، پسینہ ایک کر کے اہل و عیال کا پیٹ بمشکل بھرتے ہیں۔

انگلستان جیسے ملک میں بھی غربت و افلاس کے ہاتھوں خودکشی پر آمادہ ہونے والے افراد کی تعداد سالانہ پانچ ہزار ہے۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

اسی کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ کمیونزم اور سوشلزم کا پرفریب نعرہ جوں ہی غریب اور ستم زدہ طبقے نے سنا، بغیر سوچے سمجھے اس پر لبیک کہا اور اس طرح بے قید معیشت کے سود خوروں کی سلگائی ہوئی آگ نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آج پوری دنیا دو بلاکوں میں تقسیم ہے سرمایہ دارانہ جمہوریت اور اشتراکی جمہوریت۔ اس طبقاتی کشمکش اور جنگ کے نتیجے میں اگر ایک طرف کروڑوں جانیں ضائع ہوئی ہیں، تو دوسری طرف اس جنگ کو جیتنے کے لئے دونوں بلاک جدید ترین مہلک ہتھیاروں، جنگی منصوبوں پر سینکڑوں کھرب ڈالر خرچ کر رہے ہیں۔ جب تک افراط و تفریط (بے اعتدالی) کی علمبردار ان دونوں جمہوریتوں میں سے کوئی ایک بھی نافذ رہے گی اس وقت تک اس کی ضد بھی پہلو بہ پہلو لازمی طور پر چلتی رہے گی۔ اور یوں حرب و ضرب، فتنہ و فساد کا بازار گرم رہے گا۔

میری اس پیشین گوئی کی بنیاد ایک تو تجربہ اور مشاہدہ ہے، وہ یہ کہ جب بھی کسی مشترکہ مفادات اور متعلقہ مسائل میں ایک فریق راہ مستقیم اور اعتدال سے ہٹ جاتا ہے تو دوسرا فریق لازماً اعتدال اور صراط مستقیم سے ہٹے گا، ورنہ اس کی انا اور بقا خطرے میں پڑ جائیگی گویا کہ اپنی بقا کے لئے جد و جہد کا درس یہی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے ایک نظام کی بقا دوسرے نظام کے احیاء کو یقینی بناتا ہے اور انجام کار جنگ و فساد برپا ہوتا ہے۔ اگر سرمایہ دارانہ جمہوریت کی بے قید ملکیت نہ ہوتی تو اشتراکی جمہوریت جس میں ملکیت کی نفی کی گئی ہے،

وجود میں نہ آتی اور نہ اس کی ضرورت پیش آتی۔

مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ اور لینن کی گفتگو

مولانا سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے صرف اس ایک آیت (یسئلونک ماذا ینفقون ○ قل العفو) "جس کا مطلب ہے اے پیغمبر تجھ سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ ہم محتاجوں پر اپنے اموال میں سے کتنی مقدار خرچ کرتے رہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ جو کچھ تمہاری ضرورت سے زائد ہو"۔ کا ترجمہ لینن کو سنایا تو جوش میں آ کر اس نے کہا کہ اگر ہم پہلے اس سے واقف ہوتے تو ہمیں کمیونزم کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

(سوشلزم اور اسلام۔ ص: ۹۷ علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ)

(نوٹ) بعض علماء حضرت سندھی رحمہ اللہ اور لینن کی ملاقات کی نفی کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب (تطبیق اگر نفی کی بات درست ہو تو مذکورہ گفتگو بالواسطہ ہوگی)

خلاصہ یہ کہ جب تک حقیقی اسلام کا عادلانہ نظام معیشت نہ ہو، جس میں نہ تو بے قید ملکیت کی گنجائش ہے اور نہ ہی ملکیت کی مطلقاً نفی کی اجازت ہے تب تک دنیا جمہوریت کی دو دھاری تلوار کے وار سہتی رہے گی۔

میری پیشین گوئی کی دوسری بنیادی دلیل قرآن کریم ہے:

قولہ تعالیٰ: یاأیھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین ○ فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ ○

(پارہ: ۳، البقرہ، آیت: ۲۷)

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور (اس آیت کے نزول کے بعد) جو کچھ باقی (سود) رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو اگر تم نے نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان

جنگ ہے"۔

آپ نے قرآن کی صداقت دیکھ لی کہ دین جمہوریت کے حلال کردہ سود کے نتیجے میں پوری دنیا جنگ کی بھٹی میں کس طرح جھلس رہی ہے، اور تیسری عالم گیر جنگ کا ہولناک خطرہ کس طرح سروں پر منڈلا رہا ہے۔ چونکہ جمہوریت (خواہ سرمایہ دارانہ ہو یا اشتراکیت) نے اللہ تعالیٰ کو مقام الوہیت اور شارعیت سے ہٹا کر عوام کی خواہشات اور ان کے ہوائے نفس کو الہ، شارع اور خدا بنایا ہے اور عوام کے لئے اباحیت مطلقہ کا اعلان کیا ہے اس لئے دین اسلام میں دین جمہوریت کے لئے قطعاً کوئی نرم گوشہ نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق○

(التوبہ۔پارہ:۱۰، آیت: ۲۹)

"ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے ہیں اور نہ اسے حرام جانتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اور قانونِ حق کو اپنی زندگی کے لئے بطور قانون قبول نہیں کرتے"۔

قولہ تعالیٰ: ومن اضل ممن التبع ھواہ بغیر ھدی من اللہ○

(پارہ:۲۰، القصص، آیت:۵۰)

"اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو اللہ کی ہدایت کے مقابلے میں اپنی خواہشوں کی پیروی کرتا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: افرأیت من اتخذ الھہ ھواہ واضلہ اللہ علی علم وختم علی سمعہ وقلبہ وجعل علی بصرہ غشوۃ فمن یھدیہ من

بعد اللہ○ (پارہ:۲۵،الجاثیہ، آیت:۲۳)

”بھلا آپ نے اس کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنالیا ہے اور اللہ نے باوجود سمجھ کے اسے گمراہ کر دیا اور اس کے کان اور دل پر مہر کر دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا پھر اللہ تعالیٰ کے سوا اس کو کون ہدایت کر سکتا ہے“۔

قولہ تعالیٰ: ارأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ افانت تکون علیہ وکیلا○ ام تحسب ان اکثرھم یسمعون او یعقلون ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا○ (پارہ:۱۹،الفرقان، آیت:۴۴)

”کیا آپ نے اس کو دیکھا جس نے اپنا خدا اپنی خواہش کو بنا رکھا ہے سو کیا تم اس کو راہ راست پر لانے کے ذمہ دار ہو سکتے ہو؟ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ اکثر ان میں سے سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں یہ لوگ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ لوگ چوپایوں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں“۔

تشریح: قرآن فہمی کے لئے ضروری ہے کہ قرآنی آیات کی شان نزول کے بارے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا موقف اور طریقہ کار ہر وقت انسان کے پیش نظر ہو جس کے ہوتے ہوئے ہر زمانے کے لئے قرآنی آیات اور اس کے احکامات میں کوئی الجھن اور اخفاء باقی نہیں رہے گا اس بارے میں امام الاولیاء والمفسرین حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ محدث دہلوی یوں رقم طراز ہیں:

والذی یظھر من استقراء کلام الصحابة والتابعین انھم لا یستعملون نزلت کذا لمحض قصة کانت فی زمنه علیه السلام وھی سبب نزولھا بل ربما یذکرون بعض ما صدق علیه الآیه مما کان فی زمنه علیه السلام او بعده علیه الصلوٰة والسلام ولا یلزم ھناك انطباق جمیع القیود بل یکفی انطباق اصل

الحکم الخ. (الفوز الکبیر فی معرفۃ اسباب النزول. ص: ۴۸)

"مطلب! صحابۂ کرام اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین جب کسی آیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ فلاں واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، تو اس کا مطلب محض یہ نہیں ہوتا کہ یہ آیت بعینہ اس واقعہ میں نازل ہوئی ہے، بلکہ جس واقعہ کے اصل حکم پر یہ آیت چسپاں ہوتی ہے خواہ سب قیود اور شرائط موجود نہ بھی ہوں اگرچہ یہ واقعہ حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد رونما ہوا، تو بھی صحابہؓ اور تابعین رحمہم اللہ محض ظاہری مماثلت اور مطابقت کے سبب فرماتے تھے کہ حضور علیہ السلام کے زمانے کی فلاں آیت اس تازہ ترین واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے"۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قرآن کریم قیامت تک رونما ہونے والے جملہ واقعات کا اصولی طور پر حل پیش کرنے والی آخری کتاب ہے۔ لہٰذا اس کے احکامات کسی زمانے کے لئے خاص نہیں ہیں۔ اس بنیادی نکتہ کو ذہن میں رکھنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ بالا آیات قرآنی یا اس قسم کی دیگر آیات جن میں ان لوگوں کی مذمت، کفر اور شرک کا بیان ہے، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی شارعیّت اور قانون سازی اور بندوں کو ان کی خواہشات نفس کی مطابقت، اباحت مطلقہ (سب کچھ جائز ہونے) کا اختیار عوام کی اکثریت کو دیا ہو وہ تمام آیتیں گویا کہ مروجہ جمہوریت اور دیگر کافرانہ نظامہائے معیشت اور نظامہائے حیات ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

دین جمہوریت کی حریت عامہ ایک فریب ہے

ارباب جمہوریت تقریر و تحریر کے ذریعے تو عوام کو دھوکہ دینے کے لئے بنیادی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا بڑے دھوم دھام سے پرچار کرتے ہیں، مگر عملی میدان میں عوام کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے فرد کی آزادی کا جو دعویٰ وہ کرتے رہے ہیں۔ وہ بھی

باطل اور حقیقت سے کوسوں دور ہے۔

جمہوریت میں کسی فرد یا پارٹی کے بنیادی حقوق اور آزادی صرف اسی وقت تک قابل برداشت ہے، جب تک کہ یہ اکثریتی پارٹی (حکمران طبقے) کے مفاد کے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہو، مگر جوں ہی یہ آزادی ان پر اثر انداز ہونا شروع ہوتی ہے اسی وقت بنیادی حقوق اور آزادی کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ امریکہ جو جمہوریت کا سب سے بڑا دعویدار بلکہ پاسبان ہے، وہاں ۱۹۴۶ء میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا مقصد امریکہ دشمن عناصر (UnAmerican Elements) سے ملک کو پاک کرنا تھا۔ نیویارک ٹائمز اس کمیٹی کی کارگزاریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”سول سروس کمیشن کی جگہ اب ایک وفاقی محکمۂ تفتیش (Federal Bureau of Investigation) قائم کیا گیا ہے۔ یہ اقدام نہایت ہی خطرناک ہے اس سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ U.S.A پولیس اسٹیٹ میں تبدیل ہو جائے گی اس لئے یہ کاروائی بالکل تخریبی ہے“۔

اسی طرح ۱۹۴۷ء میں ”صدر ٹرومین“ نے ایک حکم نامہ جاری کیا جس پر بغیر کسی ادنیٰ تامل کے عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اس کی رو سے تمام ملازمین کی تفتیش کی گئی اور تمام تخریب پسند عناصر چھانٹ چھانٹ کر الگ کر دیئے گئے، اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ تمام وہ اشخاص جو اس آزمائش سے گذرے ان کی مجموعی تعداد ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ تھی جس شخص کے متعلق ”ملک دشمنی“[1] کا معمولی شبہ بھی ہوا اسے نہ صرف یہ کہ وسائل رزق سے محروم کر دیا گیا بلکہ اسے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں ان تصریحات کے بعد یہ بات

---

(۱) ”تخریب پسندی“ اور ”وطن دشمنی“ یا ”ملک دشمنی“ دو ایسے جدید فتوے ہیں جو جمہوریت کے ”کارخانہ تکفیر“ سے جاری کئے جاتے ہیں ان کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ اہل اقتدار کے ہر مخالف پر انہیں آسانی سے چسپاں کیا جاسکتا ہے۔

سمجھ آسکتی ہے کہ جمہوری نظاموں میں حقوق اگر حاصل ہیں تو صرف حکمران طبقہ یا ان کے حاشیہ برداروں کو حاصل ہیں اور بس۔

آزاد عدلیہ

کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ مظلوم جب چاہے مملکت کی "آزاد عدالتوں" کی طرف رجوع کر کے انصاف حاصل کر سکتا ہے۔ ان کی مدد سے ظالموں کو سزا دلوا سکتا ہے اور ان کی وساطت سے مستحقین اپنے حقوق حاصل کر سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اصل بات یہ ہے کہ عدالتیں قوانین نہیں بناتیں بلکہ بنے بنائے قوانین نافذ اور لاگو کرتی ہیں۔ قوانین تو ملک کی مقننہ (اکثریتی پارٹی کے ارکان اسمبلی) بناتی ہیں اور یہ کوئی ابدی اور غیر متغیر چیز نہیں بلکہ روزانہ ملکی مفاد اور مصلحت عامہ کے نام سے اس میں ترمیم و تجدید کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس لئے دین جمہوریت میں مقننہ جب چاہے جس طرح چاہے اپنے مفاد کے خلاف قوانین منسوخ کر کے اس کی جگہ اپنی منشا کے مطابق وہ قوانین وضع کر سکتی ہے، جن کے سامنے جج صاحبان بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ویسے بھی حکمران طبقہ اور ان کے حاشیہ بردار سرمایہ داروں کے مظالم کے خلاف مظلومین کی دادرسی کرنا کسی جج کے لئے خودکشی کے مترادف ہے کیونکہ ججوں کی ان عہدوں پر تقرری اور مزید ترقی انہی کی ذات گرامی کی مرہون منت ہوتی ہے۔

ہیرڈ لاسکی، اپنی کتاب "جمہوریت کا بحران" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ملک کا دستور ابدی اور غیر متغیر قوانین پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ یہ نام ہے چند ایسے ضوابط کا جن کو وقتاً فوقتاً وقتی مصلحت کے پیش نظر بدل دیا جاتا ہے، قانون کا تانا بانا تیار کرتے وقت چند مخصوص مقاصد ہی پیش نظر ہوتے ہیں ججوں کے ہاتھوں میں یہ اختیارات نہیں

ہوتے کہ وہ خود قوانین وضع کریں، اور پھر ان کے مطابق فیصلہ کریں۔ ان کا فرض صرف یہی ہے کہ وہ رائج الوقت قوانین کو حالات پر منطبق کر کے فیصلہ صادر کریں جج بچارے ایسا کرنے پر مجبور ہیں، وہ ہر روز اپنی آنکھوں سے ظلم ہوتا دیکھتے ہیں مگر اف تک نہیں کر سکتے۔ ان کے قلم ہر صبح ہر شام ان کی بے بسی اور مجبوری کی چغلی کھاتے ہیں وہ بااختیار ہونے کے باوجود بے اختیار ہوتے ہیں۔(H. Laski: The Cricis of Democracy)

مروّجہ جمہوریت میں چونکہ انسانیت کی معراج مادہ پرستی میں سبقت اور دنیاوی جاہ جلال اور عیش و عشرت میں یکتائی کا حصول سمجھا جاتا ہے، لہٰذا ایسی معاشرت میں ہر ایک فرد کے دل میں "ھل من مزید" کا جذبہ موجزن ہوتا ہے، جس سے بہت کم لوگ مستثنیٰ ہونگے۔ اس لئے وہ ذاتی حقیر فائدوں کے لئے کئی بے گناہ لوگوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کر دیتے ہیں۔

وسکاؤنٹ برائس (Viscount Bryci) اپنی شہرۂ آفاق کتاب (Modren Democracies) میں لکھتا ہے۔

"بداخلاقی کے سارے مظاہر میں سے عدلیہ کی بددیانتی سب سے زیادہ نفرت انگیز ہے، کیونکہ یہی وہ سب سے مؤثر ذریعہ ہے جس کی وساطت سے امیر غریب کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں فرانسیسیوں کو اپنی عدالتوں پر کوئی اعتماد نہیں رہا۔ امریکہ میں بعض بینچوں پر ایسے جج موجود ہیں، جن کے انتخاب میں یا تو سیاست دانوں کا دخل ہے یا بڑے بڑے صنعتی اداروں کا، بعض شہروں میں وکلاء بھی عدالتوں پر اثرانداز ہوتے ہیں وقت کے ساتھ ساتھ ججوں کی رائے کے بدلنے کے طریقوں میں بھی اچھی خاصی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اب رشوت ستانی کے ایسے عمدہ طریقے نکل آئے ہیں، جن پر لوگوں کو کوئی شک نہیں ہوتا۔ لوگ اب ججوں کے سامنے سونے اور چاندی کے ڈھیر نہیں لگاتے بلکہ ان کو صرف اتنی اطلاع دینا کافی ہے کہ اگر وہ بعض مقدمات کا فیصلہ ان کی مرضی کے مطابق کر دیں تو فلاں

فلاں کمپنی میں انہیں بغیر سرمایہ لگائے اتنے حصص کا مالک بنا دیا جائے گا"۔

سنہ ۱۹۷ء میں امریکہ میں روزن برگ (Rosen Bergs) اور اس کی رفیقہ حیات کو عدالت نے جس دباؤ کے تحت موت کا حکم سنایا وہ عدلیہ کی آزادی کے پردے کو چاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ ان بے چاروں کو محض حکمران طبقہ کے ایماء پر ختم کیا گیا جیوری کے ایک ممتاز رکن لارڈ جیوٹ (Gouitt) نے اس حقیقت کا اعتراف کھلے لفظوں میں کیا ہے کہ اس سزا کے لئے شہادتیں ناکافی ہیں، مگر چونکہ حکمران طبقہ اس کے خون سے ہاتھ رنگنے پر تلا ہوا تھا اس لئے کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی حتیٰ کہ جب جسٹس ڈگلس (Dougles) نے دلائل کے کمزور ہونے کی وجہ سے دوبارہ مقدمہ چلانے کی اجازت دینا چاہی تو جمہوریت کے پرستاروں نے سخت واویلا کیا اور جج کو مواخذہ (Inpeachment) کی دھمکی بھی دی مرنے والے مر گئے، مگر ان کی موت سے جمہوریت کے سارے بلند بانگ دعووں کی اصلیت دنیا پر آشکارا ہو گئی۔ (انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام)

مادہ پرستانہ جمہوریت میں انصاف کوئی ایسی ارزاں چیز نہیں کہ جس کو خریدنے کی ہر کس و ناکس میں طاقت ہو "اقتدار کی اس منڈی" (Power Market) میں سب سے قیمتی چیز بھی عدل ہے اس لئے صرف وہی لوگ اسے حاصل کر سکتے ہیں جن کی جیبیں نوٹوں اور ڈالروں سے بھری ہوئی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی "انصاف کے طلب گار" کو اتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے کہ بڑے بڑے سورماؤں کی ہمتیں جواب دے جاتی ہیں۔ غریب اور نادار لوگ بڑے بڑے مظالم کو برداشت کر لیتے ہیں انہیں سخت سے سخت بے انصافی گوارا ہوتی ہے مگر وہ اپنے اندر یہ جرأت نہیں پاتے کہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔

پریس کی آزادی بھی ایک فریب ہے

جمہوریت کے حامیوں کو پریس کی آزادی پر بڑا ناز ہے لیکن درحقیقت یہ بھی ایک فریب ہے۔ چونکہ اخبار کا اجرا زر کثیر کے بغیر ممکن نہیں اس لئے اس کاروبار کو صرف امیر لوگ ہی جاری رکھ سکتے ہیں۔ ان کے پیش نظر اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہوتا کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے زیادہ سے زیادہ دولت کمائیں اور اپنے مخصوص مفادات (Vested Interests) کی پاسبانی کریں چنانچہ یہ لوگ حکمران طبقہ سے مراعات اور اشتہارات کے حصول کے لئے ان کے ہر ناجائز کو جائز ثابت کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ نیز کسی بھی ہتھکنڈے اور حربے سے دریغ نہیں کرتے کیونکہ اس سے ان کے کاروبار چمکتے ہیں اور جن اخبارات کو اہل اقتدار کے قرب کا شرف حاصل نہ ہو سکے وہ حزب اختلاف کا قربت حاصل کرنے کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ محض اس لئے کہ انہیں سستی شہرت حاصل ہو جائے۔ اس طرح پریس دو متضاد معتبار پر آکھڑا ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پریس عوام کی رہنمائی کرنے کے بجائے ''جھوٹ اگلنے والا چشمہ'' بن جاتا ہے۔ پریس حقائق کو نمایاں کرنے کی بجائے انہیں اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ حقیقت جھوٹ کی بے شمار تہوں کے نیچے دب کر آنکھوں سے یکسر اوجھل ہو جاتی ہے خاص کر انتخابات کے زمانے میں تو حقائق کو بے دردی سے مسخ کر دیا جاتا ہے۔

اور اگر کوئی سر پھرا اخبار حکمران طبقہ کی منشا کے خلاف اصل حقائق عوام تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، تو خبروں پر سنسر (Senser) کے پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں تاکہ ''درون خانہ'' جو ظلم و ستم ہو رہا ہے اس کی کسی کو خبر نہ ہو پریس ایکٹ جیسے مذموم قوانین کو حرکت میں لاکر بوقت ضرورت نہایت آسانی سے مخالف آواز کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قومی اور ملی مفادات کے بہانے سے بھی حکومت بعض اوقات اختیارات

کا غلط استعمال کر کے مخالفین کا منہ بند کر دیتی ہے۔

نام نہاد آزادانہ انتخابات

جمہوری نظام کے علمبردار آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے بڑے گن گاتے ہیں اور اسے عوام کی فتح گردانا جاتا ہے مگر حقیقت میں یہ صرف خود فریبی ہے۔ ملک کا سرمایہ دار اور اہل اقتدار طبقہ ہزارہا قسم کی چالوں کو استعمال میں لا کر عوام کو حکومت کے انتظام اور انصرام میں حصہ لینے سے روک دیتے ہیں بلکہ ایسے مذموم ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں جن سے کسی مخالف کا منتخب ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے۔

امریکہ جیسے قبلۂ جمہوریت کا یہ حال ہے کہ وہاں کے سیاہ فام باشندوں کو کاغذ پر تو ویسا ہی حق رائے دہی حاصل ہے جیسا کہ سفید فام باشندوں کو۔ مگر عملی میدان میں حبشی اس حق سے بالکل محروم ہیں۔

اس بات کا اندازہ صرف اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ حبشی کا، کانگریس کا ممبر منتخب ہونا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

جیننگ پیری (Jenning Perry) نے اپنی کتاب ''جمہوریت کا گھر سے آغاز ہوتا ہے'' میں آزادانہ انتخاب کے دعوے کو ناقابل تردید دلائل سے باطل ثابت کیا ہے۔ مسٹر پیری نے بتایا کہ کس طرح امریکہ میں لوگوں کو ووٹ دینے سے روک دیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ریاست ٹینس سی کے گورنر کا جب انتخاب ہوا تو بارہ لاکھ ووٹروں میں صرف تین لاکھ باون ہزار ووٹ دے سکے۔ پھر بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ ووٹروں کے باقاعدہ سودے ہوتے ہیں، اور انتخاب کی منڈی کے بعض تھوک فروش بہت بڑے پیمانے پر یہ کاروبار کرتے ہیں۔ ریاست ٹینس سی کے جس انتخاب کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس میں ایک شخص ''ایدوزیل کرمپ'' کے متعلق یونائیٹڈ پریس کے نمائندے کا بیان یہ ہے کہ تنہا اس کے قبضے

میں ساٹھ ستر ہزار ووٹ تھے اور اس طرح ریاست کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں اس کی ذات کو بہت بڑا دخل تھا یہ شخص ٹیلیفون پر بیٹھا ووٹوں کے سودے کیا کرتا۔

"امریکہ راز میں" (U.S.A Confidential) کے مصنفین "جیک لیٹ" (Gacklait) اور "لی مارٹی مر" (Lee Martimer) نے اس حقیقت کا نہایت ہی جرأت مندی سے اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"امریکہ کے عیار سیاست دان سیاہ فام لوگوں کے ووٹ خفیہ پولیس کے دباؤ سے سزائے موت یعنی لینش کرنا[1] کے قانون کی تنسیخ کے لالچ سے اور اسی قسم کے دیگر آئینی اقدام کے فریب سے ہتھیا لیتے ہیں"۔

ووٹ صرف زر اور عہدوں کے لالچ سے نہیں بلکہ دوسرے کئی مکروہ طریقوں سے بھی حاصل کئے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں کسی اخلاقی اصول کی پابندی نہیں کی جاتی بلکہ دھونس، دباؤ، قتل، غنڈہ گردی، بیلٹ پیپر میں جعل سازی، جعلی ووٹ پُر کرنا، بیلٹ بکس پر قبضہ جمانا بلکہ اقتدار کا یہ سودا حسن کی قیمت پر بھی نہایت بے تکلفی سے چکایا جاتا ہے اور پھر دل ہی دل میں کہتا ہے۔

؎ بحمد اللہ عجب ارزاں خریدم

یہ تو امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک کا حال ہے جنہیں دین جمہوریت میں "مہذب قوموں" اور "ترقی یافتہ" ہونے کی سند حاصل ہے۔

رہے ترقی پذیر ممالک یا وہ ممالک جن میں جمہوریت ہنوز پنپ رہی ہے، جیسے پاکستان وغیرہ، ان کا تو حال نہ پوچھئے جہاں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی جمہوری جنگ نے حقیقی

---

(۱) لینش کرنا: امریکہ میں انصاف کا ایک نرالا طریقہ ہے اس کا معنی یہ ہے کہ عوام جب عدالت کے فیصلے پر مطمئن نہ ہوں یا قانون کی سست رفتاری دیکھ کر صبر نہ کر سکیں تو قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیں اور جس شخص کو وہ مجرم سمجھتے ہوں اسے قرار واقعی سزا دے دیں اس کا وار عموماً حبشیوں ہی پر پڑتا ہے۔

خانہ جنگی کی صورت اختیار کی ہوئی ہے۔ ہر طرف بدامنی، غنڈہ گردی، رشوت ستانی، آبروریزی کا بازار گرم ہے۔ عوام تو عوام حکومتی سطح پر ہر محکمہ، ہر دفتر حتیٰ کہ صوبائی اور مرکزی سطح پر بھی کھینچا تانی اور جوڑ توڑ کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، اور ستم ظریفی یہ کہ باوجود اس افراتفری کے ہر فریق اپنے کردار پر نازاں اور جمہوریت کا ثناخواں نظر آتا ہے۔

؎ وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

یہ ہے دینِ جمہوریت کی آزادیوں کی ایک ادنیٰ جھلک۔ جسے اربابِ جمہوریت تمام انسانی مشکلات کے حل کے لئے بطور "چراغ الہ دین" پیش کرتے ہیں۔ اور یہ ہے دینِ جمہوریت کی "مفادِ عامہ" یا "فلاح و بہبود" کا وہ "سم سم" جس سے آناً فاناً مذکورہ آزادیوں کے کھلے دروازے بند کئے جا سکتے ہیں، انہی کے نتیجے میں پورا ملک جمہوری اور عوامی آمریت کے پنجے میں کس جاتا ہے ظاہر ہے کہ ان حالات سے وہی لوگ سب سے زیادہ واقف ہیں جو جمہوری نظام میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ ممکن ہے جمہوریت کے پرستار میری گذارشات اور بعض واقعات کی تاویل یا تردید کر سکیں مگر کوئی بھی منصف مزاج جمہوریت کے ظالمانہ ماحول کا انکار نہیں کر سکتا۔

اسلامی قوانین پر تنقید کا جواز اور تنقیدات

شریعت اسلامی میں اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر علیہ السلام نے چار قسم کے جرائم کے لئے قطعی سزائیں مقرر کی ہیں، انہیں شریعت کی اصطلاح میں "حدود" کہا جاتا ہے جو یہ ہیں۔

۱۔ (الف): شادی شدہ مرد یا عورت پر جب شریعت کے مطابق "زنا" ثابت ہو جائے تو اس کی سزا اسے سنگسار کرنا ہے جسے (رجم) کہا جاتا ہے۔

(ب): جب زنا کرنے والے غیر شادی شدہ ہوں تو انہیں سو (۱۰۰) کوڑے مارنے کی سزا

دی جائے گی۔

۲۔(الف): چوری جب شرائط کے ساتھ ثابت ہو جائے تو چور کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔

(ب): "قطاع الطریق" راہزنوں پر جب راہزنی اور ڈاکہ ڈالنے کا ثبوت مل جائے تو اگر راہزنوں نے ڈاکہ ڈالتے وقت کسی راہ گیر کو قتل بھی کیا تو سب ڈاکوؤں کو قتل کر دیا جائے گا۔ اور اگر صرف مال چھینا تھا، تو ہر ایک کا دایاں ہاتھ اور بایاں پیر کاٹ دیا جائے گا۔ اور اگر محض لوگوں کو خوفزدہ کیا اور انہیں کوئی مالی یا جانی گزند نہیں پہنچایا تو اس صورت میں انہیں جیل میں بند کیا جائے گا۔

۳۔ کسی نے نیک چلن انسان پر زنا کی جھوٹی تہمت لگائی جسے وہ شرعی گواہوں سے ثابت نہ کر سکا تو تہمت لگانے والے کو اسی کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔

۴۔ شراب پینے پر بھی کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔

ان سزاؤں کو حدود کہا جاتا ہے جو قرآن و سنت سے قطعی طور پر ثابت ہیں ان سزاؤں کا منکر یا ان کا استہزأ کرنے والا ازروئے شریعت دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

صدر ضیاء الحق مرحوم نے ان مذکورہ "حدود" کو ایک آرڈیننس کے ذریعہ قانوناً ملک میں نافذ بھی کیا۔ بعد میں ان سزاؤں کے نفاذ کے قانون کو لوگ "حدود آرڈیننس" کے نام سے یاد کرنے لگے۔

اس پر جمہوریت نوازوں نے جو ردعمل دکھایا وہ آپ بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی محترمہ بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں خواتین کی وزیر ریحانہ سرور نے روزنامہ جنگ کے مطابق کچھ اس طرح دین بیزاری کا مظاہرہ کیا ہے۔

زنااور حدود آرڈیننس غیر جمہوری، غیر اسلامی، غیر انسانی ہے (ریحانہ سرور)

لاہور (نمائندہ جنگ + اپ پ) خواتین کی ترقی کی وفاقی وزیر بیگم ریحانہ سرور نے زنااور حدود آرڈیننس کو غیر جمہوری، غیر اسلامی اور غیر انسانی قرار دیتے ہوئے اپنی وزارت کی ویمن لیگل رائٹس کمیٹی کو ان قوانین میں ترمیم کے لئے کیس تیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ "خواتین کو مردوں کے برابر لانے کے لئے کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر بھی شروع کئے جارہے ہیں" آگے جاکر فرمایا کہ "حدود آرڈیننس اور زنا کیس میں بند خواتین کو جیلوں سے نکالنے کے لئے کام ہورہا ہے"۔

(اخبار جنگ راولپنڈی۔ اتوار ۱۰ دسمبر ۱۹۸۹ء صفحہ ۸ کالم ۴)

حدود آرڈیننس اور قانون شہادت کی کوئی اسلامی حیثیت نہیں (بیگم ریحانہ سرور)

گجرات (نمائندہ جنگ) پیپلز پروگرام کے تحت ایک تقریب میں بیگم ریحانہ سرور نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "حدود آرڈیننس" اور قانون شہادت کی کوئی اسلامی حیثیت نہیں بلکہ یہ ایک آمر نے خود ہی تیار کر کے خواتین پر مسلط کردیئے"۔

(اخبار جنگ راولپنڈی۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۸۹ء صفحہ ۲ کالم ۲)

ایک وضاحت:

یہاں بیگم ریحانہ نے جو فرمایا ہے کہ "قانون شہادت کی کوئی اسلامی حیثیت نہیں" اس سے مراد وہ قرآنی قانون ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے" چونکہ صدر ضیاء الحق مرحوم نے یہ قانون نافذ کیا تھا اس لئے "ریحانہ سرور" اسے غیر اسلامی اور آمرانہ قانون قرار دے رہی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے

کہ یہ قرآنی قانون، دین جمہوریت کے "مرد وزن کے مساوات" کے اصول کے خلاف ہے۔

خواتین پر اسلامی پابندی کا خاتمہ :

صدر ضیاء الحق مرحوم نے اپنے دورِ اقتدار میں پاکستانی مسلمان قوم کے لئے اسلامی اقدار، حیا اور غیرت وحمیت کے پیش نظر بعض سرکاری پابندیاں نافذ کی تھیں، مثلاً عورتوں اور مردوں کے یکجا کھیلنے کو ممنوع قرار دیا تھا۔ عورتوں اور لڑکیوں کے علیحدہ کھیلوں میں مرد تماشائیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ فن کاروں اور رقاصاؤں کے بیرون ملک جاکر رقص وسرور کے مظاہرے کرنے پر پابندی عائد کی تاوقتیکہ حکومت سے "نو آبجیکشن سرٹیفکیٹ" یعنی اجازت نامہ حاصل نہ کیا جائے، یہ اگرچہ بظاہر ممانعت نہ تھی لیکن درحقیقت حکومت سے انہیں اجازت نامہ حاصل کرنے میں اتنی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا کہ قطعی ممانعت ہی پر قصہ منتج ہوتا تھا۔

اس طرح گویا آمرانہ دور کی بدترین یادگاریں اگر تھیں تو وہ مساوات کے خلاف حسیناؤں اور چاک وچوبند لڑکیوں کے رقص وسرور، حسن کی نمائش اور مختلف کھیلوں میں جسمانی کمالات یعنی چستی اور رعنائی کے مظاہرہ کرنے پر پابندیاں تھیں، جس سے ان کی شخصی آزادیاں سلب ہو چکی تھیں۔ کسی بھی جمہوری حکومت کا اوّلین فریضہ یہی ہوتا کہ مذکورہ قوانین (حدود آرڈیننس، شہادت کے شرعی قانون) اور حسن ورعنائی (جسے آج کل کی اصطلاح میں فن وثقافت کہا جاتا ہے) کے مظاہرے پر غیر جمہوری پابندیاں بیک جنبش قلم ختم کردے اور بے شک محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت نے اوّلین فرصت میں یہ فریضہ بخوبی نبھایا۔

ثقافتی طائفوں کے بیرون ملک جانے پر این۔او۔سی کی پابندیاں ختم کرنے کا جمہوری فیصلہ

اسلام آباد (پ پ ا) وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے وزارت ثقافت کی طرف سے پیش کی گئی اس تجویز کو منظور کر لیا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ پروفیشنل (پیشہ ور) موسیقاروں، آرٹسٹوں اور فلمی کارکنوں کے لئے بیرون ملک جانے کے سلسلے میں این۔او۔سی کی پابندی ختم کر دی جائے۔ یہ قانون ۱۹۷۸ء میں متعارف کرایا گیا تھا جس کی وجہ سے ایسے ثقافتی حلقوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا، جو بیرون ملک اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے چنانچہ اس پابندی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ (اخبار جنگ لاہور۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۸۹ء صفحہ ۸ کالم ۴)

وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کا تازہ ترین اعلان

(روزنامہ پاکستان لاہور کی بڑی سرخی)

"عورت کی گواہی مرد کے برابر ہے آدھی کا تصور غلط ہے"۔ (بے نظیر بھٹو)

بعض معاملات میں دو عورتوں کی گواہی لی گئی ہے دیگر میں ایسا نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ نے حضور علیہ السلام کی جو سیرت اور ہدایات بیان فرمائیں وہ احادیث کہلائیں جنہیں مرد تسلیم کرتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ سوچیں کہ عورت کی گواہی کم نہیں۔

قرآن پاک میں ملکہ سبا کے دور میں خوشحالی کا ذکر ہے۔

"خاتون حکمران ہو تو مایوسی ہوتی ہے" یہ فیصلہ اللہ کا نہیں ان مردوں کا ہے جو خواتین سے ڈرتے ہیں، پاکستان میں خواتین کے لئے نیا نظام جنم لے رہا ہے، ہائیکورٹس میں خاتون ججوں کی تقرری کا تاریخی کارنامہ اسی ماہ انجام دے دیا جائے گا۔ مرد اپنی ماؤں اور بیٹیوں کو غلام بنا دیتے ہیں، اسلام نے خواتین کو جو عزت دی وہ کسی دوسرے مذہب نے نہیں

دی ملک کی آزادی میں خواتین کا مردوں کے برابر حصہ ہے۔ خواتین کے بین الاقوامی کھیلوں میں حصہ لینے پر پابندی ختم کرنے کا اعلان۔ کون کہتا ہے کہ مسلمان خاتون غلام ہے، خواتین کے لئے ملازمتوں کے الگ اشتہار شائع کرنے کی ہدایت کر دی گئی ہے، کراچی ویمن پولیس اسٹیشن کی افتتاحی تقریب سے خطاب۔ (روزنامہ پاکستان لاہور۔ ۳ جون ۱۹۹۴ء صفحہ ا کالم ۴)

مردوں کو سیف گیمز میں خواتین کے مقابلے دیکھنے کی اجازت ہو گی

لاہور (نیوز ڈیسک) وفاقی حکومت نے ۲۰ اکتوبر سے اسلام آباد میں منعقد ہونے والی سیف گیمز میں خواتین کے مقابلوں کو دیکھنے کے لئے مرد حضرات کے داخلے کی پابندی ختم کر دی ہے۔ وزارت کھیل نے اس ضمن میں وزارت تعلیم، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور ڈائریکٹر جنرل اسپورٹس بورڈ کو مطلع کر دیا ہے، بتایا گیا ہے کہ خواتین جن کھیلوں میں حصہ لیں گی انہیں پاکستان ٹیلی وژن سے براہ راست ٹیلی کاسٹ کیا جائے گا، جبکہ مزید کوریج کے معاملے پر حکومت عوام کا رد عمل دیکھ کر فیصلہ کرے گی۔ سیف گیمز کے دوران ایسی خواتین کے لئے خصوصی انکلوژر بنایا جائے گا جو ان کھیلوں کو دیکھنے کے لئے تنہا آئیں گی۔ وزارت کھیل کے حکم نامہ میں مزید کہا گیا ہے کہ اندرون ملک ہونے والے کھیلوں کے مقابلوں میں مرد و خواتین کا ایک ساتھ ان مقابلوں میں شرکت کا فیصلہ مقامی اسپورٹس آرگنائزیشن کمیٹیوں کی صوابدید پر ہو گا۔ (روزنامہ جنگ راولپنڈی۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۹ء صفحہ ا کالم ۴)

واضح رہے کہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۹ء میں اسلام آباد میں مختلف کھیلوں اور جسمانی کرتبوں کا ایک عظیم شو "سیف گیمز" کے نام سے منعقد ہوا، جس میں ملک بھر کے علاوہ بیرون ملک ہندوستان، سری لنکا، مالدیپ وغیرہ ممالک کے ثقافتی وفود، فنکاروں اور کھلاڑیوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

سیف گیمز پر اسلام پرستوں اور جمہوریت پرستوں کا ردعمل

اس کھیل میں پاکستانی خواتین کی بحیثیت کھلاڑی شرکت پر ملک بھر میں اسلام پرستوں اور جمہوریت پرستوں کے درمیان نوک جھونک ہوئی۔ مگر آخر کار اسلام کی حمیت رکھنے والوں کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

سیف گیمز دھوم دھام سے شروع ہوئے اور یادگار اختتامی تقریب پر ختم ہوئے۔ اس طرح جمہوریت پرستوں کو گویا ایک فتح حاصل ہوئی۔ اسلام پرستوں اور جمہوریت پرستوں کی مذکورہ سرد جنگ کا اندازہ اخبار کے حسب ذیل عنوان سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

کفار کے اجتماع میں خواتین کی شرکت نامناسب ہے

وہ ان کو تحسین بھری نگاہوں سے دیکھیں گے اور تالیاں بھی بجائیں گے۔

(محمود احمد رضوی)

خاتون کھلاڑیوں کی مردوں کے سامنے نمائش ناجائز ہے۔ (مفتی نعیمی)

ضیاء دور میں ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ (آپا نثار فاطمہ)

عورتوں کا کھیلوں میں حصہ لینا غیر اسلامی نہیں، اس پر اعتراض کرنا غیر اسلامی ہے۔

(حنا جیلانی)

عورتوں پر پابندی انسانی حقوق کے منافی تھی، اب خواتین ملک کا پرچم بلند کریں گی۔

(مہناز رفیع)

اب ان بیانات کی ذرا تفصیل ملاحظہ کیجئے:

لاہور (جنگ فورم رپورٹ) کھیلوں کے وفاقی وزیر قادر بخش میلہ کی جانب سے اس اعلان "پاکستانی خواتین کو ملک اور بیرون ملک مقابلوں میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی ہے مگر

اس کے لئے ان کو خاص قسم کا لباس زیب تن کرنا ہوگا"۔ پر اظہار خیال کرتے ہوئے مفتی محمد
حسین نعیمی نے کہا کہ کتاب و سنت کی تعلیمات کے پیش نظر خواتین کے لئے پردہ واجب
ہے، خواتین کی ٹریننگ میں مرد شریک ہوں یا تماشائی مرد ہوں یا ان کی نمائش مردوں کے
سامنے کی جائے تو یہ جائز نہیں۔ پھر یہ ہے کہ دور دراز کا سفر خواتین کے لئے جائز نہیں ہے۔
خواتین کی ٹیمیں جو باہر بھیجی جائیں گی، اس میں کئی اسلامی احکام سے انحراف ہوگا، کھیلوں کے
وفاقی وزیر کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کا مذاق اڑانے کی جو
بھونڈی کوشش کر رہے ہیں، اس کے نتائج کسی صورت بھی اچھے نہیں ہوں گے۔

چودھری غلام جیلانی نے کہا کہ اسلام مخلوط سوسائٹی کو ناپسند کرتا ہے، میں پیپلز
پارٹی کی حکومت سے کہوں گا کہ وہ اس وقت نازک پوزیشن میں ہے، وہ مسلمانوں کے مذہبی
جذبات کو چھیڑنے کی کوشش نہ کرے۔ ایسی صورت حال ان کے لئے سیاسی طور پر تباہ کن ہو
سکتی ہے۔

علامہ محمود احمد رضوی نے کہا کہ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں، مگر مذہبی نکتہ نگاہ سے
خواتین کا ایک ایسے اجتماع میں شرکت کرنا جہاں کفار اور مشرکین ہوں انتہائی نامناسب ہے،
اور کھیلوں میں خواہ کسی قسم کا لباس بھی پہن لیا جائے، اس میں جسم کی نمائش کو روکنا ناممکن
ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جب یہ خواتین ملک اور بیرون ملک کھیلوں میں حصہ لیں گی، تو لوگ
ان کو تحسین بھری نگاہوں سے دیکھیں گے، تالیاں بجائیں گے اور جواباً یہ خواتین تحسین
وآفرین پر شکریہ ادا کریں گی۔ یہ سارا عمل کتاب و سنت کی روشنی میں ناجائز اور حرام ہے۔

مہناز رفیع نے کہا کہ ہم اس اعلان سے خوش ہیں۔ کیونکہ خواتین نے اس کے لئے
جدوجہد شروع کر رکھی تھی کھیل انسان کی ذہنی نشوونما کا باعث بنتے ہیں اور خواتین کی
کھیلوں میں شمولیت پر جو قدغن عائد تھی، وہ بنیادی طور پر انسانی حقوق اور خواتین کے حقوق
کے سراسر منافی ہے۔ اگر خواتین صرف اپنے ملک میں کھیلیں تو خوداعتمادی پیدا نہیں ہو

سکتی۔ بیرون ملک جانے سے ان میں خود اعتمادی پیدا ہو گی۔ ہمیں اس امر کا یقین ہے کہ پاکستان کی خواتین کھیلوں کے شعبہ میں بھی بین الاقوامی سطح پر ایک مقام حاصل کریں گی اور ملک کا پرچم بلند رکھیں گی۔

آپا نثار فاطمہ نے کہا کہ ضیاء الحق شہید کی حکومت میں انتہائی کوشش کے باوجود بھی لادین عناصر ایسا کرنے میں ناکام رہے تھے۔

حنا جیلانی ایڈووکیٹ نے کہا کہ عورتوں نے ہمیشہ اپنی تحریک میں اس حق کو واپس کرنے کا مطالبہ کیا تھا اور حکومت کا یہ صحیح فیصلہ ہے۔ اگر مردوں کو کھیلوں میں حصہ لینے کا حق ہے تو عورتوں کو اس سے محروم نہیں رکھا جانا چاہئے۔ ہمیں افسوس ہے کہ کچھ پراگندہ ذہن رکھنے والے افراد عورت کو ہمیشہ اس کے جسم اور خوبصورتی کے حوالہ سے دیکھتے ہیں، اس کے ہنر اور اس کی مہارت ان کے پیش نظر نہیں ہوتی۔ ان کا یہ طرز عمل تو غیر اسلامی ہو سکتا ہے۔ عورتوں کا کھیلوں میں حصہ لینا غیر اسلامی نہیں ہے۔

(جنگ لاہور۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۹ء صفحہ ۲ کالم ۱)

محترمہ بے نظیر کی جمہوری حکومت نے لوگوں کو جمہوری آزادیوں سے روشناس اور لطف اندوز کرنے کے لئے ٹیلی وژن سے چند یادگار پروگرام نشر کئے۔ شاید یہ بہت بڑے پیمانے پر تبدیلی لانے کی ادنیٰ کوشش تھی۔ تاکہ پاکستانی مسلمانوں کی غیرت اسلامی کو آزمایا جائے۔ مگر بحمد اللہ ان پروگراموں کی نہ صرف عام لوگوں، پریس اور علماء کرام نے مذمت کی بلکہ قومی اسمبلی میں بھی اس پر آوازیں اٹھیں، حتیٰ کہ خود "وزیر اعظم بے نظیر بھٹو" کو کہنا پڑا کہ "اس نوعیت کے پروگرام پیش نہ کئے جائیں جن پر ملک کے عوام رد عمل ظاہر کریں"۔

ان پروگراموں میں "میوزک ۸۹ء" اور "دھنک" پر "ہفت روزہ تکبیر" کراچی ۶ جولائی ۱۹۸۹ء نے یوں عنوان قائم کر کے لکھا۔

”میوزک ۸۹ء“ اور ”دھنک“ ایسے پروگرام ہیں جن کی بدولت پیپلز پارٹی کا دور ہمیشہ یاد رکھا جائے گا

چونکہ ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ”نازیہ حسن اور زوہیب حسن“ کے ایک ساتھ گانے پر پابندی لگا دی گئی تھی (یہ دونوں گلوکار سگے بہن بھائی ہیں)۔ میوزک ۸۹ء کے پروگرام کے لئے ان دونوں گلوکاروں کو خاص طور پر دعوت دی گئی تھی۔ ہفت روزہ تکبیر اس پروگرام کے متعلق یوں رقم طراز ہے۔

”جب پروگرام شروع ہوا تو نہ صرف پروڈیوسر (شعیب منصور) نے کمالات دکھائے بلکہ دونوں بہن بھائی (نازیہ حسن، زوہیب حسن) نے مل کر خوب گانے گائے۔ پھر نہایت تیز موسیقی کا اہتمام کیا گیا، لاہور اور اسلام آباد سے پاپ میوزک کے باکمال گلوکار مدعو کئے گئے۔ پروگرام میں ماڈرن لڑکوں، لڑکیوں کی بڑی تعداد شامل کی گئی۔ ہال میں موجود یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بن ٹھن کر بہک رہے تھے۔

جب بھی نازیہ حسن اور زوہیب حسن یا کوئی اور سنگر گاتا، یہ لڑکے لڑکیاں جھومنے لگتیں رقص کے مظاہرے ہونے لگتے، سب لڑکے لڑکیاں ایک قطار میں مل کر لہراتے، یوں لگتا تھا جیسے پروگرام اسلام آباد سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ لندن یا نیپلز کی شام کا کوئی منظر ہے۔ جہاں اسٹیج اور ہال میں لڑکے، لڑکیاں تھرک رہے ہیں گا رہے ہیں، تیز موسیقی کے شور اور جلتی بجھتی روشنیوں نے جذبات کا طوفان گرم کر دیا ہے، یہ تھا ”میوزک ۸۹ء“ پیپلز پارٹی کے نئے دور کا پہلا پروگرام۔

مسلمانوں کی طرف سے بڑے پیمانے پر مذمت کے نتیجے میں اگرچہ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کی طرف سے آئندہ ایسے پروگرام پیش نہ کرنے کا کہنا پڑا تھا، مگر بہر حال یہ محض ایک ”اخباری بیان“ تھا کیونکہ عملاً پروگراموں میں اس کے بعد مزید تیزی آگئی۔

اس کے بعد دوسرا پروگرام جو پیش کیا گیا وہ "دھنک" تھا۔

یہ بھی موسیقی کا پروگرام تھا یہ کراچی سینٹر کی پیش کش تھی۔ پروڈیوسر "سلطان صدیقی" نے پروگرام کی ترتیب یوں رکھی، کہ عام ماڈرن لڑکے لڑکیوں کے بجائے اپنا پروگرام سجانے کے لئے مشہور فن کاروں، فن کاراؤں اور موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کو مدعو کیا۔ چنانچہ جب بھی کوئی گلوکار یا گلوکارہ گانا گاتی تمام مدعو کئے گئے مرد اور عورتیں جھومنے لگتے، وہ سب ایک ہی نشست میں یا دو نشستوں میں ساتھ ساتھ بٹھائے جاتے۔ مرد وزن کی تفریق ختم کردی گئی، اس لئے ان کے جھومنے تالیاں بجانے کا منظر ہی اور تھا۔ ایک اور ترکیب ابتدا میں یہ استعمال کی گئی کہ پروگرام کے آخر میں پاکستان سے محبت اور حب الوطنی کے موضوع پر گانے کا اہتمام کردیا جاتا، اور پھر تمام فنکار، فنکارائیں مل کر اور مکس اپ ہوکر گاتیں اور یوں "میوزک ۸۹ء" کا ریکارڈ بھی مات ہوا۔

(ہفت روزہ تکبیر کراچی۔ ۶ جولائی ۱۹۸۹ء، صفحہ ۲۶)

پاکستان میں مروجہ جمہوریت کا ننگ انسانیت ثمرہ

پاکستان میں جمہوری دور کے شروع ہوتے ہی حکمران طبقے نے جو پالیسی اختیار کی اس کا نچوڑ یہ ہے کہ ایک تو عوام کو جمہوری آزادیوں سے روشناس کرانا اور اس پر عملاً گامزن کرانا تھا۔ دوم صدر ضیاء الحق مرحوم کے گیارہ سالہ دور کے ہر قول وفعل سے عوام کو متنفر کرنا تھا۔ اسی سلسلے میں "حدود آرڈیننس" اور "قانون شہادت" جیسے منصوصات تک کو بھی ہدف تنقید بنایا گیا۔

اس کے نتیجے میں پاکستانی عورت نے مساوات مرد وزن کے وہ فحش اور حیا سوز مطالبے شروع کئے، جس کا مطالبہ جمہوریت اور مساوات کے موجد (یورپ) نے بھی آج تک شاید نہ کیا ہوگا۔

روزنامہ ملت لندن ۱۲ نومبر ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں پاکستان کی ایک اداکارہ "انیتا ایوب" کا بیان نقل کیا گیا کہ:

"مجھے معاشرے میں خواتین پر مردوں کی برتری پسند نہیں، خواتین کو مردوں کے مساوی آزادی ملنی چاہئے اگر ایک مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے، تو اسی طرح عورت کو بھی چار شادیوں (چار خاوندوں سے بیک وقت نکاح کرنے کی) اجازت ملنی چاہئے۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی سمجھتی ہوں کہ عورت کو اپنے شوہر کی بات سننی چاہئے"۔

(بحوالہ ماہنامہ الفاروق کراچی۔ صفحہ ۳۲ فروری ۱۹۹۰ء)

نیز یہی مضمون بعینہ ملک کے "اخبارات" جنگ وغیرہ نے بھی شائع کیا "انیتا ایوب" کے اس بیان پر نہ صرف علما کرام اور دیندار مردوں نے انیتا کی مذمت کی، بلکہ دیندار عورتوں نے بھی ان کی مذمت کی حتیٰ کہ ڈاکٹر اسلم نے "انیتا ایوب" کو اپنے بیان پر معافی مانگنے کے لئے قانونی طور پر نوٹس بھی جاری کیا، لیکن یہ سب کچھ واویلا چونکہ دین جمہوریت کے قانون آزادی کی نفی تھا، اس لئے اس کے مقدر میں "صدا بصحرا" ہونا ہی تھا۔

بلکہ اس قسم کے غیر جمہوری مطالبے کرنے والوں کو محترمہ وزیرا عظم بھٹو نے بڑی جرأت اور وضاحت سے ہمدردانہ طریقے سے سمجھایا جس پر "نوائے وقت" کے اداریہ میں مندرجہ ذیل عنوان قائم کیا گیا ہے۔

یہ نظریہ درست نہیں

وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے کراچی میں "یہ آپ کی دنیا ہے" کے پروگرام میں بی، بی، سی سننے والوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے "مذہب فرد اور خدا کے درمیان براہ راست معاملہ ہے اور اس میں حکومت کو مداخلت کا حق نہیں پہنچتا"۔

یہ نظریہ اسلام کی آفاقی تعلیمات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ غیر اسلامی اور

کلیسائی تمدن میں تو یہ نظریہ بڑا دلکش محسوس ہوگا، مگر اسلام اس طرح کے "تجدد" کی ہرگز حوصلہ افزائی نہیں کرتا اور پاکستان کے رہنما اگر دین کی تعلیمات کے بارے میں اظہار خیال بہت ضروری سمجھیں تو انہیں ایسی رائے دینی چاہئے جو دینی افکار کے منشاء کے منافی نہ ہو۔

(اداریہ نوائے وقت۔ ۷ مارچ ۱۹۸۹ء)

پاکستانی عورت کی بے پردگی پر بھارتی خاتون کی شرمندگی

پاکستان میں کرکٹ میچ دیکھنے کے لئے جالندھر (بھارت) سے آنے والی ایک خاتون "کلدیپ فتح سنگھ" نے نمائندہ "زندگی" کے سوال کے جواب میں کہا:

"میں نے شدت سے جو بات محسوس کی وہ یہ کہ میری نظر اسلامی معاشرے کی اس عورت کو تلاش کرتی رہی، جو اسلامی تاریخ کے صفحۂ قرطاس پر ایک اعلیٰ کردار، عزت وعصمت اور پردے کی دلدادہ تھی، اور جس کی اسلام سے والہانہ محبت اور اسلامی قدروں سے گہری وابستگی تھی، مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ یہاں کی عورت فیشن میں یورپ کے شانہ بشانہ چل رہی ہے۔ ہم خود کو تو اس سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں، کیونکہ ہندوؤں اور سکھوں کے یہاں پردے کا اتنا اہتمام شروع ہی سے نہیں، لیکن مسلمانوں کے ہاں تو شروع ہی سے پردے کی خاص اہمیت رہی ہے۔ مجھے یہاں آکر ایسا لگا جیسے اکثر پاکستانی عورتوں نے پردے کے خلاف بغاوت کردی ہے۔ میں آٹھ دس سال پہلے بھی آئی، لیکن اس وقت اور آج میں نمایاں فرق محسوس ہوا۔ اُس وقت پاکستانی مسلمان عورت کو اس طرح کھلے بندوں پردے سے بے نیاز نہیں دیکھا تھا۔ آج کی عورت کو دیکھ کر تو عقل حیران رہ گئی۔ اگر میری بات کا برا نہ مانیں تو مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ پاکستانی عورت کا ایک طبقہ مغربی تہذیب کی پرورش میں گھرا ہوا ہے۔ ایک اسلامی ملک کی عورت کو ایسا نہیں کرنا چاہئے، مجھے تو کم از کم عورتوں کو ایسے بے باکانہ انداز میں پھرتے دیکھ کر شرم محسوس ہوتی ہے"۔ (بحوالہ ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک

مارچ ۱۹۹۰ء صفحہ ۶)

حیا سر پیٹتی ہے عصمتیں فریاد کرتی ہیں

بے شک یورپ میں انسان اور کتیا کی شادی واقعتاً ننگ انسانیت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے مگر پاکستان جیسے خالص نظریاتی اور اسلامی ملک جسے "اسلام کا قلعہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس میں عورت کا چار خاوندوں سے بیک وقت ازدواجی تعلق کا مطالبہ حیا سوزی اور عصمت و عفت کے خلاف بغاوت میں یورپ سے سبقت نہیں تو اور کیا ہے؟

ایک رقاصہ اور بازاری عورت کا مسلمان شریف زادیوں کو طعنہ

رسالہ "جدوجہد" لاہور کا تراشہ ملاحظہ فرمایئے جس میں ایک رقاصہ نے اب کے ترقی یافتہ آرٹ اور ثقافت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے:

"میں ایک رقاصہ ہوں، ایک طوائف ہوں، آج بھی مجھے معاشرے میں بری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ہم نے ہندوستان کی بڑی بڑی سلطنتوں کے وارث پیدا کئے ہیں۔ ہمیں نوابوں، راجاؤں، بادشاہوں اور امراء کی عیش و عشرت کے لئے لایا گیا، لیکن ہم نے اپنے فن کے کمال سے انہی ریاستوں میں حکمران بن کر حکومت کی۔ چنانچہ آج بھی ہمارے بھائی بند کئی جاگیروں کے مالک ہیں، ہمیں کوئی نہیں بتلا سکا کہ ہمارا مقصود کیا ہے؟ لیکن جو شریف زادیاں آج کلبوں اور نجی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہیں، اپنے جسم کی عریانی سے کشش پیدا کرتی ہیں اور ان کا ناچ گانا اور ڈراموں میں کام کرنا، ایک ثقافتی پروگرام بن گیا ہے۔ کالجوں اور اسکولوں میں دختران ملت کو ہمارے انداز پر سب کچھ سکھایا جاتا ہے جو آرٹ بن گیا ہے۔ بڑے بڑے ماڈرن اور فیشن پرست رئیسوں کے گھروں میں وہی ٹھیکے، وہی سارنگی اور طبلے نظر آئیں گے۔ دختروں، بہنوں اور بیویوں کو میوزک ماسٹر تعلیم دینے گھر آتے ہیں۔ پھر ہمارے اور ان رئیسوں کے درمیان امتیاز کیوں؟

وہ بھی وقت تھا، جب فیشن ہمارے گھروں سے نکلتا تھا، مگر اب ہم شریف زادیوں کی نقل کرنے پر مجبور ہیں۔ کیا کوئی بتائے گا کہ کلچرل پروگراموں میں حصہ لینے والی لڑکیوں اور طوائفوں میں کیا فرق ہے؟

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات

مغربی جمہوریت دیار مغرب میں جس اخلاق سوزی اور انسانیت سوزی کا کردار ادا کر چکی ہے، جس کی بنیاد ہی مذہب سے بیزاری پر ہے کیا اہل مشرق اسی کو سینہ سے لگا کر بدبختی، تنزل اور بے حیائی کی منزل تک نہیں پہنچے؟ کیا ایک رقاصہ اور طوائف کا مسلمان شریف زادیوں کو طعنہ اور کلدیپ فتح سنگھ کا پاکستانی عورت کی بے پردگی پر تبصرہ مسلمانان پاکستان کے منہ پر شرم اور رسوائی کا عبرت انگیز طمانچہ نہیں؟ یہ بے خدا تہذیب ہمیشہ اہل مذہب اور شرافت و حمیت، حیا اور عفت کی اقدار کے ساتھ نبرد آزما رہی ہے۔

باب چہارم

دین جمہوریت کی حقیقت قرآن کریم کے آئینہ میں

دین اسلام میں کلمہ طیبہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" عنوان ہے، اس عہد و پیمان کا کہ زمین و آسمان میں اقتدار اعلیٰ، حاکمیت، شارعیت اور قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر پیغام خداوندی پہنچانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے سوا کسی کو حاکمیت شارعیت اور تحلیل و تحریم کا مقام حاصل نہیں، کلمہ طیبہ کے اس عنوان کی مفصل تشریح اور بیان قرآن و سنت میں موجود ہے۔

اسلام کا اجمالی ایمان اور حقیقت

اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت کا زندگی اور کائنات کے کسی ایک شعبے، یا کسی ایک زمانہ میں انکار کرنا یا اس میں کسی غیر کی شرکت کا اعتقاد رکھنا صریح کفر اور شرک ہے، جس میں شک کرنا بھی کفر ہے۔ چند آیات قرآنی ملاحظہ فرمایئے تاکہ بات واضح اور روشن تر ہو جائے۔

قولہ تعالیٰ: وهو الذى فى السماء اله وفى الارض اله وهو الحكيم العليم○ (پارہ:۲۵، زخرف، آیت:۸۴)

"وہی اکیلا آسمان میں بھی واجب الاطاعت ہے اور زمین میں بھی واجب الاطاعت ہے اور وہی حکمت والا ہے اور جاننے والا ہے"۔

دین جمہوریت نے دنیاوی زندگی میں جو خدائی کی نفی کی ہے، اس آیت میں اس اساسی عقیدے کا صراحت کے ساتھ ابطال ہے۔ دین اسلام اور دین جمہوریت کے ان

دونوں نظریوں میں سے کسی ایک پر ایمان لانا دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ان الحکم الا اللہ امر الا تعبدوا الا ایاہ ذالك الدین القیم ۝

(پارہ: ۱۲، سورہ یوسف، آیت: ۴۰)

"حکم صرف اللہ ہی کے لئے ہے، اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو یہی دین حق ہے"۔

تیسری جگہ ارشاد ہے:

قل یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمة سَوَآءٍ بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرك به شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشهدو ابانا مسلمون ۝

(پارہ: ۳، آل عمران، آیت: ۶۴)

"کہہ دیجئے اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے بعض۔ بعض کو اللہ کے سوا خدا نہ بنائے اگر وہ اس بات کے ماننے سے انکار کریں، تو کہدو کہ گواہ رہو کہ ہم تو صرف خدا کا حکم ماننے والے ہیں"۔

عن عدی بن حاتمؓ انه لما نزلت هذه الآية قال: ما کنا نعبدهم یا رسول اللہ فقال صلی اللہ علیه وسلم اما کانوا یحللون لکم ویحرمون فتاخذون بقولهم؟ قال نعم فقال علیه السلام: هو ذاك. (روح المعانی۔ جز:۳، صفحہ: ۱۹۳)

تشریح: اس آیت کریمہ اور حدیث نبوی سے ثابت ہوا کہ جب بعض انسان خدا

کی شریعت کے خلاف انسانوں کے لئے قوانین بناتے ہیں، اور دوسرے انسان بہ رضا و رغبت
اسے قانون کا درجہ دے کر اس کو معمول بناتے ہیں، تو گویا کہ قانون بنانے والوں نے اپنے
آپ کو مقام ربوبیت پر فائز کیا اور ان کے قوانین کو درست سمجھ کر ان پر عمل کرنے والوں
نے گویا کہ بنانے والوں کو رب مانا اور ان کی بندگی شروع کی۔

اقتدار اعلیٰ اور طاقت کا سرچشمہ

وهو القاهر فوق عباده○ (الانعام۔ آیت:۶۱)

"اللہ بندوں پر غالب ہے"۔

والله غالب علی امره○ (یوسف۔ آیت:۲۱)

"اللہ اپنے کاموں میں غالب ہے"۔

ملك الناس○ (الناس۔ آیت:۲)

"اللہ تمام انسانوں کا مالک، فرمانروا ہے"۔

مالك الملك○ (آل عمران۔ آیت:۲۶)

"مملکت عامہ کا فرمانروا، شاہنشاہ ہے"۔

الملك القدوس○ (الحشر۔ آیت:۲۳)

"مقدس حکمران ہے"۔

فتعال الله الملك الحق○ (طٰہٰ۔ آیت:۱۱۴)

"فرمانروائے اعلیٰ و برحق ہے"۔

احكم الحاكمين○ (ھود۔ آیت:۴۵)

"حکمرانوں کا حکمران ہے"۔

خير الحاكمين○ (الاعراف۔ آیت:۸۷)

"سب سے اچھا حکمران ہے"۔

فالحکم لله العلی الکبیر ○ (المومن۔ آیت:۱۲)

"حکمرانی اللہ ہی کے لئے ہے جو بالادست اور بڑا ہے"۔

والله یقضی بالحق ○ (المومن۔ آیت:۲۰)

"اور اللہ ہی انصاف کا فیصلہ کرتا ہے"۔

والله یحکم لا معقب لحکمه ○ (الرعد۔ آیت:۴۱)

"اللہ حکمرانی کرتا ہے کوئی اس کے حکم کو معطل کرنے والا یا اس میں ترمیم کرنے والا نہیں"۔

رب العرش العظیم ○ (یونس۔ آیت:۱۲۹)

"عرش عظیم کا فرمانروا"۔

رب العالمین ○ (الفاتحہ۔ آیت:۱)

"فرمانروائے عالم"۔

نوٹ: رب ایک خاص مفہوم کے لحاظ سے فرمانروائے عالم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔(روح المعانی۔ جلد ا، صفحہ:۳۰۷۔ البحر المحیط جلد ا، صفحہ ۱۸)

قصہ مختصر:

اس قسم کی سینکڑوں آیات قرآنی ہیں جن میں تصریح ہے کہ اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت اور طاقت کا سرچشمہ صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف حکم کرنے والوں کا حکم

زندگی گذارنے اور زندگی کے مختلف امور سدھارنے کے لئے قوانین دو طرح کے ہو سکتے ہیں جس میں تیسری قسم کی گنجائش نہیں ہے خواہ کوئی حاکم کی حیثیت رکھتا ہو یا محکوم

کی۔

اگر کوئی فرد یا گروہ، دل کے یقین، زبان کے اقرار اور عمل کی تصدیق سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت، وحدانیت، مالکیت اور حاکمیت اور مقنن و شارع ہونے کو ثابت کرتا ہے، اور کسی بھی غیر کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مذکورہ صفات میں شریک نہیں بناتا تو یہ شخص مومن اور مسلم ہے اور اس کا دین اسلام اور شریعت ہے۔

اور اگر کوئی فرد یا گروہ دل کے یقین، زبان کے اقرار اور عمل کی تصدیق سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت، وحدانیت، مالکیت اور مقنن و شارع ہونے کی کلی طور پر یا جزوی طور پر نفی کرتا ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ کیلئے باقی صفات سب ثابت کرتا ہے، مگر "قانون سازی اور حکمرانی" کی صفت اللہ تعالیٰ سے نفی کرتا ہے۔ یا یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ موجودہ ترقی کے دور کے لئے اللہ تعالیٰ کی حکمرانی یعنی نظام اسلام اور شریعت اسلامی ناقابل عمل غیر مفید اور ترقی اور فلاح کے لئے رکاوٹ ہے اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے مقابلے میں فلاں انسانی نظام اور حاکمیت بہتر ہے اور باعث ترقی اور فلاح ہے، تو ایسا شخص یا گروہ قرآن کی نظر میں کافر، ظالم، فاسق اور طاغوت کی حکمرانی ماننے والا اور اس کی بندگی کرنے والا ہے، اگرچہ یہ شخص نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تلاوت و تسبیح، تہجد و تصدق کا پابندی سے اہتمام کرتا ہو، جشن قرآن اور عید میلاد النبی علیہ السلام کا بڑی دھوم دھام سے انتظام کرتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔

البتہ اگر کوئی فرد یا گروہ دل کے یقین اور زبان کے اقرار سے حاکمیت، قانون سازی اور حکمرانی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرتا ہے، اور ہر دور کے لئے درست اور موزوں سمجھتا ہے۔ اللہ اور اس کے دین اسلام کے سوا باقی جملہ ادیان اور نظاموں کی قانون سازی اور حاکمیت کو باطل سمجھتا ہے، مگر اس کے باوجود کسی حقیقی عذر کے تحت عملی طور پر اللہ تعالیٰ کے قانون اور حکم کے برخلاف کسی دوسرے قانون اور نظام کے تحت حاکم یا محکوم کی حیثیت سے زندگی گذار رہا ہے، تو اسے کم از کم کافر نہیں کہا جائے گا۔

ہاں ایسے افراد اور گروہ پر شرعاً فرض ہے کہ نظام اسلام اور اللہ کی حاکمیت کے لئے مقدور بھر جد و جہد کریں۔

قولہ تعالیٰ: ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون○

(المائدہ۔ آیت: ۴۴)

"اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں سو وہی لوگ کافر ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظالمون○

(المائدہ۔ آیت: ۴۵)

"اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے موافق فیصلہ نہ کریں سو وہی لوگ ظالم ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون○

(المائدہ۔ آیت: ۴۷)

"اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون پر فیصلہ نہ کریں سو وہی فاسق ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: فلا وربك لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما○ (النساء۔ آیت: ۶۵)

"سو تیرے رب کی قسم یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہونگے جب تک کہ اپنے آپس کے معاملات میں تجھے (اے پیغمبر) حکمران نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ بسر و چشم اسے قبول کرلیں"۔

دین جمہوریت کی حکمرانی قرآن کی نظر میں

دین اسلام کے حکم کے برخلاف کسی بھی معاملہ میں کسی بھی دین اور قانون کے مطابق جان بوجھ کر بہ رضا ورغبت حکم کرنا یا حکم تسلیم کرنا اور پھر بھی اپنے آپ پر مومن اور مسلم ہونے کا زعم کرنا "این خیال است و محال است و جنون"۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

الم تر الی الذین یزعمون انھم آمنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ ویرید الشیطان ان یضلھم ضلالا بعیدا○ واذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللہ والی الرسول رایت المنفقین یصدون عنک صدودا○ (پارہ۔ النساء، آیت:۶۰،۶۱)

"اے نبی کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے، اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر وہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت کے قانون پر کرائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے، کہ طاغوت کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں گمراہی میں دور جا ڈالے اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ قانون اور رسول کی طرف آؤ، تو تو منافقوں کو دیکھے گا کہ تجھ سے منہ موڑ لینگے"۔

قولہ تعالیٰ: فان تنازعتم فی شیءٍ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر○ (سورۃ النساء۔ آیت:۵۹)

"پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات پر تنازعہ ہو جائے، پس فیصلہ کے لئے اسے اللہ اور رسول "قانون اسلام" کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ پر اور قیامت

کے دن پر ایمان رکھتے ہو"۔

قولہ تعالیٰ: وارسلناك للناس رسولا وكفى بالله شهيدا ○ من يطع الرسول فقد اطاع الله ○ (سورۃ النساء۔ آیت:۸۰)

"ہم نے تجھے لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا اور (یہی) اللہ کی گواہی کافی ہے، جس نے رسول کا حکم مانا اس نے اللہ کا حکم مانا"۔

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ دین اسلام کے علاوہ تمام ادیان ومذاہب مردود ہیں۔

دین اسلام کے مقابلے میں دین جمہوریت اپنانا عقل کی نظر میں

کیا اللہ اور رسول ﷺ کے ماننے والوں کے لئے صرف اتنی بات بطور دلیل کافی نہیں، کہ دین اسلام کے قوانین اور نظام زندگی اللہ تعالیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا پسندیدہ نظام ہے۔ اور دین جمہوریت کا نظام خدا اور رسول کے دشمنوں کا بنایا ہوا نظام ہے۔ جس کا محرک اور بنیادی عامل خدا سے بیزاری، شہوت پرستی اور نفس پرستی ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

افحكم الجاهلية يبغون ومن احسن من الله حكما لقوم يوقنون ○

(سورۃ المائدہ۔ آیت:۵۰)

"پس کیا یہ لوگ جاہلیت کی حکمرانی چاہتے ہیں، حالانکہ ایمان والوں کے لئے اللہ سے بہتر حکمران "فیصلہ کنندہ" کون ہو سکتا ہے؟"

افغير دين الله يبغون وله اسلم من في السموات والارض طوعا وكرها واليه يرجعون ○ (سورہ آل عمران۔ آیت:۸۳)

"کیا (یہ لوگ) اللہ کے قانون کے سوا کوئی اور قانون تلاش کرتے ہیں

حالانکہ جو کوئی آسمان وزمین میں ہے، خوشی سے یالاچاری سے سب اس کے قانون کے تابع ہیں اور اسی کی طرف لوٹائے جائینگے"۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخسرین ٥ (سورہ آل عمران۔ آیت:۸۵)

"اور جو کوئی اسلام کے سوااور کوئی قانون چاہے، تو اس سے ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا"۔

واضح رہے کہ ترجمہ میں لفظ "دین" کا ترجمہ جو میں نے قانون سے کیا ہے خود قرآن کریم نے لفظ (دین) کو اسی مفہوم میں استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کے بھائی پر جب چوری کا دعویٰ کیا گیا، تو بھائیوں نے عرض کی کہ اگر چوری ثابت ہوئی تو اس کے عوض میں چور، مالکِ مال کا غلام بنے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بادشاہ مصر کے قانون میں چوری کی یہ سزا نہ تھی مگر ہم نے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی زبان سے تجویز کرا کر یوسف علیہ السلام کی مقصد براری کے لئے راہ ہموار کی۔

قولہ تعالیٰ: ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک ٥

(سورۃ یوسف۔ آیت:۷۶)

"بادشاہ کے قانون میں تو یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو ہر گز نہیں لے سکتا تھا"۔

(ترجمہ احمد علی لاہوری)

رئیس المفسرین علامہ آلوسی رحمہ اللہ اپنی مشہور تفسیر میں لکھتے ہیں:

(ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک) ای فی سلطانہ علی ماروی عن ابن عباس او فی حکمہ وقضائہ کما روی عن قتادۃ. (روح المعانی جلد ۷، جز ۱۳، صفحہ ۲۹)

"بادشاہ کے قانون کے مطابق وہ اپنے بھائی کو نہیں لے سکتے تھے، ابن عباس دین کا ترجمہ حکومت (حکمرانی) کرتے ہیں۔ حضرت قتادہ اس کا ترجمہ "قانون" کرتے ہیں"۔

دین جمہوریت شرک ہے

دین جمہوریت کا اصل اور بنیادی مقصد عوام کی حکمرانی ہے، اور اس بات سے کسی سخت ضدی اور ہٹ دھرم کو بھی انکار نہیں ہے۔ بلکہ جمہوریت کی بین بجانے والے بڑے فخر سے اپنی تقریروں اور تحریروں میں یہی رٹ لگاتے پھرتے ہیں کہ ہم عوام کے لئے مکمل آزادی اور حکمرانی چاہتے ہیں، چونکہ جمہوریت کی بندگی کرنے والے مذکورہ آزادی اور حکمرانی کے لئے کوئی قید نہیں لگاتے اور نہ ہی کسی حد بندی کا ذکر کرتے ہیں، اس لئے مذکورہ آزادی اور حکمرانی کا دائرہ صرف انسانی آمریت اور ڈکٹیٹر شپ تک محدود نہیں، بلکہ اس کی زد میں اللہ تعالیٰ کی حکمرانی بھی آتی ہے۔ چنانچہ دین جمہوریت کا بنیادی فلسفہ اور تاریخ سے باخبر لوگ اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں کر سکتے، کہ دین جمہوریت کا اصل مقصد انسانی آمریت کا حصول اور مذہبی اقتدار سے گلوخلاصی اور نجات حاصل کرنا ہے۔

لہٰذا یہ بات کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ دین جمہوریت کی مذکورہ آزادی اور عوام کی حکمرانی سے مراد، جیسے کہ انسانی آمریت سے آزادی اور شخصی حکمرانی کے مقابلے میں عوامی حکمرانی ہو سکتی ہے، ویسے ہی خدائی حکمرانی سے آزادی اور خدائی حکمرانی کے مقابلے میں عوام کی حکمرانی بھی ہے۔ اور یہی قرآن کا فیصلہ ہے۔

ام لهم شركاء شرعوا لهم من الدين ما لم ياذن به الله ○

(سورۃ الشوریٰ۔ آیت: ۲۱)

"کیا ان لوگوں کے اور شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے زندگی گذارنے کا وہ قانون ایجاد کیا ہے، جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی"۔

تشریح: دیکھئے یہاں اللہ تعالیٰ نے شریعت اسلام کی جگہ زندگی گذارنے کے لئے کسی اور قانون بنانے والوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ قانون سازی میں (شرکاء) شریک ہونے کا

نام دیا ہے، پس لامحالہ ایسے قوانین کی پیروی کرنے والوں کا یہ عمل شرک ہوا۔

قولہ تعالیٰ: ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ ذالک الدین القیم ○ (سورۂ یوسف۔ آیت: ۴۰)

"حکمرانی صرف اللہ کے لئے ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے (یعنی اس کے حکم کے مقابلے میں کسی کا حکم نہ مانا جائے) یہی زندگی گذارنے کا سیدھا قانون ہے"۔

تشریح: یہاں اللہ تعالیٰ نے تعمیل حکم کو عبادت کا نام دیا ہے، پس جو کوئی اللہ تعالیٰ کے احکامات اور قوانین کی تعمیل کرتا ہے، وہ اللہ کی عبادت کرتا ہے اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے احکامات اور قوانین کے مقابلے میں غیر اللہ کے احکامات اور قوانین کی اطاعت اور تعمیل کرتا ہے وہ غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ ○ (سورہ آل عمران۔ آیت: ۶۴)

"کہہ دیجئے! اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے۔ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے بعض، بعض کو اللہ کے سوا رب نہ بنائیں"۔

عن عدی بن حاتم انہ لما نزلت ھذہ الآیۃ قال: ما کنا نعبدھم یا رسول اللہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم اما کانوا یحللون لکم ویحرمون؟ قال نعم فقال علیہ السلام ھو ذالک۔ (روح المعانی۔ جلد ثالث، صفحہ ۱۹۳)

"حضرت عدی ابن حاتم سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم نے

عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ ہم میں سے بعض تو بعض کی عبادت نہیں کرتے تھے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تمہارے بعض تمہارے لئے بعض چیزیں حلال اور بعض حرام نہیں بناتے تھے؟ تو عدی نے کہا ایسا تو تھا پس حضور ﷺ نے فرمایا یہی تو رب بنانا ہے"۔

تشریح : دیکھئے یہاں حلال اور حرام یعنی جائز اور ناجائز ثابت کرنے کا مقام اس ذات کے لئے ہے، جو مقام ربوبیت اور الوہیت پر فائز ہو پس کسی انسان کے لئے یہ مقام ثابت کرنا درحقیقت اس کو رب بنانا ہے جو کہ صریح شرک ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمود مرحوم لکھتے ہیں:

"اگر کوئی یہ کہدے کہ حاکم اللہ کے سوا عوام ہیں تو اس نے اللہ کی ذات میں شرک کیا اور اللہ کا شریک غیر اللہ کو تسلیم کر لیا"۔ (آذان سحر۔ صفحہ ۱۱۹)

دین جمہوریت کے متعلق مولانا مفتی محمودؒ کی رائے

دین جمہوریت کے بارے میں سب سے پہلے میرے شیخ، صدر پاکستان قومی اتحاد، سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد، مفکر اسلام، قائد جمعیت علماء اسلام، مفتی اسلام، حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہ کی رائے گرامی ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت مفتی محمود رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بن سکے گا، یہ بات میں سمجھتا ہوں کہ ایک دھوکہ ہے، اس لئے کہ بنیادی حقوق کی دفعات اس کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً ان دفعات میں مذہبی آزادی کے عنوان میں وضاحت سے کہا گیا ہے، کہ پاکستان کے ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو مذہب اور عقیدہ چاہے قبول کر سکتا ہے۔ اس میں گویا مسلمان کو عیسائی، یہودی، ہندو اور مرزائی بننے کا حق دیا گیا ہے۔ مرتد ہونے کی اجازت دی گئی ہے۔ جبکہ اسلامی قانون سازی کہتی ہے۔

من بدل دینہ فاقتلوہ۔

چنانچہ اسلامی قانون کے تحت اگر اس ہاؤس میں (اسمبلی ہال میں) ہم قانون سازی کا کام شروع کریں تو ایسے شخص کیلئے قتل مرتد کی سزا تجویز کریں گے اس لئے کہ اللہ کا ارشاد ہے

انما جزآء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف۝

اسی طرح حدیث شریف میں ہے۔ من بدل دینہ فاقتلوہ۔ جس نے اپنا دین بدل دیا اسے قتل کردو۔

قرآن اور سنت کی اس تصریح کے باوجود ہم اب یہ (قرآنی سزا) سزا تجویز نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ آپ (برسر اقتدار طبقہ) نے آزادی مذہب کے نام سے اسے آئین میں حق دے دیا ہے۔ جبکہ مسلمان کے لئے سب سے عظیم جرم ارتداد ہے۔ زنا، شراب نوشی، سود خوری، ڈاکہ زنی کا جرم اس سے کم ہے، جب بڑے سے بڑے جرم پر (اسلامی سزا) سزا نہیں ہو سکتی تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ آئین کسی طرح اسلامی نہیں کہلا سکتا۔

(آذان سحر۔ صفحہ ۱۰۷)

یہاں حضرت مفتی محمود صاحب مرحوم نے ایک اہم علمی نکتے کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ جب کسی کلام یا تحریر کے ابتدائی پیراگراف اور انتہائی پیراگراف میں تعارض ہو، ان کے مفاہیم ایک دوسرے کے خلاف ہوں تو ترجیح آخری پیراگراف کو ہوگی اور آخری پیراگراف پہلے پیراگراف کے لئے ایک قید کی حیثیت رکھتا ہے۔

مثلاً کوئی شوہر اپنی بیویوں کو ایک معاہدہ لکھ کر دیتا ہے جس کا عنوان ہے:

۱۔ تم میں سے کسی ایک کو بھی ہرگز طلاق نہیں دی جائیگی۔

۲۔ تم میں سے جو کوئی بھی اپنی مرضی سے طلاق لینا چاہے تو لے سکتی ہے۔

دیکھئے یہاں نمبر (۱) اور نمبر (۲) پیراگرافوں کے مفہوم ایک دوسرے کے مخالف ہیں، مگر ترجیح پیراگراف نمبر (۲) کو دی جائیگی۔ یہی حال ہے اس دستور اور آئین کا کہ جس کے ابتدائیے میں تو ہو کہ قرآن اور سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنے گا، اور اس کے بعد دفعات میں کہا جائے کہ ملک کے ہر باشندے کو اپنی مرضی سے مرتد بننے کی نہ صرف اجازت ہوگی بلکہ یہ فرد کا حق ہے۔

یا یوں کہیے کہ آئین اور دستور کی ابتدا میں کہا جائے کہ ملک کے ہر شہری کے لئے ضروری ہوگا کہ قرآن اور سنت کے مطابق عقیدہ رکھے، مگر بعد کے دفعات میں کہا جائے کہ ملک کے ہر شہری کو بنیادی حق حاصل ہوگا کہ وہ جو بھی عقیدہ اور مذہب بہ رضا و رغبت اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے، مثلاً اگر وہ سود، زنا وغیرہ قطعی محرمات کو حلال سمجھے تو یہ اس کا حق ہے۔

یہ گویا مشرکین مکہ کا وہ تلبیہ ہے، جو طواف بیت اللہ اور حج کے دوران وہ پڑھتے تھے "لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک الا شریکا تملکه وما ملک" دیکھئے یہاں ابتدا میں خالص توحید کا اعلان اور اقرار کرتے ہیں، مگر انتہائے کلام میں وہ اللہ کے لئے اونی شریکوں (یعنی ایسے شریک جو خود مختار نہیں بلکہ اللہ کے مملوک ہیں) کے اثبات کا اعلان کرتے ہیں، لہٰذا ازروئے شریعت ان کے ابتدائی اعلان توحید کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ ان کے کلام کے آخری حصے کو معتبر سمجھا گیا اس لئے وہ موحد نہیں بلکہ مشرک ٹھہرائے گئے۔

جمہوریت کے بارے میں مولانا مودودی صاحب کی رائے

یہاں مولانا مودودی کی تحریر کا اقتباس دین جمہوریت پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے نقل کرنا قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث بنے گا۔

"اس دور میں وہی "لبرل ازم" جس نے پچھلی لڑائی جیتی تھی، نئے ہتھیاروں سے

مسلح ہو کر اٹھا اور اس نے سیاسیات میں جمہوریت کا تمدن و معاشرت، ادب واخلاق میں انفرادی آزادی کا اور معاشیات میں بے قیدی کا صور پھونکنا شروع کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ حکومت ہو یا اسٹیٹ یا سوسائٹی کسی کو بھی فرد کی سعی ارتقا اور سعی انتفاع میں رکاوٹیں عائد کرنے کا حق نہیں ہے۔ ہر شخص کو بالکل آزادی کے ساتھ یہ موقع حاصل ہونا چاہئے کہ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کو اپنے رجحانات کے مطابق استعمال کرے۔ اور جتنا آگے بڑھ سکتا ہے، بڑھتا چلا جائے خود سوسائٹی کے مفاد کی بھی بہترین خدمت اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اس کے ہر فرد کو غیر محدود آزادی حاصل ہو۔ ہر شعبۂ حیات اور ہر راہ عمل میں مکمل آزادی ہر خارجی رکاوٹ سے، ہر رسمی قید سے، ہر مذہبی واخلاقی بندش سے اور ہر قانونی یا اجتماعی مداخلت سے پوری آزادی حاصل ہو۔

اس طرح اس نظریہ کے حامیوں نے ہر طرف رواداری، بے قیدی، اباحیت، انفرادیت اور قصہ مختصر یہ کہ اپنی اصطلاح خاص میں "معقولیت" کو برسر کار لانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا"۔ (اسلام اور جدید معاشی نظام۔ صفحہ ۱۷ مولانا مودودی)

یہ ایک حقیقت ہے کہ دین جمہوریت، اصل معنی میں دین اباحیت ہے، جس میں از روئے دین و مذہب کوئی بھی فعل و عمل، عقیدہ اور نظریہ غیر مباح نہیں، بلکہ سب کچھ مباح ہے اور اس دین میں انسان گویا کہ شتر بے مہار ہے۔ جس کی قرآن صریحاً نفی کرتا ہے۔

ایحسب الانسان ان یترك سدی ○

(سورہ دہر۔ آیت: ۳۶)

"کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ اسے یوں ہی (شتر بے مہار کی طرح) چھوڑ دیا جائے گا"۔

باب پنجم

دین جمہوریت اور دین اسلام کا بنیادی فرق

بظاہر تو دین جمہوریت بڑے خوشنما اور دل آویز انداز میں دعویٰ کرتا ہے کہ جمہوریت ہی وہ واحد دین ہے، جو انسان کو انسانیت کا مقام دلاتا ہے اور انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلاتا ہے۔ جمہوریت ہی وہ دین ہے، جس نے ڈکٹیٹروں، آمروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور مذہبی اجارہ داروں اور ظالم سوسائٹی کے رسم ورواج کی وہ تمام زنجیریں توڑ ڈالی ہیں، جس میں بیچارہ انسان جکڑا ہوا چیخ رہا تھا، چنانچہ جمہوریت نے فرد کو اپنے نفس کا مالک بنا دیا ہے۔ اسے اپنے قول و عمل، اپنی خواہش وارادے اور اپنے مال و متاع کے لحاظ سے خود مختاری دلا دی اور یہ جمہوریت ہی ہے، جس نے انسانوں کے درمیان مساوات قائم کر کے فرد کے ہاتھ میں بنیادی حقوق کا منشور تھما دیا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ان دعوؤں میں حقیقت صرف اتنی ہے کہ بے شک جمہوریت نے انسان کو اللہ تعالیٰ کی غلامی سے مکمل آزادی اور نجات دلا دی ہے، مگر انسان کو انسان کی غلامی سے آزادی دلانے کا دعویٰ حقائق اور واقعات کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ ہر ایک آزادی کو عوام کے بنائے ہوئے قوانین کا پابند بنا دیا گیا ہے۔ اور یہ جمہوریت ہی ہے، جس نے قانون کے روپ میں انسان کو انسان کا بندہ اور غلام بنایا ہے۔

اس کے برعکس صرف اسلام ہی وہ دین ہے، جس نے انسان کو انسان کی غلامی اور بندگی سے آزادی دلا کر اسے اللہ تعالیٰ کی غلامی اور بندگی کا طوق پہنا دیا اور اسے عبدالانسان کی جگہ عبداللہ بنا دیا۔ اس مدعیٰ پر دلائل پیش کرنے سے پہلے لفظ عبد اور عابد کی وضاحت کرنا مناسب ہوگا۔

لفظ عبد، عابد اور عبادت کا مفہوم :

عبید بفتح اول و کسر ثانی بمعنی بندہ ہا و غلامان و این جمع عبد نیست بلکہ اسم جمع است کہ معنی جمع دارد۔ (غیاث اللغات فصل عین مہملہ مع بائی موحدہ صفحہ ۳۲۶)

"عبید حرف اول کے زبر اور دوسرے کے زیر سے اس کا معنی ہے بہت سے غلام اور یہ لفظ عبد کا جمع نہیں، بلکہ اسم جمع ہے جس میں معنی جمع کا ہے"۔

(العبد) الانسان حرا کان او رقیقا المملوك. (المنجد۔ صفحہ ۵۰۳)

"عبد اس انسان کو کہا جاتا ہے جو کسی کا مملوک ہو خواہ حقیقت میں آزاد ہو یا غلام"۔

(العابد) ایضافا، الخادم. (المنجد۔ صفحہ ۵۰۳)

"عابد بھی ایسا ہے جو کہ آقا کا خدمت گذار ہو"۔

لغات الحدیث کے امام جناب حضرت علامہ وحید الزمان مرحوم اپنی کتاب لغات الحدیث میں لفظ عبد کی یوں تشریح فرماتے ہیں۔

(عبد) بندہ اور غلام، عباد جمع ہے۔

علی کل حر او عبد من المسلمین صدقة.

(لغات الحدیث جلد ۴، صفحہ ۶، کتاب "ع")

"ہر آزاد اور غلام مسلمان پر صدقۃ الفطر واجب ہے"۔

وانت عبد العصا. (بحوالہ مذکورہ)

"تم کل کے دن دوسرے کے محکوم بنو گے"۔

ان لله ملائكة سياحين عبادتها كل دار فيها احمد او محمد.

(بحوالہ مذکورہ)

"اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے سیر کرتے پھرتے ہیں ان کی عبادت یہ ہے کہ جس گھر

میں احمد یا محمد نام والا ہو اس گھر کی حفاظت یا زیارت کرتے رہیں۔
ابو ھریرۃ ھذا عبدك. (لغات الحدیث جلد ۴، کتاب العین، صفحہ ۶، ۷)

ان درج بالا حوالہ جات سے یہ بتانا مقصود ہے، کہ از روئے لغت لفظ عبد حسب ذیل معنوں میں مستعمل ہے۔

غلام، مملوک، محکوم اور مخلوق۔ یہ آخری معنی مفردات میں ذکر ہے اور ان چاروں معنوں کے لحاظ سے از روئے دین اسلام انسان صرف عبداللہ ہے عبدالانسان نہیں ہے۔

نیز ان سے واضح ہوا کہ لفظ "عابد" اور "عبادت" کا مفہوم ہے "خادم" "فرمانبردار اور خدمت گذاری، فرمانبرداری" اس سے معلوم ہوا کہ آقا کے صرف چند احکامات کی بجا آوری کو عبادت نہیں کہا جاتا بلکہ زندگی کے ہر میدان میں عبد کا اپنے آقا کا مطیع اور فرمانبردار ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح عابد اور عبادت کے اس مفہوم کے پیش نظر از روئے دین اسلام انسان صرف اللہ تعالیٰ کا عبادت گذار اور غلام ہوگا، کسی انسان کا نہیں۔

شریعت کی اصطلاح اور عام تصور کے مطابق "عبد" یا "غلام" اس انسان کو کہا جاتا ہے، جس کے جسم و جان اور مال و اولاد کا مالک وہ خود نہیں ہوتا بلکہ ان سب کا حقیقی مالک اس کا آقا ہوتا ہے اور آقا کی اجازت کے مطابق یہ شخص اپنے جسم، جان، مال اور اولاد میں تصرف کرنے کا مالک ہوتا ہے۔ از روئے دین اسلام انسان بحیثیت انسان کے صرف اللہ تعالیٰ کا غلام ہو سکتا ہے کسی انسان کا نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دین جمہوریت انسان کو اللہ تعالیٰ کی غلامی سے مکمل طور پر آزادی دلا کر اسے انسان کا غلام بنا دیتا ہے، اس کے برعکس دین اسلام انسان کو کسی بھی غیر اللہ کی غلامی سے مکمل آزادی دلاتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کا غلام بنا دیتا ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم و الذین من قبلکم لعلکم

تتقون○ الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء وانزل من السماء ماء فاخرج بہ من الثمرات رزقا لکم فلا تجعلوا للہ اندادا وانتم تعلمون○ (سورۃ البقرہ۔ آیت:۲۲)

”اے لوگو! اپنے رب کی بندگی، غلامی کرو جس نے تمہیں نیست سے ہست کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم عذاب سے بچ جاؤ، اس رب کی غلامی کرو جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا، اور آسمان سے پانی نازل فرمایا پھر اس کے ذریعے تمہارے کھانے کے لئے پھل پیدا فرمائے، پس کسی کو اللہ کی بندگی اور غلامی میں شریک نہ بناؤ حالانکہ تم جانتے بھی ہو کہ اللہ کا کوئی ہم سر نہیں ہو سکتا“۔

تشریح: یہاں قرآن نے ان وجوہات کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔ جن کی بنا پر اللہ ہی بندگی اور غلامی کا مستحق ہے اور یہ وجوہات کسی غیر اللہ میں موجود نہیں ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وقال المسیح یبنی اسرائیل اعبدوا اللہ ربی وربکم انہ من یشرک باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ وما واہ النار○

(سورۃ المائدہ۔ آیت: ۷۲)

”حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے بنی اسرائیل اس اللہ کی بندگی اور غلامی کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے، بے شک جس نے بندگی اور غلامی میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنایا، سو اللہ نے اس پر جنت حرام کی اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے“۔

قولہ تعالیٰ: والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا وانابوا الی اللہ لھم البشری○ (سورۃ الزمر۔ آیت:۱۷)

”اور جو لوگ اللہ کے سوا کسی کی بندگی اور غلامی سے بچتے رہے اور اللہ کی

غلامی کی طرف رجوع کیا ان کے لئے خوشخبری ہے"۔

جملہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات

انبیاء علیہم الصلوٰۃ کی تعلیمات میں سب سے پہلی بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حکمرانی اور بندگی و غلامی میں کسی بھی غیر اللہ کو شریک نہ بناؤ اور یہی بات دین اسلام کی اساس ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں:

وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیه انه لا اله الا انا فاعبدون ○ (سورۃ الانبیاء۔ آیت:۲۵)

"اور ہم نے تم سے پہلے (اے پیغمبر) ایسا کوئی رسول نہیں بھیجا، جس کی طرف یہ وحی ہم نے نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا اور کوئی بندگی کے لائق نہیں سو میری ہی بندگی اور غلامی کرو"۔

ولقد بعثنا فی کل امة رسولا ان اعبدو الله واجتنبوا الطاغوت○

(سورۃ النحل۔ آیت: ۳۶)

"اور تحقیق ہم نے ہر امت میں یہ حکم دے کر رسول بھیجا کہ صرف اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت (غیر اللہ) کی بندگی سے بچو"۔

لقد ارسلنا نوحا الی قومه فقال یا قوم اعبدو الله ما لکم من اله غیره○ (سورۃ الاعراف۔ آیت:۵۹)

"بے شک ہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف بھیجا پس اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی بندگی اور غلامی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود، آقا اور حکمران نہیں"۔

والی عاد اخاهم هودا قال یا قوم اعبدوا الله ما لکم من اله

غیرہ ○ (سورۃ الاعراف۔ آیت:۶۵)

"اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود علیہ السلام کو بھیجا، اس نے فرمایا اے میری قوم اللہ کی بندگی اور غلامی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی آقا اور بندگی کے لائق نہیں"۔

والی ثمود اخاھم صالحا قال یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الہ غیرہ ○ (سورۃ الاعراف۔ آیت:۷۳)

"اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا اس نے فرمایا، اے میری قوم صرف اللہ کی غلامی اور بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود اور آقا نہیں"۔

والی مدین اخاھم شعیبا قال یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الہ غیرہ ○ (سورۃ الاعراف۔ آیت:۸۵)

"اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا، فرمایا اے میری قوم اللہ کی بندگی اور غلامی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی آقا اور معبود نہیں"۔

واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا ○ (سورۃ النساء۔ آیت:۳۶)

"اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ (آقائی اور حکمرانی میں) کسی کو شریک نہ بناؤ"۔

قصہ مختصر یہ کہ قرآن کریم اور احادیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا بیشتر حصہ ان تعلیمات پر مشتمل ہے، جن کی رو سے انسانوں کو غیر اللہ کی غلامی اور محکومی سے نجات اور آزادی دلا کر صرف اللہ تعالیٰ کی غلامی اور محکومی میں مکمل طور پر داخل کیا جائے۔

ع، ب، د، کے مادئی سے بنے ہوئے الفاظ عربی لغت میں غلام، غلامی اور آقا کے مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں جیسے فارسی میں بندہ، بندگی کہا جاتا ہے ایسی آیات جس میں اللہ

تعالیٰ کی بندگی کا حکم اور ترغیب ہے اور غیر اللہ کی بندگی سے ممانعت ہے، ان کی تعداد قرآن کریم میں دو سو ستائیس (۲۲۷) ہے۔

حکم کرنا خاص ہے اللہ تعالیٰ کے لئے

دین جمہوریت میں حکم چلانا یا آرڈر یعنی امر کرنا صرف عوام کے لئے ہے، مگر دین اسلام میں حکم کرنا، امر کرنا (جس کو آج کی اصطلاح میں حکمرانی اور آمریت کہا جا سکتا ہے) خاص ہے اللہ تعالیٰ کے لئے۔ انسان اللہ تعالیٰ کا امین اور نائب ہو کر حکم اور امر کر سکتا ہے جو درحقیقت اللہ ہی کا حکم اور امر ہوتا ہے۔

حکم اور امر کی تعریف اور پہچان

حکم اور امر کی وضاحت کے لئے صرف، امام لغت القرآن، العلامہ الراغب الاصفہانی کی کتاب (المفردات فی غرائب القرآن) کا حوالہ ہی کافی ہے۔

قوله: والحكم بالشئی ان تقضی بانه كذا او ليس كذا.

(المفردات: صفحہ ۱۲۵)

کسی بات اور چیز کے متعلق حکم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تو اس کے متعلق فیصلہ صادر کرتا ہے کہ ایسا ہے، یا ایسا نہیں ہے۔

قوله: امرته اذا كلفته ان يفعل شيئا. (المفردات۔ صفحہ ۲۳)

جب آپ کسی کو امر کریں تو اس کا حقیقی مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے اسے تعمیل کرنے پر مجبور کیا۔

قوله: الامر، طلب الفعل وموجبه عند الجمهور الالزام.

(حسامی۔ صفحہ ۲۹)

امر کا مطلب ہے کسی کام کرنے کا مطالبہ کرنا۔ اور جمہور علما کے نزدیک مامور کے لئے وہ کام کرنا لازم ہو گا۔

قرآن حکیم میں اس سلسلہ میں صراحت موجود ہے ارشاد ربانی ہے:

الا له الخلق والامر ○ (سورۃ الاعراف، آیت: ۵۴)

"یاد رکھو! اسی کے لئے پیدا کرنا ہے اور اسی کے لئے حکم چلانا ہے (اس کے سوا کوئی نہیں جسے کارخانہ ہستی کی تخلیق اور حکمرانی میں دخل ہو)"۔

يقولون هل لنا من الامر من شئی قل ان الامر كله لله ○

(سورۃ آل عمران۔ آیت: ۱۵۴)

"لوگ کہتے تھے کہ کیا ہمارے ہاتھ میں اختیار ہے۔ کہدو (اے پیغمبر) ساری باتیں اور سب کام صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں"۔

وما اختلفتم فيه من شئی فحكمه الى الله ○

(سورۃ الشوریٰ۔ آیت: ۱۰)

"اور جس معاملہ میں تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے سو اس کے فیصلے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے"۔

والله يحكم لا معقب لحكمه ○ (سورۃ الرعد۔ آیت: ۴۱)

"اور اللہ حکم کرتا ہے (یعنی حکمرانی کرتا ہے) کوئی اس کے حکم کو تبدیل نہیں کر سکتا یعنی اس کے مقابلے میں حکمرانی نہیں کر سکتا"۔

ولا يشرك فی حكمه احدا ○ (سورۃ الکہف۔ آیت: ۲۶)

"اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں یعنی حکمرانی میں کسی کو شریک نہیں بناتا ہے"۔

افغير الله ابتغی حكما وهو الذی انزل اليكم الكتاب مفصلا ○

(الانعام۔ آیت: ۱۱۴)

"(اے پیغمبر ان لوگوں سے کہدو کہ) کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو فیصلے کرنے والا، حکم چلانے والا، بنالوں حالانکہ اسی نے تمہاری طرف ایک مفصل اور واضح کتاب اتاری ہے"۔

دین اسلام کے ساتھ غیر اسلامی چیزوں کی پیوند کاری

حضرت عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ دین یہود کے بہت بڑے عالم تھے۔ مدینہ منورہ میں حضور علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد وہ مع چند ساتھیوں کے مشرف بہ اسلام ہوئے انہوں نے سوچا کہ اسلام کے احکامات پر سوفیصدی عمل کرنے کے ساتھ ساتھ ہم دین یہودیت کے بعض ایسے احکامات پر بھی عمل کرتے رہیں گے، جس سے اسلامی احکامات پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو تاکہ اس طرح ہم دُگنا ثواب حاصل کر سکیں ان باتوں میں سے ایک بات یہ تھی کہ وہ یوم الجمعہ کے اسلامی احکامات اور احترام کے بجا آوری کے ساتھ ساتھ یوم السبت ہفتے کے دن کا بھی وہی احترام بجالاتے تھے جو دین یہودیت میں تھا، نیز ان کا خیال تھا کہ اونٹ کا گوشت وغیرہ چونکہ دین اسلام میں حلال ہے، لہٰذا ہم اعتقادی طور پر اسے حلال سمجھیں گے لیکن چونکہ اسلام میں اونٹ کا گوشت کھانا کوئی ضروری نہیں ہے، جیسا کہ بکثرت ایسے مسلمان ہیں جنہوں نے عمر بھر اونٹ کا گوشت نہیں کھایا ہوگا۔ لہٰذا اگر ہم عملی طور پر اونٹ کا گوشت کھانے سے اجتناب کریں تو اس میں کوئی حرج نہ ہوگا، بلکہ اس طرح دین اسلام پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ دین یہودیت پر عمل پیرا ہو جائینگے کیونکہ اونٹ کا گوشت اور ہفتے کے دن کے احکامات اصلی آسمانی وحی کے مطابق تھے، جس کی تصدیق قرآن کریم اور احادیث نبوی ﷺ میں موجود ہے۔

جب یہ مسئلہ حضور علیہ السلام کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے وحی کا انتظار فرمایا اور حسب ذیل آیات نازل ہوئیں جس میں دین اسلام کے ساتھ اس پیوند کاری کو شیطانی اور

طاغوتی نقشِ قدم پر چلنے کے مترادف قرار دیا۔

قوله تعالیٰ: یا ایها الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافة ولا تتبعوا خطوات الشیطان○ (سورۃ البقرہ۔ آیت:۲۰۸)

"اے ایمان والو! پوری طرح اور (اعتقادی و عملی) ساری باتوں میں مسلمان بن جاؤ اور (ہوشیار رہو) شیطان کے وسوسوں کی پیروی نہ کرو"۔

اخرج غیر واحد عن ابن عباس رضی اللہ عنهما انها نزلت فی عبداللہ ابن سلام واصحابه وذالك انهم حین آمنوا بالنبی صلی اللہ علیه وسلم وآمنوا بشرائعه وشرائع موسیٰ علیه السلام فعظموا السبت وکرهوا لحمان الا بل والبانها بعد ما اسلموا فانکر ذالك علیهم المسلمون فقالوا: انا نقوی علی هذا وهذا وقالوا للنبی صلی اللہ علیه وسلم ان التوراة کتاب اللہ تعالیٰ فدعنا فلنعمل بها فانزل تعالیٰ هذه الآیة. (روح المعانی۔ جلد ثانی، صفحہ:۹۷)

"بہت سے راویوں نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت عبداللہ ابن سلام اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی، کہ جب وہ نبی علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر ایمان لائے اور پھر ہفتے کے دن کی عظمت کرنی شروع کی اور اونٹوں کا گوشت اور دودھ پسند نہیں کرتے تھے اور مسلمانوں نے جب اس رویے کو برا مانا تو انہوں نے کہا کہ ہم اس دوہری دینداری کی قوت رکھتے ہیں، اور انہوں نے حضور علیہ السلام سے بھی عرض کیا کہ چونکہ توریت بھی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے اس لئے ہمیں ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کی اجازت ملنی چاہئے تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی اور انہیں اس پیوندکاری سے منع فرمایا"۔

ایمان اور کفر کے امتیاز کی ایک علمی تحقیق

قولہ تعالیٰ: الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (سورۃ المائدہ۔ آیت: ۳)

"آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور میں نے تمہارے لئے اسلام ہی کو دین پسند کیا"۔

اس قرآنی اعلان کے بعد کسی بھی مسلمان کے لئے محض یہ تصور کرنا کہ دین اسلام کے ساتھ کسی بھی دوسرے نظام کی پیوندکاری یا اسلام کے اٹل احکامات میں وقت کے تقاضے کے مطابق ردوبدل ہونا چاہئے ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے، لیکن اسلام کے معتدبہ علوم کے فقدان اور مادہ پرستی، حب جاہ ومال کے نتیجے میں آج نہ صرف عام مسلمان بلکہ بعض خواص بھی اسلام کے ساتھ پیوندکاری کی دعوت چلاتے ہیں، اور صرف دعوت ہی نہیں بلکہ وقت کے تقاضے کے مطابق ایسا کرنا بزعم خود اسلامی تعلیمات کا منشاء ثابت کرتے ہیں، اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ یہاں اسلام اور کفر کے درمیان امتیازی خط کو پوری طرح واضح کیا جائے تاکہ اس مسئلے میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

ایمان کی حقیقت

مسلمان ہونے کے لئے تین چیزیں شرط ہیں۔

پہلی شرط! دل کی تصدیق ہے یعنی جو کچھ حضور علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین اسلام کے متعلق امت کو پہنچایا ہے اس کو دل سے سو فیصد سچا اور کامل ومکمل تسلیم کرنا۔

دوسری شرط! زبان سے بہ رضا ورغبت اس تصدیق کا اقرار کرنا ہے۔

تیسری شرط! ایسے اقوال اور اعمال سے اجتناب کرنا، جنہیں شریعت نے کفر کی

علامت ٹھہرایا ہو۔

ان تین شرطوں میں سے اگر کوئی ایک بھی کسی شخص میں موجود نہ ہو تو وہ مسلمان نہ ہوگا۔ تیسری شرط در حقیقت پہلی شرط کے مفہوم میں داخل ہے، مگر میں نے اہمیت اور وضاحت کے لئے الگ ذکر کر دیا، ان تمام تین اجزاء کے یا بعض کے انتفاء سے کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ وہ نماز، روزہ، زکوۃ اور حج جیسی عبادات کا پابند ہو، اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو۔ یہ ہے اسلام اور کفر کے سمجھنے کے لئے ایک بنیادی معیار جس سے ایمان کے معاملہ میں وارد ہونے والے بہت سے اشکالات حل ہو جائیں گے اور یہ تحقیق آپ کو خال خال ہی ملے گی۔

چنانچہ چند حوالے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

فقد روی عن الصادق رضی اللہ عنہ انہ قال لو ان قوما عبدوا اللہ تعالٰی واقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوۃ وصاموا رمضان وحجوا البیت ثم قالوا لشئی صنعہ رسول اللہ ﷺ الا صنع خلف ما صنع او وجدوا فی انفسہم حرجا لکانوا مشرکین۔ (روح المعانی، الجزء الرابع مبحث فلاوربک لایومنون صفحہ ۱۷)

"تحقیق روایت ہے حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے کہ آپ نے فرمایا اگر کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے، نماز، زکوۃ، روزہ، اور حج بیت اللہ شریف کی ادائیگی کی بھی پابند ہے، اس کے باوجود یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے جو فلاں کام کیا ہے، ایسا آپ کو نہیں کرنا چاہئے تھا۔ آپ علیہ السلام کو چاہئے تھا کہ اس کے برعکس کام کرتے یا یہ لوگ حضور علیہ السلام کے کئے ہوئے کام سے اپنے نفسوں میں بوجھ اور کراہت پاتے ہیں تو وہ لوگ مشرک ہو گئے"۔

وفی شرح المقاصد قولہ لا نزاع فی کفر اھل القبلۃ المواظب طول عمرہ علی الطاعۃ باعتقاد قدم العالم ونفی الحشر ونفی العلم بالجزئیات وکذا

صدور شئی من موجبات الکفر الخ.

(شرح المقاصد۔ جلد ثانی المبحث السابع صفحہ: ۲۶۸ تا ۲۷۰)

"شرح مقاصد میں ہے کہ ان لوگوں کے کفر میں کوئی اختلاف نہیں، جن کا عقیدہ ہے کہ یہ عالم قدیم ہے، یا یہ کہ حشر نہیں ہے یا یہ کہ اللہ کو جزئیات کا علم نہیں ہے، یا ان سے ایسا قول اور فعل سرزد ہو جو کفر ہو اگرچہ یہ لوگ اہل قبلہ ہوں اور عمر بھر سے اطاعت اور عبادت گذار ہوں"۔

وفی شرح العقائد النسفی بحث الکبائر صفحه ۱۵۷ قوله کما لو فرضنا ان احد اصدق بجمیع ما جاء به النبی علیه السلام واقر به وعمل به مع ذالك شد الزنار بالاختیار او سجد للصنم بالاختیار نجعله کافرا لما ان النبی علیه السلام جعل ذالك علامة التکذیب والانکار وتحقیق هذا المقام یسهل لك الطریق الی حل کثیر من الاشکالات الواردة فی مسئلة الایمان الخ.

"شرح العقائد میں بحث الکبائر صفحہ ۱۵۷ پر ہے۔ جیسے کہ ہم فرض کرلیں کہ ایک شخص ہے جو کہ حضور علیہ السلام پر نازل شدہ دین کی تصدیق کرتا ہے اور اس کا اقرار کرتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے اس کے باوجود وہ اپنی مرضی سے زنار باندھ لیتا ہے یا مرضی سے بت کے سامنے سجدہ کرتا ہے ہم ایسے شخص کو کافر کہیں گے کیونکہ حضور علیہ السلام نے ان افعال کو شریعت کے جھٹلانے اور شریعت سے انکار کی علامت ٹھہرا لیا ہے، اور اس مقام کی جو تحقیق میں نے ذکر کی یہ آپ کے لئے ایمان کے مسئلے پر وارد ہونے والے بہت سے اشکالات کا حل کرنا آسان کرے گی الخ"۔

قال فی المسائرة وبالجملة فقد ضم الی التصدیق بالقلب او بالقلب واللسان فی تحقیق الایمان امور الاخلال بها اخلال بالایمان اتفاقا کالسجود للصنم وقتل النبی ولاستخفاف به وبالمصحف والکعبة وکذا مخالفة او انکار

ما اجمع علیه بعد العلم به لان التصدیق مفقود ثم حقق ان عدم الاخلال بهذہ الامور احد اجزاء مفہوم الایمان فھو حینئذ التصدیق والاقرار وعدم الاخلال بما ذکر الخ.

وبعد اسطر قال الاستخفاف بالدین کالصلوٰۃ بلا وضوء عمدا بل بالمواظبۃ علی ترک سنۃ استخفافا بھا بسبب انہ فعلھا النبی علیہ السلام زیادۃ او استقباحھا کمن استقبح تکویر طرف العمامۃ من تحت حلقہ او احفاء شاربہ آھ

قلت ویظھر من ھذا ان ما کان دلیل الاستخفاف یکفر بہ وان لم یقصد بہ الاستخفاف لانہ لو توقف علی قصدہ لما احتاج الی زیادۃ عدم الاخلال بمامر لان قصد الاستخفاف مناف التصدیق.

(ردالمختار۔ جلد ثالث باب المرتد، صفحہ ۳۱۰)

"صاحب مسایرہ نے کہا ہے کہ حاصل یہ ہے کہ ایمان کے ثبوت کے لئے دل کی تصدیق یا تصدیق اور اقرار کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے، اور وہ ہے ایمان کے منافی اعمال اور اقوال سے اجتناب اور یہ بات بالاتفاق ہے۔ جیسے بت کے سامنے سجدہ کرنا، پیغمبر کو قتل کرنا، اس کی توہین کرنا، قرآن یا بیت اللہ کی اہانت کرنا جان بوجھ کر اجماع کی مخالفت اور انکار کرنا کیونکہ ایسے امور کا سرزد ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ کرنے والے کے دل میں تصدیق نہیں ہے۔ پھر ثابت کیا کہ ان چیزوں سے اجتناب ایمان کے مفہوم کے اجزا میں سے ایک جزو ہے، پس ایمان کی تعریف اب یہ ہوئی کہ دل کی تصدیق واقرار اور مخل کاموں سے اجتناب یعنی ایسے افعال اور اقوال جو جھٹلانے کی علامت ہوں۔

اور چند سطروں کے بعد کہا ہے اسی طرح دین کی اہانت کا حکم ہے، جیسے قصداً بے وضو نماز پڑھنا، اسی طرح کسی سنت کو ناچیز سمجھ کر ہمیشہ کے لئے ترک کرنا، اس وجہ سے کہ حضور علیہ السلام نے اس کو [illegible] زائد کام کیا ہے یا کسی سنت کو برا اور قبیح سمجھنا جیسا کہ کسی شخص نے

پگڑی کا ایک حصہ گردن سے نیچے گھمایا ہے اور دوسرا اسے سنت سمجھتے ہوئے نفرت کرے یا کسی نے مونچھوں کو قینچی سے بالکل صاف کیا ہے اور دوسرا اس عمل کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے۔

میں کہتا ہوں اس سے ظاہر ہوا کہ جو قول و عمل دین اسلام کی توہین کی علامت ہو، اس سے کفر لازم آتا ہے۔ اگرچہ کرنے والے کی نیت توہین کی نہ بھی ہو کیونکہ اگر کفر کرنے والے کی نیت پر موقوف ہوتا پھر تو ایمان کے ثبوت کے لئے اس تیسرے جزو کے بڑھانے کی ضرورت پیش نہ آتی بلکہ ایمان کا پہلا جزو ہی موجود نہ ہوتا اس لئے کہ جب کرنے والے کی نیت میں دین اسلام کی اہانت ہے، تو دین اسلام کی صداقت اس کے دل میں کہاں ہے؟

والحاصل ان من تکلم بکلمة الکفر هازلاً اولا عبا کفر عند الکل ولا اعتبار باعتقاده کما صرح به فی الخانیة. (شامی۔ جلد ۳، صفحہ ۳۱۲)

"حاصل یہ ہے کہ جس نے کفر کی بات کہہ دی وہ بالاتفاق کافر ہے، اگرچہ کہنے والے نے مذاق اور مسخرے کے طور پر کہہ دیا ہو اور اس کی نیت کا اعتبار نہ ہوگا جیسے کہ صاحب خانیہ نے اس کی تصریح کی ہے"۔

وفی البحر والاصل ان من اعتقد الحرام حلالا فان کان دلیله (ای دلیل الحرمة) قطعیا کفر به. (ردالمحتار۔ جلد ۳، باب المرتد، صفحہ ۳۱۱)

"اور بحرالرائق میں ہے، کہ قانون یہ ہے کہ جس نے قطعی دلیل سے ثابت شدہ حرام چیز کو حلال سمجھا وہ کافر ہے"۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اسلامی نظام کے ساتھ دوسرے نظاموں کی پیوند کاری یا اسلامی احکامات منصوصہ میں کمی بیشی کرنا اس بات کی علامت ہے کہ ایسا کرنے والوں، یا چاہنے والوں کا اللہ تعالیٰ کے اعلان عرفات (الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا) (المائدہ۔ آیت: ۳) کی صداقت اور سچائی پر یقین نہیں ہے اس طرح ایمان کے تیسرے جزو (ایسے قول و عمل سے اجتناب کرنا جو تصدیق قلب کے

لئے مخل ہو یعنی اسے جھٹلانے کی دلیل ہو) کی نفی ہوتی ہے لہٰذا ایمان ہی باقی نہیں رہتا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

ہو سکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خلجان پیدا ہو کہ جب ایک شخص سے ایسا قول و عمل سرزد ہو جائے جو کہ تصدیق کے لئے مخل ہو، یعنی تکذیب اور جھٹلانے کی علامت ہو تو ضروری نہیں کہ اس شخص کے دل میں تصدیق نہ ہو، بلکہ ممکن ہے کہ ایک شخص کے دل میں سو فیصد تصدیق ہو اور اس کا اقرار بھی کرتا ہو مگر کسی مصلحت کے تحت وہ ایسا کرے جیسا کہ آج کل ہر خاص و عام بغیر کسی قید کے مطلق جمہوریت کا پرچار کرتا ہے، چونکہ یورپ نے اس نظام کو پراپیگنڈے کے ذریعہ مقبول بنایا ہے اب ایک سیاسی لیڈر اپنی سیاست کو چمکانے کے لئے مروجہ جمہوریت نافذ کرنے کے لئے دھواں دار تقریریں کرتا ہے، مگر اس کے دل میں اسلامی نظام کی سو فیصد تصدیق اور سچائی موجود ہے جس کا اقرار بھی کرتا ہے، لیکن تقریروں میں مروجہ جمہوریت کا پرچار سیاسی مصلحت کے لئے کرتا ہے۔ اسی طرح کوئی اور مثال فرض کر لیجئے جو بظاہر تو اسلام کے انکار یا تحقیر کے مترادف ہو، مگر کہنے والے یا کرنے والے کے دل میں سو فیصد تصدیق بھی ہو اس کا اقرار بھی رکھتا ہو اور اسی کے مطابق عمل بھی کرتا ہو تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس کے دل میں تصدیق نہیں ہے، لہٰذا یہ کافر کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔

لیکن درحقیقت ایسے مصلحت پسند اور عذر پسند کا عذر نہ تو ازروئے اسلام قابل قبول ہے اور نہ عقلاً اس میں کوئی وزن ہے، اس لئے کہ یہاں نہ تو وہ اکراہ موجود ہے جس کے پیش نظر شریعت نے اجازت دی ہے کہ بے شک تم سے اگر کفر کے اقوال اور افعال سرزد ہو جائیں تو تم پر مواخذہ نہ ہو گا بشرطیکہ تمہارے دل ایمان اور تصدیق سے بھرپور ہوں اور نہ ہی اکراہ کی صورت میں کسی کو اشتباہ ہے۔

دوسری بات! فرض کیجئے کہ اگر ووٹروں کی اکثریت، ہندوؤں، مرزائیوں یا

عیسائیوں اور دہریوں کی ہو تو آپ لیڈری چمکانے اور ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے کسی لیڈر کو ہندومت، مرزائیت، اور دہریت کے پرچار کی اجازت دیں گے؟ ہرگز نہیں دیں گے، خواہ وہ صرف زبان سے ہی پرچار کیوں نہ کرے۔ تو آپ مروجہ بے قید جمہوریت جیسے کفر بواح کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔

نیز واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانے میں لوگ تین گروہوں میں منقسم تھے، ایک ظاہر و باطن سے مومن، دوسرا ظاہر و باطن سے کافر، اور تیسرا گروہ وہ جو بظاہر مسلمان تھا، اور باطن میں کافر تھا، جنہیں منافقین کہا جاتا ہے۔ اور ان کے علاوہ چوتھا گروہ جو کہ بباطن مومن ہو لیکن بظاہر اس میں واضح طور پر کفر کے اقوال اور اعمال موجود ہوں نہیں پایا جاتا تھا۔ جیسے کہ مذکورہ شبہہ کرنے والوں نے ایک چوتھا گروہ فرض کر لیا ہے۔ بلکہ شریعت نے اس کو دوسرے گروہ میں یعنی ان لوگوں میں شمار کیا ہے، جو کہ بظاہر اور بباطن منکر اور کافر ہیں۔

حضرت علامہ شیخ زین الدین قاسم ابن قطلوبغا الحنفی نے شرح المسائرہ صفحہ ۳۰۸ اور صفحہ ۳۱۲ پر فرمایا ہے۔

كان الناس على عهد رسول الله ﷺ والائمة بعده على ثلاث فرق فقط ليس رابعه كما روى الامام الاعظم عن الحرث بن سويد قال اشهد ان الناس كانوا على عهد رسول الله ﷺ على ثلاث منازل مظهر التصديق ومسر مثل ما اظهر فهو مومن عند الله وعند رسوله وعند الناس ومظهر للتكذيب ومسر مثل ما اظهر فهو كافر عند الله وعند رسوله وعند المومنين ومظهر التصديق ومسر للتكذيب فهو منافق الخ.

وبعد صفحات قال: وقدمنا ما هو المعتمد فى الباب ان وجود علامة التكذيب لا يجامع التصديق فى نظر الشارع، من البدع فرض فرقة رابعة وهى

کافر عند رسول اللہ وعند المومنین مومن عند اللہ تعالیٰ جل مجدہ لما تقدم من ان الفرق علی عہد رسول اللہ ﷺ والائمۃ بعدہ ﷺ ثلاثۃ لا رابع لھا علی ان ھذا فرض عبث فی مقتضی العقل ومستحیل فی نظر الشرع واللہ اعلم۔

"حضور علیہ السلام اور خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے زمانے میں لوگ صرف تین گروہ تھے، چوتھا نہیں تھا، جیسا کہ امام اعظم نے حرث ابن سوید سے روایت کی ہے، انہوں نے فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضور علیہ السلام کے زمانے میں لوگ تین درجوں میں منقسم تھے ایک وہ جو بظاہر تصدیق کرنے والے اور باطن میں ویسے ہی تصدیق کرنے والے تھے یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور سب لوگوں کے نزدیک مومن شمار ہوتے تھے اور دوسرے وہ لوگ جو بظاہر جھٹلانے والے تھے اور باطن میں بھی ویسے ہی جھٹلانے والے تھے یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور رسول خدا اور جملہ مومنین کے نزدیک کافر تھے، تیسرے وہ لوگ جو بظاہر تصدیق کرنے والے اور بباطن جھٹلانے والے تھے، یہ منافق تھے چند صفحات کے بعد فرماتے ہیں اور ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور وہی بات قابل اعتماد بھی ہے وہ یہ کہ کسی انسان میں بظاہر جھٹلانے والی علامت اور باطن کی تصدیق از روئے شریعت یکجا جمع نہیں ہو سکتے ہیں، اور ایسے چوتھے گروہ کو فرض کرنا جو کہ رسول اللہ ﷺ اور مومنین کے نزدیک تو ظاہری علامت کفر کی وجہ سے کافر ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک باطنی تصدیق کی وجہ سے مومن ہو بدعت ہے کیونکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حضور علیہ السلام اور خلفاء راشدین کے زمانے میں لوگ صرف تین گروہ تھے چوتھا نہ تھا حالانکہ ایسا چوتھا گروہ فرض کرنا عقل کے لحاظ سے عبث ہے اور شریعت کے لحاظ سے محال ہے۔ (ابن قطوبغا علی المسائرہ صفحہ ۳۰۸، ۳۲۱)

جمہوریت کے سبز باغ

تقریر اور تحریر کے دلفریب دعووں سے جمہوریت کے علمبرداروں نے عوام کو آزادی کی جس جنت میں جا بسایا ہے عملی میدان میں اس کا وجود قطعاً محال ہے، آپ جانتے ہیں کہ انسانوں کے مفادات، فطری خواہشات اور ضروریات ایک جیسے ہیں اور انسانوں کی مطلوبہ چیزوں میں سے اکثر کا وجود اور دستیاب ہونا ہمیشہ سے محدود رہا ہے اور رہے گا۔ جبکہ انسانوں کی حرص، بے صبری اور ذخیرہ اندوزی کی فطرت ہر وقت "ھل من مزید" (اور چاہئے) کا نعرہ بلند کر رہی ہے تو ایسی کیفیت کے ہوتے ہوئے جمہوریت کی اعلان کردہ بے لاگ آزادیوں کے ساتھ کیا انسانی زندگی کی گاڑی صرف ایک دن کے لئے بھی چل سکتی ہے؟

ایک ادنیٰ مثال لیجئے کسی شاہراہ کے چوراہے پر آپ ٹریفک کے قوانین معطل کر دیں اور ڈرائیوروں کو ہر ایک کی مرضی اور خواہش کے مطابق ڈرائیونگ کی اجازت اور آزادی دیدیں، یقیناً آپ بھی اس تباہی اور فساد کا تصور کر سکتے ہیں، جو اس معمولی اور محدود آزادی کے نتیجے میں رونما ہوگی چہ جائیکہ پوری قوم اور ملک بلکہ پوری انسانیت کو ہر ایک کی مرضی اور خواہش کی تکمیل کی اجازت کا پروانہ دے دیا جائے۔ ارباب جمہوریت کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ عوام کے لئے ایسی عمومی آزادی اور حریت فراہم کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں، لیکن چونکہ ان کا اصلی ہدف لوگوں کو دین اور مذہب سے آزادی دلانا، خدا اور پیغمبر کا باغی بنانا، فحاشی، عریانیت اور جنسی آزادی کو فروغ دینا ہی رہا ہے، لہٰذا ان طاغوتی قوتوں کو اپنے ان مذموم مقاصد کے حصول کے لئے دین جمہوریت کے نعرہ حریت اور آزادی سے بڑھ کر کارگر حربہ تاریخ میں نہ تو اس سے پہلے ہاتھ آیا ہے، اور نہ ہی بعد میں ہاتھ آئے گا یا یوں کہیے کہ نہ تو شیطان کو معلوم تھا اور نہ دجال کو معلوم ہو سکے گا۔

دین جمہوریت کی عیاری اور فریب کاری

پہلے تو مفکرین اور روشن خیال ارباب جمہوریت نے دین اور مذہب سے عوام کو بیزار کرنے کے لئے انسانی ذات کی قدر و قیمت اس کی بزرگی و کرامت کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے جو بھرپور مہم چلائی، اس کا مقصد عوام کے اذہان میں یہ بات بٹھانا تھا کہ انسان کو اپنی ذات اور اپنے تصرفات، اپنے افعال اور اقوال وغیرہ کا مکمل طور پر مالک ہونا چاہئے، ہر قسم کے بیرونی جبر و اکراہ، قید و بند کی غلامی سے آزادی اور خود مختاری ہونی چاہئے اور اس آزادی اور خود مختاری کے منافی جو بھی بیرونی پابندیاں ہوں وہ غلامی کی ایک شکل ہو گی، خواہ جس نام سے ہوں۔

(دیکھئے تحریک آزادی ہند اور مسلمان مودودی صاحب صفحہ ۳۶۹، اور جمہوریت اسلام کے آئینے میں)

"بیرونی" لفظ کی قید اور شرط سے خدا بیزار اور مادہ پرستوں نے دوہرا فائدہ اٹھایا۔

ایک طرف تو اللہ تعالیٰ اور پیغمبروں کے احکامات اور ہدایات کو بیرونی قید و بند اور پابندیوں کے زمرے میں شمار کر کے ان احکامات کو انسانی آزادی اور حریت کے لئے ایک قسم کی رکاوٹ ٹھہرادیا۔

یہاں تک کہ آقائے ترک "مصطفیٰ کمال" جیسے بعض قوم پرست جمہوریت نواز تو یہاں تک کہنے لگے کہ دینِ اسلام عربوں کی غلامی کی یادگار ہے ترک قوم کے لئے اس غلامی کی تمام یادگاریں ختم کرنا لازم ہیں۔ (العیاذ باللہ)

اور دوسری طرف انہوں نے انسانوں کو انسانوں کا غلام بنانے کا راستہ ہموار کیا وہ اس طرح کہ جب ارباب جمہوریت نے دیکھا کہ حریت اور آزادی کو ایسی بے لاگ اور بے قید شکل میں عملی زندگی دینا اور معیشت کے اندر نافذ العمل کرنا محال ہے، تو انہوں نے سابقہ غلط بیانی، دھواں دھار تقریروں اور دعوؤں کے ذریعے عوام کو جو سبز باغ دکھائے تھے، اس کی

خفت و شرمندگی سے بچنے کے لئے عوام کو کالانعام سمجھ کر حریت اور آزادی کا ایک نیا مطلب اور مفہوم گھڑ لیا، وہ یہ کہ جو پابندی انسان اپنی مرضی سے اپنے آپ پر لگائے وہ غلامی نہیں ہے، بلکہ آزادی کی تکمیل ہے۔

اب یہاں سے جمہوریت کے مداریوں نے پینترہ بدل کر عوام کے سامنے اک نئی بانسری بجانا شروع کی کہ تم لوگوں نے طویل جد و جہد اور عظیم قربانیوں کے بعد آمریت، جاگیرداری، سرمایہ داری، پاپائیت اور ملائیت کی غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کی ہے، اب اس آزادی کے تحفظ اور استحکام کے لئے مزید قربانی دینا ہوگی وہ اس طرح کہ ہر ایک فرد اپنے بنیادی حقوق اور آزادیوں میں سے رضاکارانہ طور پر مفاد عامہ کی خاطر بعض آزادیوں سے دست بردار ہو جائے تاکہ ضرورت کے وقت عوام کی مرضی کے مطابق قوانین بنانے میں دشواری کا سامنا نہ ہو چونکہ یہ قوانین اور پابندیاں عوام اپنی مرضی سے اپنے اوپر لاگو کرتے ہیں اس لئے یہ نہ تو حریت عامہ کے منافی ہیں اور نہ کسی غیر کی غلامی ہے، کیونکہ جمہوریت میں حکومت عوام کی اپنی ہوتی ہے اور عوام ہی حاکم ہیں۔ حکومت جو قوانین اور پابندیاں نافذ کرتی ہے، وہ در حقیقت عوامی قوانین اور پابندیاں ہوتی ہیں کسی غیر کی نہیں۔ اس موقعہ پر جب عوام سے رائے طلب کی جاتی ہے، تو ہر طرف سے منظور منظور کے نعرے بلند ہوتے ہیں اب یہاں سے مروجہ جمہوریت کی بدترین عوامی آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کی ابتدا ہوتی ہے جس نے کہیں سرمایہ دارانہ اور متعدد پارٹیوں کی شکل میں عوام کا خون چوس کر انہیں آپس میں دست و گریبان کر دیا ہے اور کہیں اشتراکیت اور یک پارٹی نظام کا روپ دھار لیا ہے۔

قوانین کا ماخذ و منبع

اتنی بات پر تو پوری انسانیت متفق نظر آتی ہے کہ انسانی معاشرہ کی ترقی، خوش حالی، فلاح اور بہبود کے لئے شرط اول یہ ہے کہ اس کے لئے قوانین اور اصولوں کا ایک ایسا مجموعہ

ہو جو ان کے عقیدے کے مطابق ان کی فلاح کے لئے ہو اور ہر دستور اور آئین سے اعلیٰ وارفع اور انفع ہو، حق و باطل کے لئے پہچان ہو اور اس کی ہر دفعہ کے لئے ہر چھوٹے اور بڑے کی گردن بلا امتیاز خم ہو۔

عقل سلیم کی نگاہ میں قوانین کے ایسے مجموعے کے اصل اور ماخذ صرف دو ہو سکتے ہیں یا تو ایسی ذات جس کا انسانی معاشرے سے رشتہ خون و نسب کا نہ ہو تا کہ اس کے بنائے ہوئے قوانین اقربا پروری کے جذبے سے متاثر نہ ہوں اور نہ ہی اسے انسانی معاشرے سے کسی قسم کے اغراض و مقاصد وابستہ ہوں تا کہ اس کا بنایا ہوا دستور خود غرضی سے بالاتر ہو۔ اور اس ذات مقننہ کے علم و حکمت، عدل و انصاف کی نظیر نہ ہو اور یہ شان صرف "احکم الحاکمین" کے مجموعۂ قوانین (قرآن عظیم اور فرقان مبین) کی ہے، جس کی پیروی کی دعوت اسلام دیتا ہے۔

قوانین کا دوسرا ممکنہ ماخذ انسانی معاشرے میں ایسے گنے چنے چیدہ افراد کی ہدایات ہو سکتا، جنہیں قدرت نے روحانیت، تزکیۂ نفس اور عقل سلیم یا محض عقلیت اور ذہنیت کے امتیازی انعامات سے نوازا ہو تا کہ ایسے افراد اپنی فراست، فلسفیانہ بصیرت، وجدان اور سائنسی تجربہ و مشاہدہ کی مدد سے قوانین کا ایسا مجموعہ مرتب کر لیں جن کو آنے والا انسانی معاشرہ شرف قبولیت بخشے۔ کوئی بھی عقلمند خواہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر یقین رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اگر پہلی قسم کے قوانین انسانی معاشرے کو میسر ہو جائیں تو وہ دیگر تمام قوانین سے بہتر اور تمام ممکنہ نقائص اور عیوب سے پاک اور منزہ ہونگے۔

رہا دوسرے قسم کے قوانین کا مجموعہ تو یہ اگرچہ قسم اول کی نسبت ادنیٰ اور گھٹیا ہے، اور اس میں ہر جگہ غلطی اور لغزش کا احتمال ہے، لیکن پھر بھی معقولیت کے مقام پر فائز ہے، اور قابل التفات ہے۔

قوانین کا تیسرا ماخذ اور بنیاد خواہشات نفس ہیں مشاہدہ سے ثابت ہے کہ انسانی

معاشرے میں ہمیشہ سے ایک کثیر تعداد ان لوگوں کی رہی ہے کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ نہ تو خدائی قوانین کے لئے اور نہ ہی عقل کی پابندیوں کے ماننے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں بلکہ وہ صرف اور صرف خواہش نفس کے غلام بنے رہتے ہیں۔

یہ تیسرا مجموعہ قوانین کا در حقیقت قدرت نے ان حیوانات اور چوپایوں کے لئے وضع فرمایا ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے عقل اور ذہن کے عطیہ سے محروم رکھا ہے۔ اس لئے قدرت نے اپنی ربوبیت کے پیش نظر ان کو ایسی تکوینی شریعت یعنی خواہشات نفس اور طبعی میلانات میں جکڑ دیا جو اپنے محدود دائرہ عمل اور کمترین مرتبہ (اسفل السافلین) سے باہر آنے کی صلاحیت تک نہیں رکھتے، مگر مقام افسوس ہے کہ انسانوں کی اکثریت نے اپنے مقام و مرتبہ کو پس پشت ڈال کر اپنا فطری امتیاز کھو دیا۔ اور "شریعت حیوانات" کو آزادی اور حریت کا نام دے کر اپنا لیا ہے اور خواہشات نفس کو "الہ" بنا کر اس کی بندگی اختیار کی ہے۔

ان لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

افرایت من اتخذ الهه هواه واضله الله علی علم وختم علی سمعه وقلبه وجعل علی بصره غشوة ○ (پارہ ۲۵، الجاثیہ، آیت: ۲۲)

"بھلا آپ نے اس کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو خدا (حاکم) بنایا اور اللہ نے باوجود سمجھ کے اسے گمراہ کر دیا اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا"۔

ومن اضل ممن اتبع هواه بغير هدی من الله ○

(پارہ ۲۰، س: ۲۸، آیت: ۴۹)

"اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو اللہ کی ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہشوں کی اطاعت کرتا ہے"۔

ارایت من اتخذ الهه هواه افانت تکون علیه وکیلا ○ ام تحسب

ان اکثرھم یسمعون او یعقلون ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا○ (پارہ ۱۹، س: ۲۵، آیت: ۴۳)

"کیا تو نے دیکھا اس کو جس نے اپنا خدا (حاکم) اپنی خواہش نفس کو بنایا، بھلا تو اس کا ذمہ دار ہو سکتا ہے یا تو خیال کرتا ہے کہ اکثر ان میں سے سنتے ہیں سمجھتے ہیں یہ محض چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ چوپایوں سے زیادہ گمراہ اور بدتر ہیں"۔

واتل علیھم نبا الذی اتینہ ایاتنا فانسلخ منھا فاتبعہ الشیطان فکان من الغاوین○ ولو شئنا لرفعنہ بھا ولکنہ اخلد الی الارض واتبع ھواہ فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث ذالک مثل القوم الذین کذبوا بایاتنا○

(پارہ ۹، س: ۷، آیت: ۱۷۶)

"اور ان کو اس شخص کا حال سنا دے جسے ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں پھر وہ ان کو چھوڑ نکلا پھر اس کے پیچھے شیطان لگا سو وہ ہو گیا گمراہوں میں سے اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کی برکت سے اس کو انسانیت کے اعلیٰ معیار پر پہنچاتے مگر وہ خود پستی کی طرف مائل ہو گیا، اور اپنی خواہش نفس کی اطاعت شروع کی اب تو اس کا حال کتے جیسا ہے، اگر تو اس پر سختی کرے تو بھی ہانپتا پھرے اور اگر اسے چھوڑ دے تو بھی ہانپے یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو (اعتقاداً یا عملاً) جھٹلایا"۔

تشریح: قرآنی تعلیمات کی صداقت پر یقین رکھنے والے کسی بھی مسلمان کے لئے اس بات میں سرمو تردد نہیں ہو سکتا کہ مذکورہ آیات کا اولین مصداق وہی لوگ ہیں جنہوں نے زندگی گذارنے کے لئے "دین" یعنی قوانین اور ان کا ماخذ عوامی خواہشات قرار دیا

ہے جس کا اصطلاحی نام آج کل "عوامی حکمرانی" اور مروجہ "جمہوریت" ہے۔ رہے وہ لوگ جو خواہش نفس کی اطاعت کو گمراہی سمجھتے ہیں مگر بھولے پن اور جہالت کی وجہ سے ان سے ایسی لغزشیں سرزد ہوتی ہیں تو وہ ثانوی حیثیت سے مذکورہ آیات کے ضمن میں آتے ہیں۔

ایک لطیف نکتہ

چند لمحات کے لئے ان ممالک کے عوام کی کیفیت ذہن میں لایئے جو مروجہ جمہوریت اپنائے ہوئے ہیں جہاں ہر طرف حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی حصول اقتدار کے لئے دھینگا مشتی کے نتیجے میں غل غپاڑہ، توڑ پھوڑ اور بے اطمینانی، ہر ایک کی ظاہری وضع قطع اور حرکات سے عیاں اور آشکارا ہے۔

اور پھر ایسی قوم کی نفسیاتی کیفیت سمجھانے کے لئے قرآن کریم نے چوپایوں میں سے "کتے" سے تشبیہ دے کر ان کی ذہنی اور اخلاقی کیفیت کو ایسے بلیغ پیرائے میں مجسم بنا کر پیش کیا کہ جس سے ادنیٰ سمجھ رکھنے والا بھی عوامی خواہشات کے جملہ نتائج اور مضمرات کا ادراک کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ چشم حقیقت وار کھتا ہو، جمہوریت میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والے دونوں گروہ اپنی جمہوری فطرتی ساخت کو برقرار رکھنے کے لئے ہر حال میں ایک دوسرے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، ان کی اس کیفیت کو قرآن کریم نے مختصر اور جامع ترین الفاظ "ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث" میں ادا کیا ہے۔

"اور بعض لکیر کے فقیر حضرات کے اس شبہ کہ یہ آیت کسی خاص فرد کی ذہنی کیفیت کا نقشہ کھینچنے کے متعلق نازل ہوئی" کو دور کرنے کے لئے، قرآن نے اس کے بعد متصل فرمایا کہ یہ مثال کسی فرد کی نہیں بلکہ عوامی خواہشات کو معبود بنانے والی قوم کی مثال ہے۔ (ذالک مثل القوم الذین کذبوا بایاتنا) اس مثال اور ممثل لہ کی تطبیق کی طرف تو میں نے محض اشارہ کیا آپ اسے ذرا وسعت دینے کے لئے اسمبلیوں میں جائیں اور پھر

حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے جلسے سنیں اور دیکھیں، انکے جلوسوں اور مظاہروں کے ساتھ قدم رنجہ فرمادیں کچھ دیر کے لئے تعلیمی اداروں کا ماحول دیکھئے حتی کہ دینی درس گاہوں دینی تعلیم کے حاملین کی ہم نشینی کو نہ بھولئے در و دیوار پر تحریرات کو پڑھئے، کلرک سے لیکر صدارت، وزارت عظمیٰ تک کے منصبوں پر فائز حضرات کی سیاسی وابستگیوں اور میلانات کا کھوج لگانے کی کوشش کیجئے تو آپ بے اختیار پکار اٹھیں گے (سبحان من قال "ان تحمل علیه یلهث او تترکه یلهث")

دین جمہوریت میں قانون اکثریت

دین جمہوریت میں قانون اور احکامات، جائز و ناجائز، حق اور باطل کی اساس اور بنیاد نہ تو نقل یعنی وحی آسمانی پر ہے اور نہ ہی عقل پر بلکہ اس کی بنیاد خواہشات نفس ہیں۔ اور چونکہ انسان کی نفسانی خواہشات میں ہر جگہ تضاد اور ٹکراؤ ہوتا ہے۔

لہٰذا اس نزاع کو ختم کرنے کے لئے بانیان جمہوریت نے ہر ایک مسئلے کے لئے عوام کی اکثریت کی خواہشات اور مرضی کو معیار حق بنایا جس کے مقابلے میں دین و مذہب اور اچھائی و برائی کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس طرح اکثریت ہمیشہ مسند خدائی اور آقائی پر براجمان رہے گی اور اقلیت ہمیشہ اکثریت کی مرضی کے سامنے جملہ آزادیوں بلکہ بنیادی حقوق سے محروم غلامی کی زندگی بسر کرے گی۔

کیا کثرت رائے معیار حق ہے؟

چونکہ دین جمہوریت میں دین اور مذہب یا دلیل (یعنی ارباب علم و دانش اور ماہرین کی رائے) کی کوئی قدر و قیمت نہیں، اس لئے کثرت رائے بطور معیار حق کو بنیادی اصول تسلیم کئے بغیر جمہوری نظام ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، یہی وجہ ہے کہ دین جمہوریت میں کثرت

رائے کا معیار حق ہونا وہ اساسی عقیدہ ہے جس پر دین جمہوریت کی تعمیر کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

چونکہ اس اساس میں بنیادی عنصر دل کی چاہت اور مرضی ہے جس میں علم ونادانی کی قدر و قیمت یکساں ہوگی۔ اس اصول کو سیاسی مساوات کا نام دیا گیا۔ پھر اس کو حقیقی مساوات بنانے کے لئے طے کیا گیا کہ عالم وجاہل، حکیم اور احمق، نیک کردار اور بد کردار، تجربہ کار اور اناڑی، عیاش، فحاش، غنڈا، چور، ڈاکو، چرسی، بھنگی، شرابی، قمار باز، خائن کی اور باوقار، شریف، امین، نیک چلن، متقی، فرض شناس اور صادق مسلمان کے ووٹ کی قیمت یکساں اور برابر ہو گی۔

اکثریت کی حقانیت قرآن کی نظر میں

قرآن کریم جو نہ صرف جملہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں پر مشتمل اور مہیمن ہے بلکہ انسانی تاریخ اور اقوام عالم کے واقعات اور اچھائی برائی کا ایک مستند مجموعہ بھی ہے تو ہر مسلمان کے لئے ناقابل انکار حجت ہے، اس لئے قرآن کے آئینے میں دین جمہوریت کی اساس "اکثریت" اور حقانیت کو دیکھتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوك عن سبیل الله ان یتبعون الا الظن وان هم الا یخرصون ○ (پارہ:۸، س:۶، آیت:۱۱۶)

"اے پیغمبر اگر تو ان لوگوں کی اکثریت کی اطاعت کرے جو دنیا میں ہیں، تو تجھے اللہ کی راہ سے بے راہ کر دینگے لوگوں کی اکثریت تو خیال کی پیروی کرتی ہے (حجت اور دلیل کی نہیں) اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں"۔

انه الحق من ربك ولكن اكثر الناس لا یومنون ○

(پارہ:۱۲، س:۱۱، آیت: ۱۷)

"بے شک یہ قرآن تیرے رب کی طرف سے حق ہے لیکن لوگوں کی

اکثریت ایمان نہیں لاتی"۔

ان اللہ لذو فضلٍ علی الناس ولکن اکثر الناس لا یشکرون○

(پارہ:۲، س:۲، آیت:۲۴۳)

"بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن لوگوں کی اکثریت شکر نہیں کرتی یعنی خدا کی اطاعت کے بجائے خواہشات نفس کی پیروی کرتی ہے"۔

بل اکثرھم لا یعلمون○

(پارہ:۲۰، س:۲۷، آیت:۶۱)

"لوگوں کی اکثریت بے علم اور نا سمجھ یعنی جاہل ہے"۔

تشریح: ان آیات میں صراحت کے ساتھ پوری انسانیت کی اکثریت کے فیصلے کی حقیقت ظاہر فرمائی گئی ہے کہ ہمیشہ انسانوں میں اکثر جاہل اور بے علم ہوتے ہیں۔ نہ تو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں، اور نہ اللہ کی نازل کردہ حق بات پر یقین رکھتے ہیں، اور نہ شکر گذاری اور نمک حلالی کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ وہ ہمیشہ خواہشات نفس کے مفروضوں کی پیروی کرتے ہیں اور خیالی پلاؤ پکاتے ہیں۔

اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے عظیم پیغمبر کو زمین پر رہنے والے جملہ انسانوں (خواہ مومن ہوں یا کافر) کے اکثریت کے فیصلے کی اطاعت سے منع فرماتے ہیں، حضور علیہ السلام کو اکثریت کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے منع فرمانا درحقیقت حضور علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کو منع فرمانا ہے۔

یہ تو بحیثیت مجموئی انسانیت کی اکثریت کے ووٹ اور فیصلے کے متعلق قرآن کریم کی وضاحت ہے۔ اب آیئے دیکھیں کہ انسانیت کے مخصوص زمانے، پیشے اور مذاہب اختیار کرنے والے انسانوں میں اکثریت کے فیصلے کے متعلق قرآن کیا فرماتا ہے؟

مالی اور معاشی مفادات میں اکثریت کے فیصلے

وان کثیراً من الخلطاء لیبغی بعضھم علی بعض الا الذین آمنوا وعملوا الصلحٰت وقلیل ماھم○ (پارہ:۲۳، س:۳۸، آیت:۲۴)

''اور اکثر شرکاء مشترکہ مفادات میں ایک دوسرے پر ظلم وزیادتی کرتے ہیں، بجز ان لوگوں کے جو ایمان دار اور نیک چلن ہیں اور ایسے لوگ اقلیت میں ہوتے ہیں''۔

تشریح : اس آیت کریمہ نے واضح کیا کہ دنیاوی اور معاشی امور میں پوری انسانیت میں اکثریت کا ووٹ، خواہش، بلکہ عملی اقدام ظلم، زیادتی اور ناجائز کمائی کے حق میں ہوتا اور ایمانداروں، نیک چلن، حلال خوروں کے ووٹ اقلیت میں ہوتے ہیں۔

نوح علیہ السلام کے خلاف قوم کا عوامی فیصلہ

کذبت قوم نوح ن المرسلین○وقولہ. قالوا لئن لم تنتہ ینوح لتکونن من المرجومین○ (پارہ:۱٦، س:۲٦، آیت:۱۰۵، ۱۱٦)

''نوح علیہ السلام کی قوم نے پیغمبر کو جھٹلایا۔ (ایک پیغمبر کو جھٹلانا سب کا جھٹلانا ہے) قوم کے لوگ کہنے لگے اے نوح اگر تو باز نہ آیا تو تجھے ضرور سنگسار کیا جائے گا''۔

وما آمن معہ الا قلیل○

(پارہ:۱۲، س:۱۱، آیت:۴۰)

''اور نوح علیہ السلام کے ساتھ بہت کم لوگ ایمان لائے''۔

تشریح : دیکھئے نوح علیہ السلام کی تعلیمات کے خلاف پوری قومی اکثریت بلکہ

پوری نسل انسانیت "بجز چند گنے چنے لوگوں کے" نے فیصلہ صادر کیا۔ یہاں تک کہ عوامی طاقت کے بل بوتے پر انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی بھی دی۔ اور یہ جو فرمایا کہ قوم نوح نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو چونکہ تمام پیغمبروں کی بنیادی اور اصولی تعلیمات ایک جیسی ہیں، اس لئے ایک پیغمبر کو جھٹلانا گویا کہ سب پیغمبروں کو جھٹلانا ہے۔

ہود علیہ السلام کے خلاف قوم عاد کا عوامی فیصلہ

کذبت عاد ن المرسلین ○

(پارہ:۱۹، س:۲۶، آیت:۱۲۳)

"قوم عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا"۔

قالوا سواء علینا او عظت ام لم تکن من الواعظین ○ ان ھذا الا خلق الاولین ○ (پارہ:۱۹، س:۲۶، آیت:۱۳۷)

"قوم نے ہود علیہ السلام کو کہا تو نصیحت کرے یا نہ کرے ہمارے لئے برابر ہے (ہم تیری نصیحت نہیں مانتے) تیری نصیحت قدامت پرستی کے سوا کچھ نہیں ہے"۔

دیکھئے آج داعیان حق کو جمہوریت پسند اور روشن خیال، جو قدامت پسندی اور رجعت پسندی کا الزام دیتے ہیں، یہی الزام ہزاروں سال پہلے انبیاء علیہم السلام کو دیا جاتا تھا اور یہ محض اس وجہ سے کہ ان کی تعلیمات عوامی اکثریت کی خواہشات کے خلاف تھیں۔

قوم ثمود کی اکثریت اور صالح علیہ السلام کی اقلیت

کذبت ثمود المرسلین ○ (پارہ: ۱۹، س: ۲۶، آیت: ۱۴۱)

قوم ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔

قال الملأ الذین استکبروا للذین استضعفوا لمن آمن منهم اتعلمون انّ صالحا مرسل من ربه قالوا انا بما ارسل به مومنون○ قال الذین استکبروا انا بالذی آمنتم به کافرون○

(پارہ: ۸، س: ۷، آیت: ۷۶)

"اس کی قوم کے متکبر قومی لیڈروں نے ان کمزوروں سے کہا جو ایمان لا چکے تھے کیا تمہیں یقین ہے کہ صالح ان کے رب کا بھیجا ہوا ہے، انہوں نے کہا جو وہ لے کر آیا ہے ہم اس پر ایمان لانے والے ہیں، متکبروں نے کہا جس پر تم ایمان لائے ہو ہم اسے نہیں مانتے ہیں"۔

قالوا تقاسموا باللہ لنبیتنه واهله○

(پارہ: ۱۹، س: ۱۰، آیت: ۴۹)

"قوم کے نمائندوں نے کہا اور آپس میں قسمیں کھائیں کہ صالح اور ان کے اہل خانہ پر شب خون مارینگے"۔

تشریح: یہاں قومی لیڈروں نے صالح علیہ السلام کی دعوت کو ذاتی حیثیت سے نہیں بلکہ عوامی اور قومی نمائندوں کی حیثیت سے رد کیا اور اسی عوامی طاقت کے گھمنڈ کا بھوت ان پر سوار تھا اور مومنین کو قرآن نے جو ضعیف اور کمزور بتایا وہ اس لئے کہ قوم کی اکثریت ان کے خلاف تھی، ورنہ ان میں ایمانی یا جسمانی ضعف نہ تھا چنانچہ اس اکثریت نے صالح علیہ السلام اور مومنین پر عوامی طاقت کی پشت پناہی کے سبب شب خون مارنے کا منصوبہ بنایا۔

لوط علیہ السلام کے خلاف قومی اکثریت کا فیصلہ

کذبت قوم لوط المرسلین○

(پارہ: ۱۹، س: ۲۶، آیت: ۱۶۰)

"لوط کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا"۔

وما کان جواب قومه الا ان قالوا اخرجوهم من قریتکم انهم اناس یتطهرون○ فانجینٰه واهله الا امرأته○

(پارہ: ۸، س: ۷، آیت: ۸۲)

"اور اس کی قوم نے کوئی جواب نہیں دیا مگر یہی کہا کہ انہیں (لوط علیہ السلام) اپنے شہر سے نکال دو یہ لوگ بہت پاک رہنا چاہتے ہیں، پھر ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو سوائے اس کی بیوی کے بچالیا"۔

قال لو ان لی بکم قوة او آوی الی رکن شدید○

(پارہ: ۱۲، س: ۱۱، آیت: ۸۰)

"کہا کاش کہ مجھے تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا کسی زبردست سہارے (عوامی اور قومی) کی پناہ جالیتا"۔

تشریح: دیکھئے یہاں لوط علیہ السلام کے خلاف کتنی عظیم قومی اکثریت ہے کہ جب قہر خداوندی آن پہنچا تو صرف لوط علیہ السلام اور آپ کے گھر کے چند افراد بچ گئے یہاں تک کہ آپ کی بیوی کو بھی قومی ہمدردی کا جذبہ لے ڈوبا۔

شعیب علیہ السلام کے خلاف قوم نے آزادی ملکیت کے حق میں اکثریت کا فیصلہ قبول کیا

کذب اصحاب الئیکة المرسلین○

(پارہ: ۱۹، س: ۲۶، آیت: ۱۷۶)

"ایکہ والوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا"۔

قالوا یا شعیب اصلوٰتك تامرك ان نترك ما یعبد آباء نا او ان نفعل

فی اموالنا ما نشآء۝ (پارہ:۱۲، س:۱۱، آیت:۸۷)

"قوم نے کہا اے شعیب کیا تیری نماز تجھے یہی حکم دیتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے تھے، یا اپنے مالوں میں اپنی خواہش کے مطابق معاملہ نہ کریں"۔

قال الملا الذین استکبروا من قومه لنخرجنك یا شعیب والذین آمنوا معك من قریتنا او لتعودن فی ملتنا۝

(پارہ: ۹، س: ۷، آیت: ۸۸)

"اس قوم کے متکبر لیڈروں نے کہا اے شعیب ہم تجھے اور انہیں جو تجھ پر ایمان لائے ہیں، اپنے شہر سے ضرور نکال دینگے یا یہ کہ ہمارے دین میں واپس آجاؤ"۔

تشریح : شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان اختلافی مسائل میں سے امتیازی مسئلہ آزادی ملکیت کا تھا قوم چاہتی تھی کہ اقتصادیات اور ملکیت کے بارے میں مکمل آزادی ہو، ہم جس طرح چاہیں کمائیں اور خرچ کریں اس بارے میں ہمیں مکمل حریت اور آزادی حاصل ہو جو بعینہ آج کی مروجہ جمہوریت کا ایک بنیادی رکن ہے۔

شعیب علیہ السلام نے ہر چند انہیں سمجھایا کہ اس طرح بے لگام آزادی ملکیت سے زمین کے اندر فتنہ و فساد اور امیر و غریب کے درمیان طبقاتی کشمکش کی بنیاد پڑے گی، لہٰذا آزادی ملکیت خدائی قوانین کے دائرے کے اندر ہونی چاہیے جس میں تمہاری اپنی بھلائی ہے۔

مگر قوم نے عوامی طاقت کے بل بوتے پر انہیں دوٹوک جواب دے کر افہام و تفہیم کا دروازہ بند کیا کہ یا تو تمہیں ملک چھوڑنا ہوگا یا عوام کی اکثریت کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہوگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلاف زبردست اکثریت

لئن لم تنته لا رجمنك واهجرني مليا○

(پارہ: ١٦، س: ١٩، آیت: ٤٦)

"باپ نے کہا اگر تو باز نہ آیا تو میں ضرور تجھے سنگسار کردوں گا اور مجھ سے ایک مدت تک دور ہو جا"۔

فما كان جواب قومه الا ان قالوا اقتلوه او حرقوه○

(پارہ: ٢٠، س: ٢٩، آیت: ٢٤)

"پھر اس کی (ابراہیم کی) قوم کا اس کے سوا اور کوئی جواب نہ تھا کہ اسے مار ڈالو یا جلا ڈالو"۔

فآمن له لوط وقال انى مهاجر الى ربى○

(پارہ: ٢٠، س: ٢٩، آیت: ٢٦)

"پھر اس پر لوط ایمان لایا اور ابراہیم نے کہا بے شک میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں"۔

تشریح: دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کتنی اقلیت میں ہیں، ایک طرف تو انہیں قوم قتل کرنے اور زندہ جلانے کی دھمکی دے رہی ہے تو دوسری طرف والد سنگسار کرنے کی وارننگ دے رہا ہے، پوری قوم میں سے ایمان لانے والوں میں قابل ذکر ہستی لوط علیہ السلام ہی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون میں سے اکثریت کس کے ساتھ؟

ولقد ارسلنا موسى بآياتنا وسلطن مبين○ الى فرعون وملائه

فاتبعوا امر فرعون وما امر فرعون برشید○

(پارہ: ۱۲، س: ۱۱، آیت: ۹۷)

"تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیاں اور واضح سند دے کر بھیجا فرعون اور اس کے قومی نمائندوں کے پاس پھر وہ فرعون کے حکم پر چلے اور فرعون کا حکم حق بجانب نہ تھا"۔

فارسل فرعون فی المدآئن حاشرین ○ ان ھوء لآء لشرذمة قلیلون○ وانھم لنا لغائظون○ وانا لجمیع حذرون○

(پارہ: ۱۹، س: ۲۶، آیت: ۵۳)

"پھر فرعون نے شہروں میں جمع کرنے والے ڈھنڈورچی بھیجے کہ بے شک یہ ایک مٹھی بھر ٹولہ ہے اور انہوں نے ہمیں بہت غصہ دلایا ہے اور بے شک ہم ہیبت ناک اور رعب دار اکثریت والے ہیں"۔

تشریح: دیکھئے فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نیچا دکھانے کے لئے بعینہ وہی طریقہ کار اور وہی زبان استعمال کی، جو آج کل کے جمہوریت پرست استعمال کر رہے ہیں کہ پہلے منصوبے کے تحت ملک کے کونے کونے میں منادی کرادی کہ موسیٰ اور اس کے ساتھی مٹھی بھر سا گروہ ہے اور ہر وقت ہمیں بلاوجہ اشتعال دلا رہے ہیں (یہ گویا کہ آج کل ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے جمہوریت کے پراپیگنڈے کی ابتدائی اور غیر ترقی یافتہ شکل تھی) اور پھر موسیٰ علیہ السلام کے خلاف عوامی قوت کے مظاہرے کے لئے جملہ شہروں سے عوام کو لانے اور ایک بڑے اجتماع اور ریلی کا انتظام کیا اور عوام نے فرعون کی اس مہم کا سو فیصد مثبت جواب دیا۔

اکثریت ہمیشہ انبیاء علیہم السلام اور حق کے خلاف رہی ہے

ولقد ارسلنا نوحا وابراهيم وجعلنا فى ذريتهما النبوة والكتاب فمنهم مهتد وكثير منهم فاسقون○ ثم قفينا على آثارهم برسلنا وقفينا بعيسىٰ ابن مريم وآتينه الانجيل وجعلنا فى قلوب الذين اتبعوه رأفة ورحمة (الى ان قال) فآتينا الذين آمنوا منهم اجرهم وكثير منهم فاسقون○ (پارہ:۲۷، س:۵۷، آیت:۲۷)

"اور ہم نے نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا اور ہم نے ان دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھی تھی پس بعض تو ان میں سے راہ راست پر رہے اور اکثریت ان میں سے نافرمان ہیں۔ پھر ان کے بعد ہم نے اپنے اور رسول بھیجے اور بعد میں عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم بھیجا اور اسے ہم نے انجیل دی اور اس کے ماننے والوں کے دلوں میں ہم نے نرمی اور مہربانی رکھدی (تا آنکہ فرمایا) پس ہم نے ان میں سے ایمان لانے والوں کو ان کا اجر دے دیا اور اکثریت تو ان میں سے فاسق اور بدکار رہی"۔

تشریح: دیکھئے نوح علیہ السلام سے لیکر عیسیٰ علیہ السلام تک جملہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخلص پیروکار ہمیشہ اقلیت میں رہے، اور اکثریت کا ووٹ اور رائے ان کے خلاف رہی۔

انسانوں میں اللہ والے اقلیت میں ہوتے ہیں

اعملوا آل داؤد شكرا وقليل من عبادى الشكور○

(پارہ: ۲۲، س: ۳۴، آیت: ۱۳)

"اے آل داؤد تم شکر کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری اطاعت کرو اور میرے بندوں میں سے شکر گذار اقلیت میں ہیں"۔

اہل کتاب یہود اور نصاریٰ کی اکثریت کا کردار اور فیصلے

منهم المومنون واكثرهم الفاسقونo

(پارہ: ٤، س: ٣، آیت: ١١٠)

"اہل کتاب میں سے تھوڑے مومن ہیں اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں"۔

وكثير منهم ساء ما يعملونo

(پارہ: ٦، س: ٥، آیت: ٦٦)

"اور اکثر ان میں سے (اہل کتاب میں سے) برے کام کر رہے ہیں"۔

وليزيدن كثيرا منهم ما انزل اليك من ربك طغيانا وكفراo

(پارہ: ٦، س: ٥، آیت: ٦٤)

"جو کتاب تیرے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہے وہ اہل کتاب میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں زیادتی کا باعث بن گئی"۔

ثم توليتم الا قليلا منكم وانتم معرضونo

(پارہ: ١، س: ٢، آیت: ٨٣)

"پھر (اے اہل کتاب) تم میں سے سوائے چند آدمیوں کے سب حق بات سے منہ موڑ کر پھر گئے"۔

فقليلا ما يومنونo

(پارہ: ١، س: ٢، آیت: ٨٨)

"سو (اہل کتاب میں سے) بہت ہی کم ایمان لاتے ہیں"۔

فلما کتب علیهم القتال تولوا الا قلیلا منهم واللہ علیم بالظالمین○ (پارہ: ۲، س: ۲، آیت: ۲۴۶)

"جب اہل کتاب پر لڑائی فرض کی گئی تو سوائے چند آدمیوں کے سب حکم ماننے سے پھر گئے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے"۔

ولا تزال تطلع علی خائنة منهم الا قلیلا منهم○

(پارہ: ۶، س: ۵، آیت: ۱۳)

"اور تو ہمیشہ ان کی خیانت پر اطلاع پاتا رہے گا مگر سوائے چند ان میں سے (کہ وہ امین ہیں)"۔

کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللہ○

(پارہ: ۲، س: ۲، آیت: ۲۴۹)

"بارہا قلیت اکثریت پر اللہ کے حکم سے غالب ہوئی ہے"۔

مشرکین اور کافروں کی اکثریت

واکثرھم لا یعقلون○

(پارہ: ۷، س: ۵، آیت: ۱۰۳)

"مشرکین میں سے اکثر بے عقل اور احمق ہیں"۔

ولکن اکثرھم لا یعلمون○

(پارہ: ۹، س: ۸، آیت: ۳۴)

"لیکن ان مشرکین میں سے اکثر بے علم ہیں"۔

وما یتبع اکثرھم الا ظنا○

(پارہ: ۱۱، س: ۱۰، آیت: ۳۶)

"اور مشرکین اکثر گمان اور اٹکل کی پیروی کرتے ہیں"۔

واکثرھم فاسقون○

(پارہ: ۱۰، س: ۹، آیت: ۸)

"مشرکین کے اکثر فاسق یعنی بد عہد ہیں"۔

لوگوں کی اکثریت بد عہد اور فاسق ہے

تلک القری نقص علیک من انبائھا (الی ان قال) وما وجدنا لاکثرھم من عھد وان وجدنا اکثرھم لفاسقین○

(پارہ: ۹، س: ۷، آیت: ۱۰۲)

"یہ بستیاں ہیں کہ سناتے ہیں ہم تجھ کو ان کے کچھ حالات...... اور ان کے اکثر لوگوں میں ہم نے عہد کا وفانہ پایا اور اکثر ان میں نافرمان پائے"۔

لوگوں کی اکثریت اصلاح کی حامی نہیں

فلو لا کان من القرون من قبلکم او لوا بقیة ینھون عن الفساد فی الارض الا قلیلا ممن انجینا منھم○

(پارہ: ۱۲، س: ۱۱، آیت: ۱۱۶)

"سو ان قوموں میں سے جو تم سے پہلے تھیں ایسے لوگ کیوں نہ ہوئے جو ملک میں فساد پھیلانے سے منع کرتے بجز چند آدمیوں کے جنہیں ہم نے ان میں سے بچالیا تھا"۔

مومنین میں سے اکثریت کا کردار

وما یومن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون○

(پارہ: ۱۳، س: ۱۲، آیت: ۱۰۶)

"مومنین میں سے اکثریت ایسی ہے جو اللہ کو مانتے ہوئے بھی شرک کرتے ہیں"۔

ویوم حنین اذا اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئا وضاقت علیکم الارض بما رحبت○ (پارہ: ۱۰، س: ۹، آیت: ۲۵)

"اور حنین کا دن یاد کرو جب تمہیں اپنی اکثریت پر گھمنڈ تھا یعنی اکثریت کو فیصلہ کن سمجھا پھر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور تم پر زمین باوجود فراخی کے تنگ ہو گئی یعنی کثرت کو فیصلہ کن سمجھنا تمہاری غلطی تھی"۔

لوگوں کی اکثریت اور راہ ایمان

وما اکثر الناس ولو حرصت بمومنین○

(پارہ: ۱۳، س: ۱۲، آیت: ۱۰۳)

"اور اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں خواہ (اے پیغمبر) تو کتنا ہی چاہے"۔

ابلیس کا دعویٰ اکثریت

قال فبما اغویتنی لا قعدن لھم صراطك المستقیم. ثم لآتینھم من بین ایدیھم ومن خلفھم وعن اَیمَانِھِمْ وعن شمآئلھم ولا تجد اکثرھم شاکرین○ (پارہ: ۸، س: ۷، آیت: ۱۷)

"ابلیس نے کہا (اے رب) جیسے تو نے مجھے (انسان کے سبب) گمراہ کیا میں بھی ضرور ان کے تاک میں تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا پھر ان کے پاس ان کے آگے کی طرف سے ان کی پشت کی طرف سے ان کی دائیں سے اور ان کی بائیں سے آؤں گا اور تو ان میں سے اکثریت کو شکر گذار نہیں پائے گا"۔

قال ارایتك هذا الذی كرمت علی لئن اخرتن الی یوم القیامة لاحتنكن ذریته الا قلیلا○ (پارہ: ۱۵، س: ۱۷، آیت: ۶۲)

"ابلیس نے کہا بھلا دیکھ تو یہ شخص (آدم) جسے تو نے مجھ سے بڑھایا اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے یعنی زندہ رکھے تو میں ان کی اولاد کی اکثریت کو اپنا ہمنوا بنالوں گا بجز ان کی اقلیت کے"۔

اللہ تعالیٰ نے بھی ابلیس کے دعویٰ اکثریت کی تصدیق کر دی

ولقد صدق علیهم ابلیس ظنه فاتبعوه الا فریقا من المومنین○

(پارہ: ۲۲، س: ۳۴، آیت: ۳۰)

"تحقیق شیطان نے ان پر یعنی نسل آدم کے متعلق اپنا گمان سچ کر دکھایا مومنین کے ایک گروہ کے سوا سب اس کے تابع ہو گئے"۔

تشریح: اکثریت کے فیصلوں اور کردار پر روشنی ڈالنے والی سینکڑوں آیات قرآنی میں سے بطور نمونہ چند آیات آپ کے سامنے ہیں، جن میں پوری انسانیت کی اکثریت کی رائے، فیصلوں اور ووٹ کا اجمالاً بیان ہے، اور پھر تفصیلاً جملہ انبیاء علیہم السلام کی امتوں کی اکثریت کا عمل، فیصلے اور رائے ووٹ کے متعلق قرآن نے بتادیا کہ یہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کردار اور تعلیمات کے قطعاً خلاف تھی، نیز ان آیات میں تصریح ہے کہ اہل

کتاب، سابقہ امتوں اور امت محمدیہ میں سے بھی اکثریت ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے برعکس ابلیس کی اطاعت کے حق میں عملی فیصلہ دے چکی ہے۔ مزید برآں اکثریت کی گمراہی، ناشکری، اور شیطان کی اطاعت کے متعلق ابلیس لعین کے تخمینے اور پیشین گوئی کی تصدیق اللہ تعالیٰ نے خود فرمادی اور قرآن کریم نے اکثریت کے فیصلے کی گمراہی اور باطل ہونے کے متعلق جو حقائق پیش کیے ہیں، پوری انسانیت کی تاریخ ان کی حرف بحرف سچائی کی ناقابل انکار گواہ ہے جس کسی نے بھی انسانی اعمال اور کردار کو قلم بند کرنے کے لئے قلم اٹھایا ہے اس نے انسانوں کی اکثریت کی حماقت، جہالت، ظلم و بربریت، قتل وغارتگری، فتنہ وفساد اور نفس پرستی کی شہادت دی ہے حتیٰ کہ انسانوں کی اکثریت کی شامت اعمال کے نتیجے میں جو دو (۲) عظیم جنگیں ہو چکی ہیں ان کے زخم ہنوز مندمل نہیں ہوئے کہ انسانیت کی اکثریت کی انانیت اور ملک گیری کی ہوس نے تیسری عالم گیر جنگ بلکہ قیامت خیز سٹار وار کے لئے زمین ہموار کرنا شروع کردی ہے اور بطور مقدمۃ الجیش کے ملک ملک، شہر شہر اور گھر گھر بدامنی، قتل وغارتگری، فتنہ وفساد برپا ہیں، جس کی زد سے (تخریب کاری سے) نہ تو بر و بحر محفوظ ہیں نہ خلاء و فضاء مامون ہیں "ظهر الفساد فی البر والبحر بما كسبت ايدی الناس" (اور انسانیت کی اکثریت کی اس روش کا، فرشتوں نے تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے کتنا درست تخمینہ لگایا تھا، جس کی تردید اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی بلکہ فرمایا کہ جو کچھ تم جانتے ہو میں وہ بھی جانتا ہوں اور اس پر مزید وہ بھی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ:

قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدمآء (الى ان قال) قال انی اعلم ما لا تعلمون ○

(پارہ: ۱، س: ۲، آیت: ۳۰)

"کہا فرشتوں نے کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اس میں

اور خون بہائے...... فرمایا بے شک مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے......

واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون٥

(پارہ: ۱، س: ۲، آیت: ۳۳)

''اور جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو''۔

اگر کوئی منصف مزاج مسلم یا غیر مسلم جمہوریت کی اندھی تقلید کی عینک اتار کر ان حقائق پر نظر ڈالے تو دین جمہوریت کی اکثریت کا معیار حق ہونے کی اصل اور عقیدے کے باطل ہونے میں اسے سر مو شک وشبہ باقی نہیں رہے گا۔

ان حقائق اور شواہد کو ذہن میں رکھتے ہوئے جمہوریت کے علم برداروں کے بنیادی عقیدے کا اعلان ایک بار پھر ملاحظہ فرمایئے کہ۔

''عوام ہمیشہ درست فیصلے کرتے ہیں''۔

''عوام ہمیشہ حق پر ہوتے ہیں''۔

''زبان خلق نقارۂ خدا ہے''۔

''عوام کبھی غلطی پر نہیں ہوتے''۔

''طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں''۔

ببین تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

باب ششم

اکثریت کی آمریت یا چنگیزیت

اکثریت کی حکومت کے نام سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ جمہوری حکومت کی ابتدا جن خوش نما دعوؤں اور اعلانات سے کی جاتی ہے (یعنی یہ کہ جمہوریت میں حکومت عوام کی ہوتی ہے حکمران عوام ہوتے ہیں اور ہر ایک فرد حاکم ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔)

عملاً معاملہ بالکل ان دعوؤں کے برعکس ہوتا ہے اور اکثریت (اگرچہ سادہ اکثریت کیوں نہ ہو) کے مقابلے میں اقلیت کا ایک معتدبہ گروہ یعنی ۵۱ فیصد کے مقابلے میں ۴۹ فیصد ہمیشہ کے لئے اکثر ممالک میں حکومت سے محروم ہوتا ہے۔ اکثریتی پارٹی ان پر اپنی مرضی مسلط کرلیتی ہے، چونکہ جمہوریت میں کوئی بنیادی اصول اور ضابطہ اخلاق ایسا نہیں جو اکثریت کے فیصلوں کو لگام دے اس لئے بنیادی حقوق بھی قربان کئے جاسکتے ہیں اور چونکہ ملکی مفاد یا عوامی فلاح و بہبود کا تعین بھی اکثریتی فیصلے کی مرہون منت ہے، لہٰذا ملک سے غداری یا وفاداری کے سرٹیفکیٹ کا اجرا بھی اکثریتی فیصلے کی صوابدید پر ہوتا ہے۔ عدلیہ بھی اکثریتی فیصلے کی دست نگر ہے اور یہ اس لئے کہ اسمبلی چونکہ مقننہ (قانون بنانے والی) ہے لہٰذا اسمبلی میں اکثریت کے بل بوتے پر جو قانون منسوخ کیا جائے یا اس میں ترمیم کی جائے اور اس کی جگہ نیا قانون بنایا جائے تو عدالتیں اس اکثریتی فیصلے کی پابند ہونگی نیز بنیادی حقوق کی جو شق اکثریتی فیصلے میں ملکی مفاد یا عوامی فلاح و بہبود اور ترقی کے منافی قرار دی جائے وہ شق معطل یا منسوخ ہو جائے گی بلکہ مذہبی سرگرمیوں کا بھی یہی حال ہے کہ جس مذہب کی جن سرگرمیوں پر بندش لگانا ہو تو اتنی بات کافی ہے کہ اسمبلی میں اکثریت والی پارٹی بل پاس کرلے کہ فلاں قسم کا قول یا فعل یا تحریر و تقریر امن عامہ یا ملکی مفاد کے منافی ہے، بس وہ ممنوع اور ناجائز

ہوا۔ اور پھر اگر کل کی ناجائز ٹھہرائی ہوئی چیز آج جائز ٹھہرانا چاہیں تو بھی آسانی سے اکثریت اس میں ترمیم کرلے یا اسے منسوخ کردے یا اس میں کسی استثنائی شق کا اضافہ کردے گویا کہ اکثریت کا فیصلہ چراغ الہ دین ہے، جس کے سامنے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔

اس طرح اکثریتی پارٹی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے انتہائی ظالمانہ اقدامات اور خودسری کا مظاہرہ کرنے لگتی ہے کہ جس میں نہ تو اقلیت کے اغراض اور خواہشات کی پرواہ کی جاتی ہے، نہ کسی کا جان ومال محفوظ رہتا ہے، نہ عزت و آبرو باقی رہتی ہے اور نہ دین ومذہب کا تقدس باقی رہتا ہے۔

اس طرح اکثریتی حکومت آمریت اور چنگیزیت سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔

•

دین جمہوریت کا ''اجتماعی فلاح کا قانون''

اکثریت کی آمریت اور مظالم کے جواز کے لئے اور اکثریتی حکومت کو وسیع تر اختیارات دینے کے لئے ''اجتماعی فلاح کا قانون'' وضع کیا گیا چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جتنے جمہوری دساتیر بنائے گئے ہیں قریب قریب ان سب میں اس قسم کی دفعات رکھی گئی ہیں جن کی بنا پر اجتماعی فلاح کی خاطر انفرادی فلاح قربان کی جاسکتی ہے۔ اس طرح حکومت کو شخصی املاک اور شخصی کاروبار (یعنی شخصی آزادی، اقوال وافعال، افکار و نظریات، تحریر و تقریر اور شخصی بنیادی حقوق وغیرہ) میں دخل دینے کے نہایت وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں مثلاً تاجر کے مال کو جبراً فروخت کرادینا، شخصی املاک پر معاوضہ دے کر یا بلا معاوضہ قبضہ کرلینا اور باشندوں کی سکونت یا نو آبادکاری یا زرعی ترقی کے لئے زمینوں کو بلا معاوضہ ضبط کرنا حتیٰ کہ زندگی کے جملہ شعبوں میں دخل دینا۔

(تحریک آزادی ہند اور مسلمان، باب ۱۵۔ بنیادی حقوق از مولانا مودودی۔ دستور جرمنی دفعہ ۱۵۳، پارہ دوم، دستور پولینڈ دفعہ ۹۹، دستور چیکوسلاواکیہ دفعہ ۱۰۹ و ۱۵۵، دستور

یوگوسلاویہ دفعہ ۴۳ اور دستور جرمنی دفعہ ۱۵۴، دستور یوگوسلاویہ دفعہ ۲۵ اور دفعہ ۳۹)

اجتماعی فلاح کا قانون کیا ہونا چاہیے؟ اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ یہ فیصلہ کرنا بھی اکثریت کا کام ہے۔ اس طرح اب اکثریت کے ظلم وجور اور استبداد کی کوئی حد نہیں رہ جاتی۔ اقلیت کی پوری زندگی کے دروازے اکثریت کے قاہرانہ مداخلت کے لئے کھل جاتے ہیں، وہ اس کے تمدن اس کی معیشت و معاشرت اور اس کے مذہبی قوانین میں اجتماعی مفاد کے نام سے جس طرح اور جتنی چاہے مداخلت کر سکتی ہے اور تعلیم کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لے کر اقلیت کی قومیت کو بالکل مٹا دینے کی بھی کوشش کر سکتی ہے۔ (تحریک آزادی ہند اور مسلمان صفحہ ۲۹۴)

امریکہ میں اکثریت کی بربریت اور اقلیت کی مظلومیت

امریکہ جو جمہوریت، جمہوری مساوات اور جمہوریت کے بنیادی اصولوں میں امام سمجھا جاتا ہے۔ وہاں اکثریت اور اقلیت کے مابین مساوات کے نام سے ظلم وجور کا ایک بازار گرم ہے۔

امریکہ میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ حبشی یعنی سیاہ فام آباد ہیں جن کا تناسب کل آبادی یعنی سفید فام امریکیوں کے لحاظ سے ۹ فیصد سے کچھ زیادہ ہے۔ دستور کی رو سے ان کو سفید فام امریکیوں کے برابر پورے شہری حقوق حاصل ہیں، بنیادی حقوق کے چارٹر اور مساوات کے لحاظ سے سیاہ فام اور سفید فام میں کوئی امتیاز نہیں ہے مگر عملاً کیا ہو رہا ہے؟

سفید فاموں کی اکثریت اور حکومت، سیاہ فام اقلیت کے ساتھ نہ صرف کھلم کھلا امتیازی برتاؤ اور ان کے بنیادی حقوق سلب کر رہی ہے بلکہ انہیں انسانیت کے درجے میں شمار کرنے سے کتراتی ہے۔ حتیٰ کہ سفید فاموں کے کلیساؤں میں سیاہ فاموں کا داخلہ ممنوع ہے۔ ان کے ہوٹلوں، تھیٹروں اور ریسٹورنٹوں میں وہ قدم نہیں رکھ سکتے ان کی تفریح گاہوں میں

کوئی سیاہ فام اگر چلا جاتا ہے تو سخت ذلیل کر کے نکالا جاتا ہے۔ بسوں اور ریل کے ڈبوں میں بھی سفید فام کے ساتھ حبشی کا بیٹھنا جائز نہیں ہوتا۔ سفید فاموں کے محلات میں کوئی سیاہ فام بچہ ایک ہی اسکول میں نہیں بیٹھ سکتا ان کی جان ومال، عزت و آبرو کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں۔ حتیٰ کہ ان کے ساتھ انتہائی وحشیانہ برتاؤ کرنے پر بھی نہ تو سفید فاموں کا ضمیر ہچکچاتا ہے اور نہ قانون کی مشین حرکت میں آتی ہے۔

امریکہ میں بغیر کسی سائنٹیفک دلیل کے سیاہ فاموں کے متعلق یہ بے بنیاد نظریہ قائم کیا گیا تھا کہ حیاتی نقطۂ نظر سے (Biologcally) وہ تعلیم کے لئے نااہل ہیں، اور عمرانی نقطۂ نظر سے (Socially) ان کو تعلیم دینا انہیں ناکارہ بنادیتا ہے یعنی پھر وہ خدمتگار بننے کی بجائے برابر والے بننے لگیں گے۔

قانون کی نگاہ میں سفید فام اور سیاہ فام اگرچہ لفظاً اور تحریراً برابر ہیں، مگر عملی میدان میں ایسا نہیں، ایک ہی نوعیت کے جرم میں سیاہ فام کے لئے قید کی مدت ہمیشہ زیادہ رکھی جاتی ہے۔

آبادی میں تو سیاہ فاموں کا تناسب ۹ فیصد ہے مگر جیل خانوں مین ان کا تناسب سفید فاموں کی نسبت ۳۱ فیصد ہے۔

(Encyclo Paedia Britainica Article Negrocism in America)

(امریکہ میں سیاہ فام) انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کے مطابق ۱۸۸۰ء میں حبشی قیدی فی لاکھ آبادی ۲۴۴ تھے اور سفید فام صرف ۶۹۔ ۱۸۹۰ء میں حبشی قیدی فی لاکھ آبادی ۲۶۴ تھے اور سفید فام صرف ۸۴۔ ۱۹۰۴ء میں حبشی قیدی فی لاکھ آبادی ۲۷۸ تھے اور سفید فام صرف ۷۷۔ ۱۹۱۰ء میں حبشی قیدی فی لاکھ آبادی ۲۸۴ تھے اور سفید فام صرف ۸۹۔ ۱۹۲۳ء میں حبشی قیدی فی لاکھ آبادی ۳۲۷ تھے اور سفید فام صرف ۷۷۔

اس طرح سفید فاموں کی تعداد تو جیل خانوں کی آبادی میں برابر کم ہوتی جارہی ہے

جبکہ سیاہ فاموں کی تعداد بڑھ رہی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ سیاہ فام زیادہ جرائم کرتے ہیں شکاگو میں ایک کمیشن نسلی تعلقات کی تحقیق کے لئے مقرر کیا گیا تھا جو (Chicago Commission of recial relations) کے نام سے مشہور ہے اس کمیشن کی رپورٹ (Negroes in Chicago) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

اس کمیشن* کے سامنے ایک جج نے بیان دیتے ہوئے کہا "جس شہادت کو جیوری ایک حبشی کو مجرم قرار دینے کے لئے کافی سمجھتی ہے وہی شہادت سفید فام کو سزا دینے کے لئے ناکافی سمجھی جاتی ہے"۔ ایک دوسرے جج نے بیان دیتے ہوئے کہا "ایک ہی طرح کے حالات اور واقعات میں سیاہ فام کو سزا دینا آسان ہے اور سفید فام کو سزا دینا مشکل۔ حبشیوں اور سفید فاموں کے فسادات میں پولیس تمام تر حبشیوں کو پکڑتی ہے اور سفید فاموں پر شاذ ونادر ہی ہاتھ ڈالا جاتا ہے"۔

شکاگو کمیشن اپنی تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"تمام شہادتیں قریب قریب متفق ہیں کہ حبشی بہ نسبت سفید فاموں کے زیادہ پکڑے جاتے ہیں۔ کیونکہ پولیس کا عام مفروضہ یہ ہے کہ سیاہ فام زیادہ جرائم پیشہ ہوتے ہیں، اور پولیس یہ بھی جانتی ہے کہ حبشی کو گرفتار کر لینے میں کوئی خطرہ نہیں، سفید فام ہو تو اس پر ذرا احتیاط سے ہاتھ ڈالنا چاہئے...... ایک ایک جرم میں بہت سے حبشی پکڑ لئے جاتے ہیں لہٰذا محض قید خانوں میں حبشیوں کی آبادی زیادہ دیکھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ زیادہ جرم کرتے ہیں۔ سفید فاموں کی بہ نسبت حبشی کم ہی گرفتاری سے بچ سکتا ہے"۔

امریکہ میں انصاف کا ایک نرالا طریقہ رائج ہے جسے لنچ کرنا (Lynching) کہتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ عوام جب عدالت کے فیصلے سے مطمئن نہ ہوں یا قانون کی سست رفتار مشین کو آہستہ چلتے دیکھ کر صبر نہ کر سکیں تو قانون کو خود ہاتھ میں لے لیں اور جس شخص کو وہ مجرم سمجھتے ہوں اسے اپنے نزدیک جو منصفانہ سزا چاہیں دے دیں۔ اس طریقۂ انصاف کا دار

عموماً سیاہ فاموں پر ہی ہوتا ہے۔

چنانچہ "نیویارک ورلڈ" نے ۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۶ء تک کے جو اعداد و شمار شائع کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۱ سال کی مدت میں ۳۶۰۵ سیاہ فام برسرعام لنچ کئے گئے۔

۱۸۶۵ء سے امریکہ میں سفید فاموں کی خفیہ جماعت کام کر رہی ہے، جس کا نام کوکلکس کلان (Kuklux Klan) ہے، اس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ سیاہ فام لوگوں پر سفید فاموں کے تفوق (برتری) کی حفاظت کی جائے اور امریکہ میں کالی نسل کے مسئلے (Negro Problem) کو اس طرح حل کیا جائے کہ ریڈ انڈین قوم کی طرح یہ قوم بھی رفتہ رفتہ فنا ہو جائے۔ ریڈ انڈین وہ قوم ہے جو سفید فاموں سے پہلے امریکہ میں آباد تھی۔ ۱۷۹۰ء سے اب تک امریکہ کی گوری نسل میں ۱۳ سو فیصد اضافہ ہوا ہے اور ریڈ انڈین نسل کی آبادی میں ۵۰ فیصد کمی ہوئی ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اس صدی کے خاتمہ تک ایک بھی ریڈ انڈین باقی نہ رہے گا۔

"کوکلکس کلان" ایک بہت مضبوط باا‌ثر تنظیم ہے ۱۹۲۳ء میں اس جماعت کے ارکان کی تعداد پندرہ لاکھ تھی ملک کے اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ اونچی سوسائٹی والے اور حکومت کے حلقوں سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ اس میں شریک ہیں صوبوں کا گورنر، پولیس، جیل اور عدالت کے حکام تک ان سے ساز باز رکھتے ہیں، اسی وجہ سے اس جماعت کے ارکان سیاہ فاموں کے خلاف بڑے بڑے ہولناک جرائم کر جاتے ہیں اور کبھی بھی پکڑے نہیں جاتے۔

چند ہولناک جرائم کے سلسلہ میں ٹیکساس (Taxas) کے گورنر نے تحقیقات کرائیں تو پتہ چلا کہ مجرموں میں ایک تو پادری صاحب تھے، اور متعدد ایسے لوگ تھے جو خود گورنر صاحب کے احباب سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ مہذب لوگ حبشیوں کے مسئلے کو کس طرح حل کر رہے ہیں؟ چند مثالیں ملاحظہ

فرمایئے:

ایک حبشی کو مارتے مارتے بیہوش کر دیا گیا اور ننگا کر کے جنگل میں چھوڑ آئے تاکہ سردی سے مر جائے۔

ایک حبشی کو پکڑ کر جنگل لے گئے رسیوں اور خار دار تاروں سے اسے باندھا ہنٹر مار مار کر اس کی کھال ادھیڑی، پھر اس کے زخموں پر کریازوٹ تیزاب چھڑک کر چل دیئے اور وہ گھنٹوں تڑپ تڑپ کر مرا۔

ایک سیاہ فام عورت اور اس کے لڑکے کو ریل کی پٹری پر باندھ دیا تاکہ ریل ان کے پرخچے اڑا دے ایک سیاہ فام کو اسپتال سے اٹھا کر لے گئے اور اس کو زندہ آگ پر بھون ڈالا ایک بیچارے کو ٹیلیفون کے کھمبے سے باندھا اور مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی"۔

یہ ہے جمہوریت کے علمبردار اور پیش امام ملک امریکہ میں اقلیت کے بنیادی حقوق کا تحفظ اور انسانی مساوات کا مظاہرہ۔

امریکہ کے ان اقدامات کے نتیجہ میں سیاہ فام اقلیت آج ۹ فیصد رہ گئی ہے حالانکہ ۱۷۹۰ء میں ممالک متحدہ امریکہ میں ان کی تعداد ۱۹ فیصد تھی۔

۱۔ (تحریک آزادی ہند اور مسلمان از مولانا مودودی)

۲۔ (نیو ایج رسالہ)

۳۔ (Lynch Law by I-E Cutter)

۴۔ (The negroes in our history by C-G Woods)

۵۔ (The American Race problem by E-B Reuter)

۶۔ (The American negro by M-T-Hesko)

چیکو سلواکیہ میں اکثریتی حکومت کا تجربہ

چیکو سلواکیہ کو ۱۹۵۰ء میں جب آس پاس کی مختلف چھوٹی بڑی قوموں کو ملا کر ایک

جمہوری اسٹیٹ بنایا گیا۔ تو وہاں آباد قابل ذکر قومیں تین تھیں۔ چیک (Czech) دوسرے سلاوک (Slavaks) اور تیسرے جرمن، تینوں قوموں میں گذشتہ ہزار برس میں کوئی چیز مشترک نہ تھی بجز اس کے کہ سب آسٹریا اور ہنگری کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کیلئے متحد ہوئے تھے۔ اس عارضی اتحاد کو دیکھ کر احمقوں نے جمہوری اسٹیٹ بنانے کا فیصلہ کیا اور دستور و آئین میں بنیادی حقوق مساوات وغیرہ جیسی پر فریب دفعات درج کرلیں۔

مگر جلد ہی ثابت ہوا کہ دین جمہوریت کے دساتیر اور دستاویزات میں کچھ اور ہے، اور عملی میدان میں معاملہ برعکس ہے۔

چیک کثیر التعداد تھے جدید تعلیم اور سرمایہ داری میں پیش پیش تھے، اور اس کے نتیجہ میں مذہب سے بیزار تھے، ان کے برعکس سلاوک لوگ تعداد میں بہ نسبت چیک ایک تہائی تھے۔ پابند مذہب، زراعت پیشہ۔ خستہ حال اور جدید تعلیم میں پس ماندہ جرمن اس سے اقلیت میں تھے اور چھوٹی اقلیتوں میں اتحاد کا فقدان تھا چیک قوم نے اکثریت کے بل بوتے پر (Secular States) لادینی ریاست کو اپنالیا۔ دستور اور آئین کے لحاظ سے تمام مذاہب کو آزادی دے دی گئی۔

جملہ فرقوں کو بنیادی حقوق اور مساوات اور عوام کی حکمرانی کے سبز باغ دکھائے گئے، مگر عملی میدان میں چیک اکثریت کی حکومت نے سلاوک اور جرمن جن کی تعداد ۳۵ لاکھ تھی کو جملہ مراعات سے محروم کر دیا ان کے نظام تعلیم میں مداخلت کی اُن ہی کی اکثریت والے علاقوں میں چیک آدمی بھیجے گئے حتی کہ سرکاری کاروبار اور تجارتی کام کاج کے ٹھیکوں تک ہر کام میں چیکوں کو مقدم رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ چھوٹی اقوام آزادی کے لئے پھر تڑپنے لگیں۔ (تحریک آزادی ہند اور مسلمان)

ہندوستان میں اکثریت کے وحشیانہ مظالم

دور دراز زمانے اور ممالک میں جانے کی بجائے اپنے پڑوسی ملک ہندوستان کی

اکثریتی حکومت کے حالیہ چند سالوں پر نظر ڈالیے۔ سکھ اقلیت کی مقدس ترین عبادت گاہ گولڈن ٹمپل پر وزیر اعظم اندرا گاندھی کے حکم سے فوج نے چڑھائی کی، آنجہانی اندرا گاندھی کے قتل کے بعد دہلی، بمبئی اور کلکتہ میں بے گناہ سکھوں کا قتل عام ہوا، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں تک کو معاف نہ کیا گیا۔

ہر طرف سکھوں کی عزت و آبرو، جان ومال سے ہولی کھیلی گئی اور پولیس خاموش تماشائی بنی رہی، غیر سرکاری تخمینوں کے مطابق آٹھ دس ہزار جانیں اور کروڑوں روپے کی جائیدادیں بھسم، ہضم کرلینے کے بعد کہیں جاکر ہندو اکثریت کے جوش میں کمی آئی۔

مسئلہ ذبح گاؤ کے نتیجہ میں ہنوز اگر لاکھوں کی تعداد میں نہ سہی تو ہزاروں کی تعداد میں یقیناً ہندو اکثریت کے ہاتھوں مسلمان شہید ہو چکے ہیں، ہر تہوار کے موقع پر "خواہ مسلمانوں کا یا ہندوؤں کا" ہندو اکثریت کی مسلمان اقلیت کے خلاف غنڈہ گردی، قتل وغارتگری اور آتش زنی معمول بن چکا ہے۔

سلطان بابر کی صدیوں قبل تعمیر کردہ "بابری مسجد" کے شہید کرنے کے لئے بہانا بنایا گیا کہ یہ جگہ "شری رام" کی جائے ولادت ہے، لہٰذا یہاں ہم "رام مندر" بنائیں گے وزیر اعظم راجیو گاندھی کی اکثریتی حکومت بھی ہندو اکثریت کی ہم نوا بنی چنانچہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو پندرہ کروڑ مسلمان اقلیت کی پرواہ کئے بغیر بابری مسجد کی شہادت کا منصوبہ تکمیل کو پہنچایا گیا۔ ان تازہ ترین اکثریتی مظالم کی روئیداد کو آپ بھی پڑھیے ہفت روزہ تکبیر کراچی ۲۳ نومبر ۱۹۸۹ء نے ان مظالم کی کچھ جھلکیاں حسب ذیل عنوان سے شائع کی ہیں۔

بھاگلپور میں رقص ابلیس

اہنسا کے پجاریوں کے ہاتھوں ہزاروں بے گناہ مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے قتل، اغوا، آبروریزی اور تشدد کے لرزہ خیز واقعات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ (روزنامہ

انڈین ایکسپریس کے نمائندے راھول پاٹھک کی رپورٹ)

''بھاگلپور، سہارام اور بہار کے دیگر شہروں اور قصبوں میں ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہونے والے مسلمانوں کی تعداد اب تک کئی ہزار ہو چکی ہے، اس صورت حال میں متعصب ہندو ہی نہیں پولیس بھی مسلمانوں کے خلاف ایک فریق بن گئی۔ فسادات کا دائرہ پھیلتا چلا گیا اور صرف بھاگلپور شہر میں مرنے والوں کی تعداد بی بی سی کے مطابق ایک ہزار سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس کے علاوہ سہارام اور آس پاس کی تحصیلوں، قصبوں اور گاؤں میں مرنے والوں کی تعداد بھی ہزاروں سے کم نہیں ہے''۔

انڈین ایکسپریس کے فوٹو گرافر شرما نے جب ٹومالی گاؤں کا دورہ کیا تو پورے گاؤں میں نہ کوئی گھر سلامت تھا نہ کوئی فرد زندہ بچا تھا۔ ایک ہندو فیملی جس کے مسلمانوں سے اچھے تعلقات تھے اس کے سربراہ خاندان کے سامنے دس بارہ منٹ میں اس کے انیس پڑوسیوں کو قتل کر دیا گیا۔ یہ دیکھ کر سربراہ خاندان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ بھی وہیں گر کر ختم ہو گیا۔ فوجی افسران نے بتایا کہ سینکڑوں لاشیں دریائے گنگا میں تیرتی دیکھی گئیں۔ یکم نومبر کو بدھ کے دن جو تیس لاشیں ایک کنویں سے برآمد ہوئی تھیں وہ بوریوں میں لپٹی ہوئی تھیں اور انہیں کم از کم دس روز پہلے ہلاک کیا گیا تھا، یہ فسادات بی بی سی کے مطابق اجودھیا میں مسجد کی جگہ مندر تعمیر کرنے کی کوشش پر مسلمانوں کی مزاحمت کے بعد سے شروع ہوئے، مقامی افسروں نے تسلیم کیا کہ فساد شروع ہونے کے بعد سے فوج کے آنے اور راجیو گاندھی کے پہنچنے تک خانہ جنگی کی صورت حال تھی اور محسوس ہوتا تھا کہ پورے علاقے میں جنگل کا قانون رائج ہے، فسادات کے بعد لگ بھگ پچیس ہزار افراد نے مختلف کیمپوں میں پناہ لی۔ ایک کیمپ کے منتظم سماجی کارکن عزیز نصیر الدین خان مانی نے بتایا کہ پناہ لینے والے اکثر و بیشتر افراد بے گھر اور لاوارث ہو چکے ہیں۔ بے سروسامانی کا یہ عالم ہے کہ ان کے پاس کھانے پینے اور پہننے تک کو کپڑے نہیں ہیں ان افراد کے لئے عیسائی مشن نے دودھ اور ادویہ

فراہم کی ہیں، انہوں نے بتایا کہ گرفتار شدگان کی تعداد بھی ایک ہزار کے قریب ہے جب کہ زخمیوں کا علاج نہیں ہو رہا ہے، سینکڑوں مرنے والوں کی لاشیں ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکی ہیں۔

اس بات کا خدشہ ہے کہ لاشیں اسی طرح دیگر مقامات پر پھینک دی گئی ہیں جس طرح کنویں میں پھینک دی گئی تھیں، یا دریا میں بہا دی گئی تھیں ابھی تک بعض گلیوں اور سڑکوں پر مسلمانوں کی لاشیں بکھری پڑی ہیں جس کی بنا پر وبائی امراض پھیل سکتے ہیں، بھارتی فوج کے ایک میجر نے ایک سو مسلمانوں کو فسادیوں سے بچا کر پولیس کے حوالے کیا تھا لیکن ان لوگوں نے جس کمرے میں پناہ لے رکھی تھی پولیس نے اسے باہر سے بند کر کے فسادیوں کے حوالے کر دیا بعد میں میجر نے بتایا کہ وہ کمرہ قصاب خانے میں تبدیل کر دیا گیا اور وہاں سے خون کے دھارے بہہ بہہ کر اطراف کو لالہ زار کرتے رہے کرفیو میں وقفے کے دوران جب لوگ بھوکے پیاسے دکانوں پر خریداری کے لئے نکلے تو ایک ہی بازار میں ۱۸۱ افراد کو پولیس کی موجودگی میں قتل کر دیا گیا۔

فوج کے ایک میجر نے جب ایک اجتماعی قتل کے مقام کا دورہ کیا تو وہاں موجود فوٹو گرافر نے انہیں بتایا کہ اس گاؤں کے تالاب میں سے جو لاشوں سے پٹا پڑا تھا ایک اٹھارہ سالہ زندہ لڑکی ملکہ بیگم کو نکالا گیا ہے، جس کا ایک پیر کٹا ہوا تھا اس نیم برہنہ لڑکی نے زار و قطار روتے ہوئے فوجیوں کو بتایا کہ ہم میں سے اکثر لڑکیوں اور خواتین کی آبروریزی بھی کی گئی تھی، اس کے بعد قتل کر دیا گیا تھا اور لاشیں اس تالاب میں پھینک دی گئی تھیں۔

چمپانگر، ناتھ نگر، تاتارپور، شاہ جنگی، اسحاق چک، صاحب جنگ اور راجون وغیرہ کے علاقوں میں قتل، عصمت دری، لوٹ مار اور آتش زنی کرنے والوں نے تین دن اور تین راتیں خوب اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور موت، بہیمیت اور تباہی و بربادی کا ننگا ناچ بلا روک ٹوک جاری رکھا۔ مواضعات میں جب ہلاک ہونے والوں کی لاشیں لائی گئیں تو ان کے انبار

لگ گئے بہت سی لاشیں گلی سڑی ہوئی تھیں۔ ایک افسر کا کہنا ہے کہ پہلی بار کم از کم ۱۴۵ اور دوسری بار ۲۲۰ لاشیں گنگا میں پھینکیں گئیں، لا تعداد افراد زخمی ہوئے یہ لوگ بھاگلپور میڈیکل کالج میں فرش پر پڑے ہوئے ہیں ان کو بندوقوں اور تلواروں کے زخم آئے ہیں، جان بچانے والی دواؤں کی کمی یا نایابی کی وجہ سے بھی بہت سے زخمی دم توڑ چکے ہیں۔

میں نے متعدد ایسے لوگوں کو دیکھا جو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور جن کے ہاتھوں اور پیروں کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ قتل کرنے والوں نے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کیا تھا۔

فوجی افسروں نے بتایا کہ ایک حاملہ عورت کے پیٹ کو پتھروں سے کچلا گیا تھا یہ کارنامہ ایک ہجوم نے دن دھاڑے بھاگلپور ریلوے اسٹیشن کے پاس ریل کی پٹری پر انجام دیا، پیٹ پھٹ جانے اور اسقاط حمل کے باعث عورت فوراً چل بسی (شہید ہو گئی)۔

جب میں بی۔ ایس۔ ایف کمانڈنٹ کے ساتھ ناتھ نگر تھانے گیا تو وہاں ۶۰ افراد کو دو حوالاتی کمروں میں بھرا ہوا پایا، جن کے فرش پر بیت الخلاء سے بہہ کر آتی ہوئی غلاظت پھیلی ہوئی تھی پولیس والے اس کی وضاحت نہ کر سکے کہ ان مسلمانوں کو کن الزامات میں گرفتار کیا گیا ہے اس گرفتاری کے متعلق تھانے کے روزنامچے میں بھی کوئی اندراج نہیں کیا گیا تھا، یہ لوگ ۳۶ گھنٹے سے ان کمروں میں محبوس تھے۔ (روزنامہ ہندو ۲ نومبر ۱۹۸۹ء)

یہ ہے دین جمہوریت کی مذہبی آزادی، مساوات اور اکثریتی ٹولے کا عدل و انصاف جو بابری مسجد کی شہادت اور وہاں مندر تعمیر کرنے کی ابتدائی انتظامات سے شروع ہوا، نہ جانے اس منحوس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے اور پایۂ تکمیل تک پہنچانے (خدا ایسا نہ کرے) تک مسلمان اقلیت کا کیا حشر ہو گا؟

بابری مسجد کی ابتدائی تعمیر کا دلچسپ اور تاریخ ساز قصہ

موقع و محل کی مناسبت سے نہ صرف مناسب بلکہ ضروری سمجھتا ہوں کہ بابری مسجد کی ابتدا اور تعمیر کا پس منظر بھی آپ کے علم میں آجائے، جس سے اسلامی عدل وانصاف اور جمہوریت کی مساوات پر بھی قابل ذکر روشنی پڑے گی، اس بارے میں (حرکۃ الجہاد الاسلامی پاکستان کے خبر نامہ "الارشاد" کراچی) سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۹ء صفحہ ۱۹ کے ایک مضمون جس کا عنوان ہے "بابری مسجد کی داستان" پر اکتفاء کرتا ہوں جو کہ حسب ذیل ہے، صداقت کی ذمہ داری مندرجہ بالا مضمون نگار کی ہے۔

"اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت تھی بتوں کا ایک پجاری تھا، جس کا نام پنڈت رام لعل تھا بنارس شہر پر عالمگیر کا کوتوال ابراہیم تھا، پنڈت رام لعل کی ایک خوبصورت لڑکی تھی اس کا نام شکندلہ تھا، شکندلہ صبح سویرے سنگھار کر کے نکلی نکھرا ہوا بدن، نکھرا چہرہ، خوبصورتی چاند کو شرما رہی تھی۔

ادھر سے ابراہیم کوتوال کا گذر ہوا ابراہیم کے دل میں شیطان جاگا اور کوتوال شہر نے اپنی عیاشیوں کا سامان بنانے کے لئے ایک برہمن زادی پر اپنی نگاہیں ڈال دیں، اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ اس لڑکی کے گھر کا پتہ لگاؤ سپاہیوں نے پتہ لگا کر ابراہیم کوتوال کو پیش کیا، ابراہیم کوتوال نے سپاہیوں کو بھیج کر پنڈت رام لعل کو بلوایا اور اس سے کہا کہ اے پنڈت! تیری بیٹی چاند سے زیادہ حسین ہے اور گلاب سے زیادہ سرخ ہے، میں اسے اپنی داشتہ بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اپنی بیٹی کا ڈولا سجا کر میری عیاشی کی چوکھٹ پر لاکر رکھ دے ورنہ تیرے گھر کو اجاڑ کر رکھ دونگا، پنڈت روتا ہوا گھر آیا بیوی نے اترا چہرہ دیکھا بیٹی نے باپ کو سسکتا تڑپتا ہوا پایا، پوچھ اٹھی کہ پتاجی کیا بات ہے بچی کا حسین چہرہ دیکھ کر پنڈت رام لعل رونے لگا، اس نے کہا! بیٹی اورنگ زیب کی حکومت میں کسی پنڈت کی عزت محفوظ نہیں

رہ گئی، اس کے کوتوال شہر نے تیری عزت سے کھیلنے کے لئے مجھے صرف ایک ہفتے کی مہلت دی ہے۔ لڑکی دو منٹ کے لئے سکتے میں آئی اور اس کے بعد اس نے ہوش سنبھال لیا اور بولی پتاجی! گھبرانے کی ضرورت نہیں بھگوان ہماری مدد کرے گا۔ آپ کوتوال شہر کے پاس چلے جائیں اور اسے کہیں کہ میری اکلوتی بیٹی ہے، ایک ہفتہ میں ایک باپ اپنی بیٹی کے لئے اپنے ارمان پورے نہیں کر سکتا آپ مجھے ایک ماہ کا وقت دے دیجئے مہینے بھر میں اس کے لئے اچھے کپڑے بناؤں گا، اچھے زیورات لاؤں گا، اور اپنی بیٹی کو سجا کر آپ کے گھر بھیجوں گا، پنڈت نے بیٹی سے کہا اگر ایک ماہ گذر گیا تب کیا ہوگا؟ بیٹی نے کہا! کہ پتاجی اس وقت جو میں کہہ رہی ہوں آپ وہی کیجئے، پنڈت جی گئے اور بولے مہاراج ایک ہفتے کا وقت بہت کم ہے میری بیٹی بھی خوش ہو گئی ہے، میری بیوی بھی خوش ہو گئی ہے کہ ہم بنارس کے کوتوال کے پاس جارہے ہیں، مگر ہمیں کم از کم ایک مہینے کا وقت دیا جائے تاکہ باپ اپنی بیٹی کا ڈولہ سجانے کے لئے اپنے دل کا ارمان نکال سکے۔ یہ بد معاش کوتوال شہر ساٹھ سالہ بڈھا اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا، بولا! ٹھیک ہے پنڈت رام تم سمجھ دار آدمی ہو جاؤ ہم نے تمہیں ایک ماہ کا وقت دیا۔ گھر آکر پنڈت رام نے شکندلہ کو بتایا کہ ہمیں ایک ماہ کا وقت مل گیا ہے بیٹی نے کہا پتاجی بنارس شہر میں مغل شہزادوں کا لباس سلا سلایا بکتا ہے، میرے لئے ایک لباس لے آئیں۔ پنڈت نے کہا بیٹی تو تو لڑکی ہے لڑکوں کے لباس کو کیا کرے گی، شکندلہ بولی پتاجی جو کچھ میں کہتی ہوں آپ وہی کیجئے، مغل شہزادوں کا لباس لایا گیا لڑکی نے وہ لباس پہنا، لڑکی سے لڑکا بنی اصطبل سے گھوڑا نکالا اور کہا پتاجی آپ مجھ پر اعتماد کیجئے میں ٹھیک اٹھائیس دن میں واپس آجاؤں گی، میں جہاں جارہی ہوں مجھے جانے دیجئے، ماں باپ نے بلکتے ہوئے اپنی بیٹی کی گرد سفر دیکھی۔ ایک شہسوار نیا بیٹے کے روپ میں انصاف حاصل کرنے کے لئے مسلسل اپنی منزل کی طرف آگے بڑھتی رہی، دن بھر سفر کرتی تھی اور رات سرائے میں آرام کرتی، ایک ہفتے بعد شکندلہ دہلی پہنچی، جس دن اس نے دہلی کا سورج دیکھا وہ جمعہ کا دن تھا، اس نے سنا تھا کہ اورنگ زیب

عالمگیر جمعہ کے روز جامع مسجد میں نماز پڑھنے آتے ہیں اور نماز پڑھ کر جب قلعہ معلی جاتے ہیں تو سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر فریادی اپنی اپنی فریاد پرچوں پر لکھ کر کھڑے ہوتے ہیں اورنگ زیب کسی فریادی کو محروم نہیں کرتے۔

شکندلہ یہ سن کر جمعہ کے دن جامع مسجد پہنچ گئی لیکن اسے پہنچنے میں دیر ہو گئی جامع مسجد کی ہر سیڑھی فریادیوں سے بھری ہوئی تھی، سب سے نچلی سیڑھی پر بنارسی برہمن زادی شکندلہ کو جگہ ملی وہ مغل شہزادے کی صورت میں کھڑی رہی اپنا دکھ درد پرچے پر لکھ کر ہاتھ میں تھامے رہی اورنگ زیب عالمگیر نماز کے بعد مسجد سے نکلے، مسجد کے زینے طے کر رہے تھے متابعین قلمدان تھامے ہوئے تھے دکھیاروں کا ایک ایک پرچہ خود ہاتھ میں لیتے اور پڑھتے، موقع پر دادرسی کرتے، اور آگے بڑھتے، جب سب سے نچلے زینے پر آئے تو اس مغل شہزادے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد نگاہیں ہٹالیں اور اپنے کندھے سے شال اتاری اس شال کے اندر اپنا ہاتھ چھپا کر آپ نے اس شہزادے کے ہاتھ سے وہ پرچہ لیا، اس نے کہا ہندوستان کے سپاہی، بھارت کے مہاراج یہ بتاؤ کہ آپ نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ ہر آدمی سے آپ نے ہاتھ ملا کر پرچہ لیا میں بھی ایک مغل شہزادہ ہوں میرے ہاتھ کو ہاتھ میں کیوں نہیں لیا، میرے ہاتھ سے اتنی نفرت کیوں کہ اپنے ہاتھ کو کپڑے میں لپیٹ کر مجھ سے چٹھی لی گئی۔ اورنگ زیب کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہی شال میں لپٹا ہوا ہاتھ لڑکے کے سر پہ پھیرا اور کہا کہ بیٹی میں مسلمان ہوں اور میں جانتا ہوں کہ تو لڑکی ہے، لڑکا نہیں اور اسلام غیر محرم کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دیتا، اس لئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا، اب جب جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے تجھے بیٹی کہہ ہی دیا ہے، تو اب تیرے ساتھ بیٹیوں جیسا سلوک کیا جائے گا۔

میری بیٹی کو کونسی تکلیف پہنچی ہے کہ اپنی فریاد لڑکی کی بجائے لڑکے کے روپ میں آکر کر رہی ہے لڑکی اس وقت بادشاہ کے قدموں میں جھکی بادشاہ نے کہا بیٹی میرے مذہب

میں خدا کے سوا کسی کے آگے جھکنے کی اجازت نہیں ہے، میں بھی اس کا ویسا ہی بندہ ہوں جیسے تم لوگ اس کی بندگی کا جذبہ رکھتے ہو۔ یہ تھے اورنگ زیب عالمگیر کے الفاظ۔ لڑکی کو قلعے کے اندر پہنچایا گیا گھر میں جا کر آپ نے اس کی فریاد سنی آنکھوں میں خون اتر آیا آپ نے کہا کہ بیٹی دو روز آرام کرنے کے بعد تجھے ہر چوکی پر گھوڑے بدلنے کی سہولت مل جائے گی، اور ہر جگہ میرے سپاہی تیری حفاظت کے لئے بنارس تک تیرے ساتھ جائیں گے، جا تیرے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ لڑکی نے کہا مہاراج میرا ہندو پرنسپل لاء توڑا جا رہا ہے ایک مسلمان حاکم کوتوال شہر میرا مذہب توڑ رہا ہے، آپ نے فرمایا جاؤ تمہارے ساتھ انصاف کیا جائے گا، لڑکی نے کہا مہاراج وہ انصاف میں سننا چاہتی ہوں تو اورنگ زیب عالمگیر نے فرمایا کہ وہ انصاف یہ ہے کہ رام لعل کو ہندوستان کے شہنشاہ کا پیغام پہنچا دو کہ میرے کوتوال شہر ابراہیم نے جس تاریخ کو تیری بیٹی کا ڈولا سجا کر اپنی عیاشیوں کے لئے اپنی چوکھٹ پر مانگا ہے، اسی تاریخ کو ڈولا سج کر میرے کوتوال کے گھر پہنچ جانا چاہئے یہ میرا فیصلہ ہے، لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ بولی جس سے میں انصاف مانگنے آئی تھی اس نے بھی میری عزت کی تباہی پر آخری مہر لگا دی، لڑکی سسکتی ہوئی بنارس کے لئے روانہ ہوئی ٹھیک وقت پر لڑکی اپنے گھر پہنچی۔ ماں باپ نے پوچھا کہ بیٹی کہاں گئی تھی شکندلہ نے کہا کہ شاہ ہندوستان کے پاس گئی تھی، مگر مجھے افسوس ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر بھی ہمیں انصاف نہ دے سکا۔ پنڈت رام لعل نے بیٹی سے پوچھا کہ اورنگ زیب عالمگیر نے کیا کہا، بولی عالمگیر نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ بیٹی جس دن میرے کوتوال نے ڈولا اپنی عیاشیوں کے لئے اپنی چوکھٹ پر مانگا ہے اسی تاریخ کو ڈولا پہنچنا چاہئے۔ ماں باپ جب رونے لگے تو شکندلہ نے بڑے کڑک دل سے کہا کہ اے میرے باپ سنو میرا ڈولا سجے گا اور اس کو توال کے گھر پہنچے گا، مجھے ایک موہوم سی کرن سہارا دے رہی ہے۔ اورنگ زیب نے یہ فیصلہ ضرور دیا ہے، مگر ساتھ ساتھ جب میں ان کے گھر میں رہی ہوں تو انہوں نے مجھے چودہ مرتبہ بیٹی کہا ہے، میرا دل نہیں مانتا کہ کوئی باپ اپنی موجودگی

میں اپنی بیٹی کی عزت لوٹنے دے گا۔ ڈولا سجا اور بارات ابراہیم کے گھر پہنچی اندر سے دو بوڑھا نکلا اور اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، اس نے کہا کہ پورے بنارس کے فقیروں کو اکٹھا کیا جائے میں صدقہ دینا چاہتا ہوں، خیرات لٹانا چاہتا ہوں بنارس کے سارے فقیروں پر خیرات لٹائی جاتی رہی، جب کوئی فقیر باقی نہ رہا، تب حکم ہوا کہ یہ ڈولہ اندر بجے سجائے کمرے میں پہنچایا جائے، جوں ہی ڈولہ اٹھایا ایک گدڑی پوش فقیر نمودار ہوا اور اس نے کہا مہاراج ابھی ایک فقیر خیرات پانے کے لئے باقی ہے، سارے فقیروں کو تم نے اس خوشی میں خیرات دی ہے مجھے بھی خیرات دو۔ ابراہیم نے کہا اندھے اتنے سارے پیسے زمین پر پڑے ہیں، کیوں نہیں بٹور لیتا، اس نے کہا کہ میں عام فقیروں جیسا فقیر نہیں ہوں میں زمین پر گرے ہوئے پیسے نہیں اٹھاتا میں خیرات بانٹنے والے کے ہاتھ سے خیرات لیتا ہوں، مجھے تمہارے ہاتھ سے پیسہ چاہئے ورنہ میں ڈولہ نہیں اٹھنے دونگا اتنی بڑی دھمکی ایک فقیر دے رہا تھا اتنے بڑے حاکم کو، ابراہیم نے سوچا کہ اگر میں اس وقت اس سے جھگڑا کرتا ہوں، تو میرے رنگ میں بھنگ پڑ جائے گی اس لئے اس نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر اس ضدی فقیر کو ٹالنا چاہا، جوں ہی ہاتھ بڑھایا تاکہ یہ پیسے نووارد فقیر کو دے کر واپس کیا جائے تو فقیر نے بڑی تیزی کے ساتھ ہاتھ مارا پیسے ادھر گرے اور اپنی گدڑی ہٹا کر وہ باہر نکلا۔ گدڑی میں وہ فقیر تھا لیکن جب گدڑی سے باہر نکلا تو عالمگیر تھا۔ آپ نے ایک خاص قسم کی وصل بجائی پانچ سو محافظ جو آپ دہلی سے لیکر چلے تھے، انہوں نے پورے بنارس کو گھیر لیا آپ نے حکم دیا کہ اس نے پورے بنارس کے فقیروں کو جمع کر کے ایک پنڈت کی عزت کے ساتھ تماشا کیا تھا، میں پورے بنارس کے سامنے اس کو اس کی بیہودگی کی سزا سنانا چاہتا ہوں۔ پورا بنارس اکٹھا ہے اورنگ زیب نے اپنے کوتوال کو جو تاریخی جملے فرمائے وہ یہ ہیں:

آپ نے فرمایا!

"بے ایمان میں نے تجھے اسی دن کے لئے حاکم بنایا تھا کہ میری رعایا کی عزت لوٹی

جائے دوسرے کے مذہب میں دخل اندازی کی جائے کیا تجھے اسلام کی تاریخ معلوم نہیں؟ کہ اسلام جس دھرتی کی رہنے والی قوم کو اپنی حفاظت میں لے لے تو اس کی جان و مال کا محافظ ہوتا ہے، تو نے اسلامی اصولوں سے غداری کر کے مسلم پرنسپل لاء بھی توڑا ہے اور دوسرے مذہب میں دخل اندازی کر کے "لا اکراہ فی الدین" کا بھی مذاق اڑایا ہے، اس لئے تو سزائے بد بھگتنے کیلئے تیار ہو جا۔ آپ نے دو ہاتھی منگوائے دونوں ہاتھیوں کے پیروں میں موٹی موٹی زنجیریں ڈالی گئیں، اور ابراہیم کو توال کا ایک پیر ایک ہاتھی کے پیر کے ساتھ باندھ دیا گیا اور دوسرا پیر دوسرے ہاتھی کے پیر سے باندھ کر دونوں ہاتھیوں کو مخالف سمت میں دوڑا دیا گیا، تڑپ تڑپ کر ایک ظالم اپنے ظلم کی سزا بھگت رہا تھا اور بھارت کی دھرتی اس فرمانروا کا انصاف دیکھ رہی تھی، جس نے ایک ہندو کی بیٹی کی عزت بچانے کی خاطر دہلی سے بنارس کا تاریخی سفر کیا، جب ابراہیم کو توال اپنے انجام کو پہنچ گیا تو اورنگ زیب عالمگیر نے بھیگی ہوئی پلکوں کو اٹھا کر فرمایا کہ ڈولا اٹھایا جائے اور پنڈت رام لعل کے گھر پہنچایا جائے، یہ ڈولا پنڈت رام لعل کے گھر پہنچا دیا گیا دروازے پر ایک چبوترہ تھا اورنگ زیب اس چبوترے پر بیٹھ گئے لڑکی ڈولے سے بے تحاشا نکلی اور پتا جی کہتے ہوئے اورنگ زیب عالمگیر کے قدموں میں گر گئی، اور اس نے کہا میرے منہ بولے باپ! مجھے یقین تھا کہ تو مجھے ضائع نہیں ہونے دے گا، اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا شکند لہ مجھے پانی پلا تیرے اس منہ بولے باپ نے جس دن سے یہ خبر سنی تھی، اس دن سے اس نے یہ طے کیا تھا کہ پانی اس وقت تک قریب نہ لاؤں گا جب تک تجھے انصاف نہیں دلاؤں گا۔ ایسا بادشاہ تھا جس نے پوری زندگی گھوڑے کی پیٹھ پر گذار دی تھی اورنگ زیب نے پانی پینے کے بعد وضو کے لئے پانی مانگا، اور فرمایا کہ میں دو رکعت نماز شکرانے کے پڑھنا چاہتا ہوں کہ اے میرے رب تو نے مجھے ایک ہندو بیٹی کے ساتھ انصاف کرنے کی توفیق دی، آپ نے وضو کیا وضو کے بعد بھرے مجمع میں اس جگہ آپ کا مصلیٰ بچھا، آپ نے نماز پڑھنی شروع کی جب نماز ہو چکی تو

بنارس کا منصف پسند ہندو پکار اٹھا کہ ہندوستان کے بادشاہ نے جو تاریخ ساز فیصلہ کیا اور فیصلے کے بعد اپنے خدا کو سجدہ کیا ہے، ہم اس چبوترہ کو انصاف کی مسجد بنائیں گے تاکہ اس کے کنگرے گواہی دیں کہ اورنگ زیب نے انصاف کو دنیا میں زندہ کیا تھا، اور ہندوؤں نے اس کی یاد میں یہ مسجد بنائی تھی، اس کے بعد مسجد کی بنیاد رکھی گئی جسے بابری مسجد کہتے ہیں۔ مسجد کے کنگرے بولتے ہیں کہ ایک ہندو بیٹی کی عزت کی خاطر اورنگ زیب نے جو فیصلہ کیا تھا، ہندوؤں نے اورنگ زیب کی سجدہ گاہ قائم رکھنے کے لئے اس زمین کو مسجد میں تبدیل کیا تھا"۔

اس قصے کو دوبارہ پڑھئے اور ہندوستان میں آج کی جمہوریت اور کل کے اسلام کا موازنہ کیجئے۔

پڑوسی ملک کی کیا خبر لینا اپنے ملک پاکستان اور ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالئے۔ مجیب الرحمان کی "عوامی پارٹی" اور ذوالفقار علی بھٹو کی "پی پی پی" دونوں لیڈر اور ان کی پارٹیاں بین الاقوامی طور پر مروجہ جمہوریت کی علمبردار مانی جاتی تھیں، مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن اور مغربی پاکستان میں بھٹو واضح اکثریت حاصل کر چکے تھے، دین جمہوریت کے اکثریتی اصول کا سایہ پڑتے ہی پاکستان جیسی عظیم اور واحد نظریاتی مملکت دولخت ہو گئی۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ پاکستان کے قتل کا مجرم کون تھا اور کون نہیں تھا؟ یہ کام تاریخی حقائق کے ماہرین کا ہے، البتہ اتنی بات مسلّم ہے کہ مروجہ جمہوریت کے اکثریتی اصول کا منحوس سایہ پڑتے ہی پاکستان دولخت ہو گیا۔

ابھی حال ہی میں جمہوریت کی اکثریتی حکومت کی سنگ بنیاد بڑی دھوم دھام سے رکھی گئی پورے مغرب اور مشرق بشمول ہند نے پاکستان میں جمہوریت کی ولادت پر نہ صرف اطمینان کا سانس لیا بلکہ اس کے پھلنے پھولنے کی تمام ذمہ داریاں لینے کے اعلانات بھی کیے اب دیکھنا ہوگا کہ یہ نوخیز جمہوریت کیا رنگ لاتی ہے؟

باب ہفتم

مروجہ انتخابات اور حصول اکثریت

انتخابات کے ذریعہ اقتدار تک پہنچنے کا زینہ عوام کے ووٹ ہیں، اس لئے زیادہ عوامی حمایت حاصل کرنے کے لئے ہر ہتھکنڈہ، فریب، دھوکہ، منافقت، جھوٹ، بددیانتی، بدعہدی، بداخلاقی، بہتان تراشی اور ضمیر فروشی جیسے جملہ منکرات جن سے عوام کو الو بنا کر انہیں اپنا ہم خیال بنایا جا سکے، مروجہ جمہوریت میں نہ صرف مباح ہیں، بلکہ لازم ہیں۔

۱۔ خیانت و بددیانتی :

انتخابات کی تاریخ سے ڈیڑھ دو سال پہلے حزب اقتدار یہ کوشش شروع کر دیتی ہے، کہ نئی انتخابی حلقہ بندیاں اس طریقے سے کی جائیں کہ ووٹوں کی اکثریت کا حصول ان کے لئے یقینی ہو جائے، اگر ایسا ہونا ممکن نہ ہو تو کم از کم مد مقابل کا نقصان تو ہو، اور جہاں ان کی کامیابی اور ناکامی کی امید یکساں ہو، وہاں جعلی اور دوہرے ووٹوں کا اندراج بکثرت کرایا جاتا ہے تاکہ یہ جعلی ووٹ پولنگ کے دن ان کی پارٹی استعمال کر سکے۔ چونکہ فہرستیں تیار کرنا حکمران پارٹی کی ذمہ داری ہے، اس لئے ایسا کرنے میں انہیں کوئی خاص رکاوٹ پیش نہیں آتی اور جن علاقوں میں انہیں اپنی پارٹی کی کامیابی کا امکان کم نظر آتا ہو، وہاں بیشتر ووٹ درج ہی نہیں کئے جاتے اس طرح دین جمہوریت کے آزادانہ انتخابات کی ابتدا ہوتی ہے۔

۲۔ حریف اور مقابل کی تذلیل :

جوں ہی کسی نے الیکشن لڑنے کی درخواست دی تو گویا کہ اس نے اپنے آپ کو تنقید

کا نشانہ بنا لیا۔ اب مقابل پارٹی جلسوں، جلوسوں، اخبارات، اشتہارات اور پمفلٹوں کے ذریعہ نہ صرف اس کے پس پردہ گناہوں کو طشت از بام کرتی ہے، بلکہ اس کے ناکردہ گناہوں کی بھی ہر ممکن تشہیر کرتی ہے، اس طرح مسلمان اجتماعی طور پر دیدہ و دانستہ قرآن کے منصوص احکامات توڑنے کے کبیرہ گناہ کے ارتکاب پر کمربستہ ہو جاتے ہیں، اور ستم ظریفی یہ کہ اسے گناہ نہیں سمجھتے ہیں۔

قولہ تعالی: لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول الا من ظلم وکان اللہ سمیعا علیما○ (سورۃ النساء، آیت: ۱۴۷)

اللہ تعالیٰ کو کسی کی بری بات کا ظاہر کرنا پسند نہیں، مگر جس پر ظلم ہوا ہو "مظلوم کا ظالم کے ظلم کو ظاہر کرنا" اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیرا منھم ولا نسآء من نسآء عسیٰ ان یکن خیر منھن ولا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان ومن لم یتب فاولئک ھم الظالمون○

(پارہ: ۲۶، الحجرات، آیت: ۹)

"اے ایمان والو! ایک قوم دوسری قوم سے ٹھٹھا (ہنسی) نہ کرے عجب نہیں کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے ٹھٹھا (ہنسی اور مسخرے) کریں کچھ بعید نہیں کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کے نام دھرو (برے القاب سے یاد نہ کرو) فسق کے نام ایمان لانے کے بعد بہت برے ہیں اور جو توبہ کر کے باز نہ آئیں سو وہی لوگ ظالم ہیں"۔

ولا یغتب بعضکم بعضا ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتا

فکر ھتموہ واتقوا اللہ ○ (پارہ:۲۶، الحجرات، آیت:۱۰)

"اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے سو اس کو تم ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو"۔

یایھا النبی اذا جاء ك المومنات یبایعنك علی ان لا یشرکن باللہ شیئا ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولا یاتین ببھتان یفترینه بین ایدیھن وارجلھن ولا یعصینك فی معروف فبایعھن ○ الایه (پارہ:۲۸، سورۃ الممتحنہ، آیت: ۱۱)

"اے نبی جب آئیں تیرے پاس مسلمان عورتیں بیعت کرنے کو اس بات پر کہ شریک نہ ٹھہرائیں اللہ کا کسی کو اور چوری نہ کریں اور بدکاری نہ کریں اور اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں اور بہتان نہ لائیں باندھ کر اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں اور تیری نافرمانی نہ کریں کسی بھلے کام میں تو ان کو بیعت کر لو"۔

تشریح : غیبت کا مفہوم ہے کسی کے پوشیدہ عیب کو لوگوں کے سامنے اس کی تذلیل کے لئے ظاہر کرنا۔

بہتان کا مفہوم ہے کسی پر ایسا الزام لگانا جو اس میں نہیں ہے یعنی جھوٹا الزام۔

آیت بالا پر دوبارہ نظر ڈالئے اللہ تعالیٰ نے بہتان کو شرک باللہ، قتل اولاد جیسے بھیانک جرائم کی فہرست میں ذکر فرمایا ہے جس سے بہتان تراشی کے گناہ کی اہمیت خود بخود آشکارا ہو جاتی ہے۔

۳۔ خود کو فرشتہ ظاہر کرنا :

"ہر امیدوار اپنے آپ کو عوام کے سامنے ہر درد کی دوا کے طور پر پیش کرتا ہے اس کی

دھواں دار تقریروں سے سارے عوام یقین کر لیتے ہیں، کہ اگر ہم نے اس دریکتا کو کامیاب بنایا تو ہمارے تمام دکھ درد کا مداوا ہو جائے گا اور اگر اس مشفق، یگانہ غمخوار زمانہ سے محروم ہو گئے تو گویا ہم سب کچھ کھو بیٹھیں گے۔

۴۔ جھوٹے وعدے :

الیکشن کے دوران عوام کو بے وقوف بنانے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ایسے دلفریب نعرے ایجاد کئے جاتے ہیں، سبز باغ دکھاتے جاتے ہیں اور وعدے کئے جاتے ہیں، جن کا پورا کرنا ہی ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۹۷۱ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر کاشتکار کو ساڑھے بارہ ایکڑ زمین مہیا کریگی جب کہ صورت حال یہ تھی کہ پاکستان میں کل زیر کاشت رقبہ اس وقت ۴۶۸ کروڑ ایکڑ تھا، اور کاشتکار ایک کروڑ بیس لاکھ تھے، اس طرح حکومت تمام زمینداروں اور جاگیرداروں سے زمینیں چھین کر تمام کاشتکاروں میں برابر تقسیم کر دیتی تو بھی چار ایکڑ سے کچھ زیادہ ہر ایک کاشتکار کے حصے میں آتی۔ اسی طرح روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا، وہ بھی پی پی پی کی حکمرانی کے دونوں ادوار میں تو شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور نہ ہی تیسرے دور میں اس کی توقع ہے۔

اسی طرح قومی اتحاد نے ۱۹۷۷ء میں جو تحریک چلائی اس میں مہنگائی اور گرانی کی روک تھام کے لئے اشیاء کی قیمتوں کو ۱۹۷۰ء کی سطح پر لانے کا وعدہ کیا گیا، یہ وعدہ بھی ناممکن العمل تھا کیونکہ پاکستان کی منڈی پر بیرونی منڈیوں کا بھی گہرا اثر ہوتا ہے۔ ہم ملکی پیداوار اور اس کی قیمتوں پر تو کسی حد تک کنٹرول کر سکتے ہیں، لیکن درآمدات کی قیمتوں پر کنٹرول رکھنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ پھر لطف کی بات یہ کہ ایک ہی لیڈر مختلف جلسوں میں سامعین کی نوعیت اور مزاج کے پیش نظر متضاد وعدے کرتا پھرتا ہے۔ سائیکل رکشہ چلانے والوں، فٹ پاتھ پر سونے والوں اور بے روزگاروں سے وعدے کئے جاتے ہیں کہ ہم تمہیں موٹر

کاریں، بنگلے اور کارخانے دیں گے۔ اور تجارت پیشہ اور صنعت کاروں سے وعدے کئے جاتے ہیں کہ ہم تجارت کو استحکام اور صنعتوں کو ترقی دینگے وغیرہ وغیرہ۔

اسلام پسندوں سے کہا جاتا ہے کہ ضرور اسلامی نظام رائج کردیں گے، اور جمہوریت پسندوں اور سوشلزم کے چاہنے والوں سے کہا جاتا ہے کہ ہم اسلامی جمہوریت یا اسلامی سوشلزم نافذ کرینگے۔

؎ جانان ما بشیوہ مغرب برابر است
با ما شراب خود بہ زاہد نماز کرد

کاش وہ دن بھی آئے کہ بے چارے عوام ظاہر بینی کی بجائے حقیقت بینی سے کام لیں۔

۵۔ ووٹروں کی خرید و فروخت :

الیکشن کے قریب آتے ہی ووٹوں کی خرید و فروخت شروع ہو جاتی ہے۔ جس میں کمیشن ایجنٹ اور دلالوں کی بھرمار ہوتی ہے، ووٹ شرعی لحاظ سے امیدوار کے لئے اسمبلی کا ممبر ہونے کی اہلیت اور قابلیت کی گواہی اور شہادت ہے، جو ووٹر ووٹ دینے کی صورت میں ادا کر رہا ہے، یا دوسرے الفاظ میں ووٹر کے ضمیر کی تصدیق ہے۔ جسے شرعاً اور اخلاقاً ایک مقدس امانت کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن یہ مقدس امانت دین جمہوریت کی سیاست کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے اور کوڑیوں کے دام فروخت ہوتی ہے اور پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ تشکیل حکومت کے وقت یہ مقدس امانت ارکان اسمبلی کے ذریعے جس بھونڈے اور ذلت آمیز انداز میں فروخت ہوتی ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی کا کرشمہ ہے کہ اکثریتی حکومت ختم ہو جاتی ہے اور اقلیتی پارٹیاں اقتدار سنبھال لیتی ہیں۔

۶۔ الیکشن کے دوران غنڈہ گردی :

ہندوستان جیسے جمہوریت کے چمپئن ملک میں الیکشن کے دوران، الیکشن سے پہلے اور بعد میں ہزاروں لوگ قتل ہو جاتے ہیں، یہی حال سری لنکا، بنگلہ دیش کا ہے، اور پاکستان بھی اسی کیفیت سے دوچار ہے۔ اس صورت حال سے کوئی انکار نہیں کر سکتا جبکہ قتل سے کم جرائم مثلاً دھونس، دھمکی، دباؤ، اغوا، جعلی ووٹ بھگتانا، دھاندلی، گنتی میں عیاری، بیلٹ بکس تبدیل کرنا وغیرہ ان جرائم کا تو شمار ہی نہیں۔

۷۔ عداوت اور منافرت کی فضا :

انتخابات کے بعد شکست خوردہ پارٹی یا افراد حسرت وافسوس اور غم سے نڈھال ہوتے ہیں دوسری طرف کامیاب فریق شکست خوردہ گروہ کے سامنے نہ صرف فخر ومباہات کا جشن منانا شروع کر دیتا ہے، بلکہ اس کی تذلیل کر کے انتقامی کاروائی پر اتر آتا ہے، چنانچہ ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں "روزنامہ جنگ راولپنڈی" کے مطابق صوبہ سرحد کے ایک حلقہ میں کامیاب فریق کے غنڈوں نے ناکام فریق کے گھر کے سامنے نشے میں دھت ہو کر ننگا ناچ کیا اور کراچی میں "ایم کیو ایم" اور پی پی پی کے معاہدہ کے ٹوٹنے کے بعد ان دو جماعتوں کے درمیان قتل وغارت کا وہ بازار گرم ہوا جس کی لپیٹ میں بعد ازاں پورا سندھ آگیا، سینکڑوں بے گناہ افراد قتل ہوئے اور حالات یہاں تک خراب ہوئے کہ کراچی کے حساس علاقوں میں نہ صرف کرفیو لاگو کیا گیا بلکہ چوراہوں پر ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں متعین کی گئیں۔

۸۔ وحدت اور اخوت اسلامی کا قتل :

انفرادی اور چھوٹی موٹی دشمنیوں کے علاوہ الیکشن کے نتیجہ میں پوری قوم "حزب

اقتدار" اور "حزب اختلاف" کے دو ایسے متحارب دھڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے جس میں ہر ایک فریق دوسرے فریق کی ہر اچھی اور بری بات کی مخالفت کرنا اور اس کے خلاف عوام کو سڑکوں پر لانا اپنا جمہوری فریضہ سمجھتا ہے، اس طرح جلسے جلوسوں کے ذریعہ ہر ایک فریق اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیتا ہے، اور انجام ہڑتالوں، توڑ پھوڑ، غنڈہ گردی تک پہنچ جاتا ہے جس سے ملک کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں۔ کبھی بازار بند، کبھی پہیہ جام ہڑتال اور کبھی کارخانے اور صنعتیں بند اور پھر دوسری طرف لاٹھی چارج اشک آور گیس کی شیلنگ، پکڑ دھکڑ حتیٰ کہ گولی چلانے کی جوابی کاروائی معمول بن جاتی ہے، اس کے جواب میں بھرے بازاروں، منڈیوں، عوامی اجتماع کی جگہوں، ریلوں، بسوں اور پلوں پر دھماکوں کا سلسلہ اور تخریب کاری شروع ہوتی ہے، تعلیمی درس گاہیں نہ صرف سیاست کا اکھاڑہ بن جاتی ہیں بلکہ بسا اوقات کلاشنکوفوں سے گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے، اور وہاں میدان جنگ کی سی صورت دکھائی دینے لگتی ہے نتیجہ یہ کہ تجارت تباہ، کاروبار برباد، درسگاہیں بند اور امن و امان عنقا ہو جاتا ہے، جس سے کسی بڑے سانحے کے لئے حالات سازگار ہو جاتے ہیں، کیونکہ قومی اور ملی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ بیرونی مداخلت کے لئے بھی راستہ ہموار بلکہ موافق ہو جاتا ہے۔

۹۔ قومی خزانہ پر الیکشن کے اخراجات کا بوجھ :

علامہ عبدالرحمٰن گیلانی کے قول کے مطابق ۱۹۷۷ء کے الیکشن پر قومی خزانہ سے کروڑوں روپے خرچ ہوئے تھے اور نمائندوں کے اخراجات پر محتاط اندازے کے مطابق ۶۵ کروڑ ۷ لاکھ روپے خرچ ہوئے اور ۱۹۸۹ء میں یقیناً ان مذکورہ اخراجات میں کئی گنا اضافہ ہوا ہوگا اور آج کل یہ اخراجات اربوں تک پہنچ چکے ہیں، اب تو ہر امیدوار کو ۵، ۵ لاکھ روپے خرچ کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اس طرح محتاط اندازے کے مطابق ڈیڑھ ارب روپے

سرکاری اجازت سے امیدواروں نے خرچ کیے، جبکہ حقیقی اخراجات اس سے کئی گناہ زیادہ ہیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ انتخابات اور الیکشن کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہے۔

۱۔ قومی اسمبلی کے انتخابات۔

۲۔ صوبائی اسمبلی کے انتخابات۔

۳۔ سینیٹ کے انتخابات۔

۴۔ صدر کا انتخاب۔

۵۔ بلدیاتی اداروں کے انتخابات۔

۶۔ چیمبرز آف کامرس کے انتخابات۔

۷۔ ٹریڈ یونینوں کے انتخابات۔

۸۔ مزدور وغیرہ تنظیموں کے انتخابات۔

۹۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انتخابات۔

۱۰۔ سیاسی پارٹیوں کے انتخابات۔

۱۰۔ ضمیر فروشی کا قومی خزانہ پر بوجھ :

اگرچہ ضمیر فروشی "دینِ جمہوریت" کا خاصہ ہے اور ہمیشہ سے ہر جگہ جاری ہے مگر پاکستان کی نئی جمہوریت نے ارکان کی خرید و فروخت کے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں جس کے ثبوت کے لئے میں صرف دو بزرگ، اور مانے ہوئے، سیاست دانوں کے اخباری بیانات پر اکتفاء کر رہا ہوں۔ خان عبدالولی خان عوامی نیشنل پارٹی کے سربراہ (جب وہ اپنی اہلیہ نسیم ولی خان کے ساتھ اپنے علاج معالجہ کے لئے برمنگھم میں تھے) نے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو (۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۰ء) کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پر تبصرہ کرتے وقت جو کچھ فرمایا اس پر اخبار جنگ نے حسب ذیل سرخی قائم کی۔

پاکستان کے بزرگ جمہوریت پرستوں کا اقرار:

قوم کے مسائل حل نہ ہوں تو اسے حکومت تبدیل کرنے کا حق حاصل ہے، ارکان اسمبلی کی خرید و فروخت کا سلسلہ موجودہ دور حکومت میں شروع ہوا۔ صوبہ سرحد میں ایک ووٹ کی قیمت ایک کروڑ روپے ہے، یہ کہاں کی سیاست ہے۔

لندن (نمائندہ جنگ) خان ولی خان نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "یہ پیپلز پارٹی کی حکومت ہی کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے کہ صوبہ پنجاب میں تو وزراء کی تعداد صرف ۲۰ ہے جبکہ صوبہ سرحد میں وزراء کی تعداد ۲۴ ہے، صوبہ سرحد میں ایک رکن اسمبلی کو خریدنے کے لئے ۵۰ لاکھ روپے نقد، ۲ کلاشنکوف، ۲ نئی گاڑیاں اور دو قطعات اراضی دینے کی پیش کش کی گئی یعنی ایک ووٹ کیلئے ایک کروڑ روپے میں سودا ہوا۔

(اخبار جنگ راولپنڈی ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۹ء صفحہ ۲ کالم ۴)

ایک اور بزرگ سیاست دان نوابزادہ نصر اللہ خان نے کہا ہے کہ "سیاست کے اصول بدل گئے ہیں سیاسی منڈی لگی ہوئی ہے، اور بولیاں لگ رہی ہیں، لوگوں کو خریدنے کے لئے زر کثیر استعمال کیا جا رہا ہے"۔ (اخبار جنگ راولپنڈی ستمبر ۱۹۸۹ء صفحہ ۱ کالم ۷)

حقیقت یہ ہے کہ عدم اعتماد کی تحریک کے دنوں میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف مطلوبہ اکثریت کے حصول کے لئے سب کچھ کر گزرے۔ اس وقت کے اخبارات، رسائل اور سیاسی لیڈروں کے بیانات سے یہ بات تواتر کی حد تک پہنچ چکی ہے، کہ قومی اسمبلی کے ایک ممبر کے ووٹ کی بولی دو کروڑ روپے سے تجاوز کر گئی، اس پر مزید ایک دوسرے پر ارکان کے اغوا، پولیس اور غنڈوں کے دباؤ کا الزام تو فریقین کے چوٹی کے لیڈر بھی لگاتے رہتے تھے اور یہ رشوتیں قومی خزانہ سے ہی دی جاتی تھیں۔

۱۱۔ قومی خزانہ پر ارکان پارلیمنٹ کی غیر ضروری مراعات کا تیسرا بوجھ:

ارکان پارلیمنٹ کی تنخواہ، الاؤنس اور مراعات۔

۱۔ ماہانہ تنخواہ تین ہزار روپے

۲۔ یومیہ الاؤنس (سیشن کے ایام میں) ایک سو پچاس (۱۵۰) روپے

۳۔ یومیہ کنوینس الاؤنس (سیشن کے ایام میں) سو (۱۰۰) روپے

۴۔ یومیہ ہاؤسنگ الاؤنس تین سو (۳۰۰) روپے

۵۔ سالانہ ٹریول واؤچرز تیس ہزار (۳۰۰۰۰) روپے

۶۔ سالانہ ٹیلی فون الاؤنس (ٹیلیفون ہو یا نہ ہو) چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) روپے

۷۔ آفس میٹی نینس الاؤنس (ماہانہ) تین ہزار (۳۰۰۰) روپے

۸۔ علاج مع فیملی و والدین مفت (فوجی اسپتال میں بھی)

۹۔ ٹیلیفون کنکشن مفت

اس پر مزید لیڈر آف دی ہاؤس اور لیڈر آف دی اپوزیشن کو عام رکن قومی اسمبلی اور سینٹ کی تنخواہوں، الاؤنسوں اور مراعات کے علاوہ درج ذیل خصوصی مراعات بھی میسر ہیں۔

۱۔ ایک ہزار روپے ماہانہ اعزازیہ

۲۔ پارلیمنٹ کے اندر تزئین شدہ دفتر

۳۔ سرکاری خرچ پر ایک اسٹینوگرافر اور ایک چپڑاسی

۴۔ دفتر اور گھر پر سرکاری خرچ پر ٹیلیفون کی تنصیب

(روزنامہ جنگ ۴ اکتوبر ۱۹۸۹ء، صفحہ ۷)

پاکستان میں جمہوریت کی شاہ خرچیاں

مزید یہ کہ صدر، وزیر اعظم، وزراء اور مشیروں کی فوج، اور اسمبلی کے اجلاسوں کے یومیہ خرچ کے متعلق جناب سید عبد الاحد کوثری قادری کے مضمون "جمہوریت اور اس کے خدوخال" کے عنوان سے جو دار العلوم کراچی کے ترجمان "البلاغ" اپریل ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا ہے۔ کے چند اقتباسات بھی ملاحظہ فرمایئے جو سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے دور حکومت کے متعلق ہیں۔

۱۔ آج کل پاکستان کی قومی اسمبلی پر تین کروڑ روپیہ یومیہ خرچ کیا جارہا ہے اور بقول ائر مارشل اصغر خان اس کی کارکردگی صفر ہے (صوبائی اسمبلیوں کا خرچہ الگ ہے)۔

۲۔ نئے بجٹ میں وزیر اعظم کے حوالے سے ہونے والے ممکنہ اخراجات میں ساٹھ فیصد کے حساب سے اضافہ کیا گیا ہے (ماہرین کے مطابق یہ چار ارب کا مزید بوجھ حکومت پر ہوگا)۔

۳۔ اخباری اطلاع کے مطابق ایک اعلیٰ شخصیت کے لئے ۶ عدد ہیلی کاپٹروں کا استعمال ہوتا ہے حتیٰ کہ داخلہ فارم لانے کے لئے بھی ہیلی کاپٹر استعمال کئے جارہے ہیں۔

۴۔ سولہ لاکھ روپے بلاول ہاؤس اور المرتضیٰ ہاؤس کی تزئین و آسائش کے لئے مختص کئے گئے ہیں حزب اختلاف کے لیڈر جناب غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب نے اپنی بجٹ تقریر میں کہا کہ جناب اسپیکر صاحب آپ نے تین وزیر اعظم ہاؤس ڈیکوریٹ کروائے جن میں ایک ہاؤس تو ڈیکوریٹ ہونے کے بعد مسترد ہو گیا۔ دوسری پرانی پریذیڈنسی ڈیکوریٹ ہوئی وہ آپ کو پسند نہیں آرہی ہے، لہٰذا اب تیسرا پرائم منسٹر ہاؤس ڈیکوریٹ ہو رہا ہے۔

۵۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ نے فرمایا کہ بلاول ہاؤس کراچی کے لئے ۱۶ انسپکٹر ۱۹ اسسٹنٹ سب

انسپکٹر ۲۴ ہیڈ کانسٹیبل ۲۷ کانسٹیبل اور لاڑکانہ میں المرتضیٰ ہاؤس کے لئے تین انسپکٹر ۱۲ سب انسپکٹر ۱۴ ہیڈ کانسٹیبل اور ۲۷ کانسٹیبل حفاظت کے لئے رکھے جائیں گے۔

(جنگ لندن ۲۱ جون ۱۹۸۹ء اور جنگ لندن ۲۹ جون ۱۹۸۹ء)

٦۔ وزیراعظم (بے نظیر) کے ہوائی جہاز کی آرائش کے لئے تین کروڑ روپیہ صرف کر دیا گیا اور اس کے لئے اٹلی اور برطانیہ سے ماہرین بلائے گئے۔

۷۔ خان عبدالولی خان فرماتے ہیں کہ:

"پاکستان کی حیثیت اس وقت تاریخ کے انتہائی نازک حالات میں ہے مگر حکمرانوں کے اخراجات ایسے ہیں کہ کیا بتاؤں گذشتہ دنوں میں ایوان صدر ایک دعوت میں گیا، اندر گھستے ہی میں حیران و ششدر رہ گیا۔ وہاں کئی کئی لاکھ روپے مالیت کے سینکڑوں شیڈلر لگے ہوئے تھے اور سارے ایوان صدر کی آرائش اس قدر قیمتی ہے کہ اگر مغل بادشاہ زندہ ہو جائیں تو ایسے ہی کسی گھر میں رہنے کی حسرت کریں"۔

(روزنامہ ملت لندن ۱۹ جون ۱۹۸۹ء)

ولی خان کہتے ہیں کہ:

"حکومت صدر پاکستان پر تین کروڑ بانوے لاکھ ستانوے ہزار روپے سالانہ خرچ کرتی ہے، اور یہ ایسے ملک میں ہو رہا ہے جہاں لوگ غاروں میں رہتے ہیں ننگے پاؤں پھرتے ہیں، اور پینے کے لئے گندہ پانی بھی کئی کئی میل دور سے بھر کر لاتے ہیں"۔ (روزنامہ ملت لندن ۱۹ جون ۱۹۸۹ء)

۸۔ وزیراعظم صاحبہ (بے نظیر بھٹو) نے ایوان حکومت میں داخل ہوتے ہی غالباً سب سے پہلے خزانہ کا جائزہ لیا اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ افسوسناک اعلان بھی کیا کہ خزانہ خالی ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے تقریباً ایک سو وزیروں اور مشیروں کو بھرتی

کر لیا۔ یہی وزیراعظم صاحب جہاں کہیں جاتی ہیں ساٹھ ستر آدمیوں کی جماعت لے کر جاتی ہیں، برطانیہ امریکہ کے دورے پر ڈیڑھ سو آدمی ساتھ تھے ان افراد کے لئے ہمیشہ ایک جمبو جیٹ طیارہ مخصوص ہوتا ہے۔

کیا خزانہ واقعی خالی تھا یا یہ خزانہ خالی کرانے کا بہانہ تھا

بے نظیر بھٹو کے پیشرو، وزیراعظم محمد خان جونیجو اس بارے میں جو کچھ فرما چکے ہیں وہ بھی ملاحظہ ہو۔

"پیپلز پارٹی کی حکومت کی طرف سے خزانہ خالی ہونے کا دعویٰ گمراہ کن ہے، ۱۹۷۷ء میں پی پی پی کی حکومت (ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت) ختم ہوئی تو اس نے قومی خزانہ میں صرف ساڑھے تین سو ملین ڈالر چھوڑے تھے اور جب ہم حکومت سے الگ ہوئے تو اس وقت قومی خزانہ میں بارہ سو ملین ڈالر تھے"۔ (جنگ لندن ۲۶ جون ۱۹۸۹ء)

یہ ہے حقیقت، اب اس حقیقت کے خلاف بیان دینے کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ قومی خزانہ کو اپنے اوپر بے دریغ صرف کر کے خالی کرنے کے لئے پیش بندی کی جائے، چنانچہ اخبارات اور سیاسی لیڈروں کے بیانات کے مطابق ایک جانب تو خود وزیراعظم خزانہ خالی ہونے کا رونا روتی ہے اور دوسری جانب شاہ خرچیوں کا ریکارڈ توڑنے کے ساتھ ساتھ ایک ایک وزیر اور مشیر کے لئے مراعات، اخراجات کے علاوہ تحریک عدم اعتماد کے دوران ممبروں کی وفاداریاں خریدنے اور قائم رکھنے کے لئے ایک ایک ممبر کو دو دو کروڑ روپے میں خریدتی ہیں۔ (ماخوذ البلاغ اپریل ۱۹۹۱ء)

سرحد جیسے پس ماندہ صوبے کے وزیروں، مشیروں کے اخراجات

صوبہ سرحد جیسے چھوٹے اور پس ماندہ صوبہ میں بے نظیر بھٹو صاحبہ کی جمہوری

حکومت میں غریب عوام کے عوامی وزیروں اور مشیروں پر ۹۰۔۱۹۸۹ء کے دوران اخبار جنگ راولپنڈی ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۰ء صفحہ ۸ کے مطابق شاہ خرچیوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

وزیراعلیٰ کے اخراجات ایک کروڑ ترانوے لاکھ روپے ۱۹۳۰۰۰۰۰

وزیراعلیٰ کی صوابدیدی گرانٹ ایک کروڑ روپے ۱۰۰۰۰۰۰۰

کابینہ کے وزیروں کے اخراجات ایک کروڑ باون لاکھ روپے ۱۵۲۰۰۰۰۰

وزیروں کی صوابدیدی گرانٹ تیئیس لاکھ روپے ۲۳۰۰۰۰۰

مشیروں پر اٹھنے والے اخراجات پینتالیس لاکھ روپے ۴۵۰۰۰۰۰

مشیروں کی صوابدیدی گرانٹ ساڑھے پانچ لاکھ روپے ۵۵۰۰۰۰

وزیراعلیٰ وزراء اور مشیروں کے اللوں تللوں پر اٹھنے والے کل اخراجات پانچ کروڑ اٹھارہ لاکھ روپے ۵۱۸۰۰۰۰۰

(انجمن تحفظ حقوق صوبہ سرحد پشاور)

اندازہ لگائیے کہ ایک طرف تو "خزانہ خالی ہے" کا بورڈ آویزاں ہے اور دوسری طرف صوبائی وزیروں مشیروں کی ایک فوج ظفر موج کی یہ شاہ خرچیاں اس بات کا اندازہ لگانے میں بھی بصیرت افروزی کا باعث ہیں، کہ مرکز میں تقریباً ایک سو وفاقی وزیروں مشیروں اور متعلقین پر کتنے اخراجات اٹھتے ہوں گے۔

؎ قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

۱۲۔ قومی دولت اور حقوق میں خورد برد :

الیکشن لڑنے سے لیکر ممبری اور پھر اقتدار تک پہنچنے میں حصول اکثریت کے لئے جو زر کثیر خرچ کیا جاتا ہے، اب ہر ایک کا اولین کام اور سوچ یہی ہوتی ہے کہ وہ کیسے پورا کیا جائے برابر برابر (یعنی جتنے خرچ کئے اس کی تلافی کی جائے) کی سودے بازی تو کوئی معنی نہیں

رکھتی بلکہ یہ حضرات کئی گنا کمانے کی ہوس رکھتے ہیں، پھر ممبران صاحبان کا یہ معاملہ خود
پردری تک محدود نہیں ہوتا بلکہ الیکشن کے دوران جن کارکنوں نے ان کی مخلصانہ خدمت
کی ہے ان کی بھی بہت توقعات ہوتی ہیں، ممبر صاحب نے ان کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے اس
لئے نہیں کہ ان سے وعدے کئے ہیں، بلکہ آئندہ الیکشن کی خاطر چونکہ ممبران صاحبان کو
جمہوریت کی بے ثباتی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اس لئے اولین فرصت میں بہت جلد ہی اس
مقصد کے حصول کے لئے فکرمند ہوجاتے ہیں۔

ایک نکتہ : حقیقت یہ ہے کہ وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے لئے عدم اعتماد کی
تحریک کے محرک ان کے اپنے پارٹی کے ممبر بنے محض اپنے ووٹ کے منہ مانگے دام کھرے
کرنے کے لئے، اور ہر جگہ ہمیشہ جمہوریت میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی جنگ میں
ممبران صاحبان اور مقابل پارٹیاں یہی کھیل کھیلا کرتی ہیں، خلاصہ یہ کہ ہر سطح پر رشوت،
قومی خزانہ میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوجاتا ہے جس کے نتیجے میں گرانی، ظلم، ناانصافی اور
خزانہ کا خالی ہونا ایک فطری امر ہے اور آخرکار عوام پر روزانہ نئے ٹیکسوں کا سلسلہ شروع ہو
جاتا ہے اور یہ ٹیکس بھی عوام کی بھلائی کے نام سے لگائے جاتے ہیں، یہ ہے "اصول
اکثریت" کے ان گنت فسادات میں سے مشت از خروارے۔

۱۳۔ قانون کی ناپائیداری :

چونکہ دین جمہوریت میں معیارِ حقانیت اکثریت کی رائے ہے، اس لئے بر سرِ اقتدار
آتے ہی ہر نئی پارٹی پارلیمنٹ میں اکثریت کے بل بوتے پر اپنے مخصوص مفادات، نظریات
اور مزاج کے خلاف موجودہ قوانین میں تنسیخ و ترمیم اور ایسے نئے قوانین جو ان کی خواہشات
اور مفادات کی تکمیل کے لئے مفید ہوں، کے اجراء کا سلسلہ شروع کرلیتی ہے۔ نیز حزب اختلاف
اور دوسرے مخالفین کو دبانے کے لئے نت نئے قوانین ملکی اور عوامی مفادات کے نام سے

بنائے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ ہر جمہوری نظام خصوصاً پارلیمانی نظام میں مسلسل چلتا رہتا ہے۔

۱۴۔ بیرونی مداخلت کے لئے راہیں ہموار ہونا :

چونکہ زر کثیر خرچ کئے بغیر انتخابات لڑنا اور اکثریت حاصل کرنا ناممکن ہوتا ہے اس لئے ہر ایک قابل ذکر پارٹی بیرونی امداد کے بغیر یہ معرکہ سر نہیں کر سکتی، جس کے لئے پارٹی بیرونی قوتوں میں کسی ایک کے ساتھ انتخابات سے پہلے معاہدہ کر لیتی ہے یا بیرونی طاقتوں کے نظریات کو اپنے منشور میں سمو دیتی ہے، اور اگر یہ پارٹی کسی مسلمان ملک میں ہو جہاں کے عوام اسلام کے شیدائی ہوں تو عوام کو دھوکا دینے کے لئے اسلام کے ساتھ بیرونی نظریات کی پیوندکاری سے کام چلایا جاتا ہے، مثلاً اسلامی سوشلزم، اسلامی جمہوریت، اسلامی نیشنلزم اور اسلامی سیکولرازم وغیرہ کی پیوندکاری اسی فلسفہ کا شاخسانہ ہے۔ اس طرح گویا خدا بھی خوش اور صنم بھی راضی اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ انتخابات اور اس کے نتائج کے سلسلے میں اندرون ملک نفرتوں، عداوتوں اور مخالفتوں کا لاوا پھوٹ کر خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، تو بیرونی قوتیں آسانی سے مداخلت کر کے جو کچھ کرنا چاہتی ہیں کر ڈالتی ہیں، جس کے لئے یحییٰ خان کے عام انتخابات کے نتیجہ میں پاکستان کے ٹکڑے ہونا ایک واضح دلیل ہے نیز ۱۹۹۰ء کے جمہوری دور کی ابتدا میں سندھ خصوصاً کراچی، حیدر آباد میں عملاً خانہ جنگی کی سی کیفیت تھی صوبے اور مرکز آپس میں دست و گریبان تھے، حصول اکثریت اور دوام اکثریت کے لئے جوڑ توڑ بک بکاؤ اور دیگر ناگفتنی حربوں کے استعمال کا بازار گرم تھا، عین اسی وقت ہندوستان کے وزیر اعظم وی پی سنگھ نے بہانے ڈھونڈ کر پاکستان پر فوج کشی کی نہ صرف بار بار دھمکی دی بلکہ عملی اقدامات بھی شروع کر دیئے تھے، جو اس کی اپنی مجبوریوں کی وجہ سے عمل پذیر نہ ہو سکے۔

جمہوریت کی اکثریت در حقیقت اقلیت ہی ہوتی ہے

المیہ یہ ہے کہ لوگ سوچتے نہیں بلکہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے اور اکثریت اکثریت کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں، بلکہ ایمان کی حد تک اس پر اعتقاد رکھتے ہیں، حالانکہ وہ نتائج پر نظر رکھیں تو انہیں پتہ چلے کہ انہیں کس طرح بے وقوف بنایا گیا ہے ڈاکٹر نبین رضوی صاحب نے "الیکشن ۱۹۸۸ء ان پاکستان" کے نام سے انگریزی میں ایک کتاب تالیف کی ہے جو ۱۹۸۸ء کے انتخابات سے متعلق ہے، مگر اس سے پاکستان کے تمام انتخابات کی ایک واضح اور صاف تصویر سامنے آجاتی ہے کہ جس کو عوام اکثریت سمجھتی ہے وہ در حقیقت اقلیت ہے ان کے حساب کے مطابق پاکستان کی سو ملین (دس کروڑ) کی آبادی میں ووٹرز کی تعداد چار کروڑ چھیاسٹھ لاکھ پچانوے ہزار چار سو انسٹھ ہے۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان کے ۱۶ اور ۱۷ نومبر ۱۹۸۸ء کے اعلان کردہ نتائج کے مطابق ووٹ ڈالنے والوں کی تعداد ووٹرز کی مجموعی تعداد کا صرف انتالیس اعشاریہ چھ فیصد تھی، ساٹھ اعشاریہ چار فیصد رجسٹرڈ ووٹرز نے بوجوہ ووٹ ہی نہیں ڈالا۔ کل ووٹ ڈالنے والے ووٹرز کی تعداد ایک کروڑ چوراسی لاکھ اکیانوے ہزار تین سو اٹھہتر تھی، ان ووٹرز میں سے جنہوں نے اپنا ووٹ استعمال کیا بہتر لاکھ گیارہ ہزار چھ سو ستاسی رائے دہندگان نے پاکستان پیپلز پارٹی کو ووٹ دیا اس طرح پاکستان کی سو ملین آبادی میں سے صرف سات ملین نے پیپلز پارٹی کو ووٹ دیا۔

(ماخوذ از ہفت روزہ تکبیر ۱۳ اپریل ۱۹۸۹ء)

دس کروڑ اکثریت پر ستر لاکھ اقلیت کی حکمرانی

مغربی جمہوریت کی نیرنگیاں دیکھیے کہ کس طرح اقلیت کو اکثریت اور عظیم اکثریت کو اقلیت میں بدل دیا گیا۔

اسی موضوع پر کوثر قادری صاحب رقمطراز ہیں۔

"پاکستان کی دس کروڑ کی آبادی میں چار کروڑ افراد ووٹنگ کا حق رکھتے تھے لیکن ان میں سے صرف ۳۷ فیصد نے ووٹ ڈالے گویا ملک کی اکثریت نے انتخاب ہی کو مسترد کر دیا تھا پھر جن لوگوں نے ووٹ ڈالے ان کی اکثریت نے بھی پیپلز پارٹی کو مسترد کر دیا ایسی صورت میں موجودہ وزیر اعظم کا مسند اقتدار پر متمکن ہونا ایک تماشہ اور ان کا اپنے کو دس کروڑ عوام کا نمائندہ کہنا ایک مذاق سے کم نہیں، اس لئے کہ دس کروڑ کی آبادی میں سے صرف ۵۵ لاکھ سے ۷۵ لاکھ ووٹ پیپلز پارٹی کو ملے اور باقی دوسری جماعتوں اور آزاد امیدواروں کو ملے ہیں۔

آپ اس سے اندازہ لگایئے کہ حیدر آباد میں تیرہ ہزار ووٹوں کے حلقہ انتخاب میں ۹۱۰ ووٹ لینے والے کو جمہوریت میں (تیرہ ہزار ووٹرز) کا نمائندہ تصور کیا گیا اور جوہر آباد کے بہتر ہزار ووٹوں میں سے منتخب ہونے والے نے صرف چار ہزار ووٹ لئے اسے اکثریت کا نمائندہ تسلیم کیا گیا یہ ہے اقلیت کو اکثریت میں بدلنے والا جمہوریت کا گورکھ دھندہ"۔

(از ماہنامہ البلاغ دار العلوم کراچی اپریل ۱۹۹۱ء)

مشہور صحافی وادیب محمد صلاح الدین (مرحوم) مدیر تکبیر کراچی زیر بحث موضوع پر یوں رقمطراز ہیں۔

"۱۹۷۰ء کے آزادانہ منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات میں ۳۳،۶ فیصد ووٹ لینے والی پیپلز پارٹی اقتدار کی مستحق ٹھہری اور ۴۶،۵ فیصد رائے دہندگان اقلیت قرار پائے اور ۶ سال تک اکثریت کی حکمرانی کا مزہ چکھتے رہے۔ قومی اسمبلی کا ہر حلقہ انتخاب دو پونے دو لاکھ رائے دہندگان پر مشتمل تھا مگر اسمبلی میں ۱۰ سے ۲۰ ہزار تک ووٹ لینے والے متعدد کامیاب امیدوار تھے اور وہاں اکثریت کی نمائندگی کا حق ادا کرتے رہے"۔

(جمہوریت فریب اور حقیقت صفحہ ۴)

واضح رہے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سابق صدر جنرل یحییٰ خان نے کرائے تھے جس کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی تھی۔

باب ہشتم

حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی تقسیم

ماہرین سیاسیات کا کہنا ہے کہ جمہوریت کی بنیادی خصوصیت اور معراج اپوزیشن ہے اپوزیشن کے بغیر نہ تو جمہوریت پھلتی ہے اور نہ پنپ سکتی ہے، اپوزیشن کے معنی اور مفہوم ضد، الٹ، برعکس، مخالف جماعت، مخالفت اور دشمنی ہیں۔ یہی اور اس کے قریب قریب معانی انگریزی لغت کی مستند ڈکشنریوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اپوزیشن کے وجود میں آنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب عوام نمائندے منتخب کر کے اسمبلی میں بھیجتے ہیں تو وہاں افراد کی جگہ پارٹیوں کے درمیان مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ممبروں کی اکثریت جس پارٹی کے ساتھ ہو وہ اقتدار سنبھال لیتی ہے اور جو پارٹی اکثریت کی تائید حاصل نہ کر سکے اس کا نام اپوزیشن ہو جاتا ہے۔ پھر اپوزیشن کو بھی چونکہ اسم با مسمی ہونا چاہیے۔ اس لئے اپنے نام کی لاج رکھنے اور مقصد تخلیق حاصل کرنے کی ٹھان لیتی ہے۔ حکومتی پارٹی کی مخالفت کرنا اس کا فرض منصبی ہوتا ہے، یہ مخالفت لازماً دشمنی کی صورت اختیار کر لیتی ہے کیونکہ اس کا خمیر اور اٹھان ہی نفرت کے جذبہ سے ہوتی ہے۔

حزب اقتدار یا حکومتی پارٹی کے سامنے صرف دو ہی کام ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ حزب اختلاف کے حملوں سے بچاؤ کی ہر تدبیر اور ہتھکنڈا اختیار کرنا ہر وقت پیش نظر رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ قوم کی بہتری کے لئے کوئی پلاننگ اور منصوبہ بندی کی جائے مگر ان دونوں میں اولیت اور اہمیت پہلے کام کی ہوتی ہے۔

دوسرا کام محض ضمنی اور ثانوی حیثیت رکھتا ہے اگر پہلے کام سے فرصت کا کوئی لمحہ میسر آجاتا ہے، تو دوسرے کی طرف بھی التفات کر لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں

جمہوریت کے پھل نظر آتے ہیں۔

اس مقصد کے حصول کے لئے کسی طرف سے کوئی شریفانہ اور پسندیدہ اقدام نہیں ہے بلکہ لالچ، دھونس اور دھاندلی تینوں حربے استعمال ہو رہے ہیں، جس کے نتیجے میں امن غارت، معیشت تباہ اور لاقانونیت معراج پر ہے۔ پھر بھی طرفین سے جمہوریت کے چیمپئن ہونے کے دعووں اور نعروں کی گونج ہے۔

جمہوریت میں نفرت، مخالفت اور دشمنی کی ابتدا تو انتخابات کا اعلان ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے جس کو اکبرالہ آبادی کیا خوب کہہ گیا ہے کہ۔

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے
خدا کی مار سے ووٹوں کی مار کم کیا ہے

مگر یہ دشمنی حد کمال تک اس وقت پہنچتی ہے، جب حزب اختلاف وجود میں آکر دھینگا مشتی کے لئے کمر کس لیتی ہے، مختصر یہ کہ دین جمہوریت افراد خانہ و محلہ اہالیان شہر اور اقوام وقبائل کے مابین حتیٰ کہ استادوں اور شاگردوں، اماموں اور مقتدیوں، زمینداروں اور مزارعوں، کارخانہ داروں اور مزدوروں اور خاوند بیوی کے مابین اختلاف، توڑ، بدمزگی بلکہ مستقل نفرت وبیزاری کا بیج بونے اور اس کی آبیاری کرنے کا شاندار ذریعہ ہے۔

یہ یورپ کا مؤثر ہتھیار ہے، جس کے ذریعے وحدت امت و مملکت، علاقائی علامات، خلافت، مرکزیت اور جماعت بندی کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور جس ”حبل الوحدت“ سے افراد مسلمین کو باندھ کر امت مسلمہ بنادی گئی تھی اس کا ایک ایک تانا، بانا کھل کر بکھیر دیا گیا۔

”دین اسلام“ نام ہی وحدت واخوت کا ہے

اسلام کی تعلیمات سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ الفت واخوت، صلح وآشتی، بھائی چارہ

اور انس پیدا کرنے والا دین اور نظام حیات ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ اس نعمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعدآء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا○ (پارہ: ۴، آل عمران، آیت: ۱۰۳)

"یعنی اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بن گئے"۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا○

(پارہ: ۴، آل عمران، آیت: ۱۰۳)

"اور سب مضبوطی سے اللہ کی رسی کو پکڑے رہو اور پارٹی بازی نہ کرو"۔

انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم○

(پارہ: ۲۶، سورہ حجرات، آیت: ۱۰)

"بے شک مسلمان بھائی بھائی ہیں تم دو بھائیوں میں میل جول کی تدابیر اختیار کرو"۔

لا تنازعو افتفشلوا وتذھب ریحکم○

(پارہ: ۱۰، سورہ انفال، آیت: ۴۶)

"اور آپس میں نزاع مت کر اس طرح تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہارا رعب جاتا رہے گا"۔

ان شواہد سے معلوم ہوا کہ "دین اسلام" اور "دین جمہوریت" ایک دوسرے کی ضد ہیں کیونکہ اسلام تو دشمنیاں مٹانے آیا ہے اور اس بارے میں بے مثال نمونہ بھی قائم کر دیا ہے، جبکہ جمہوریت بھائی کو بھائی سے لڑانے، تفرقہ ڈالنے، وحدت اور اخوت کو پارہ پارہ

کرنے کا پروگرام اور منشور لے کر آئی ہے۔

اسلام نے کسی سے دشمنی اور عداوت کا حکم نہیں دیا، اور نہ اسلام کسی کے خلاف جتھ بندی اور حزب مخالف بنانے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، البتہ شیطان اور "حزب شیطان" کے خلاف ہمہ وقت چوکس رہنے کی تاکید ضرور کرتا ہے۔

حزب اللہ اور حزب الشیطان

جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین کے لئے خلیفہ منتخب فرماکر مسجود ملائکہ بنایا اسی وقت اس خلیفہ کی حیثیت، استحقاق اور نامزدگی کو ابلیس لعین نے نہ صرف چیلنج کیا بلکہ اکثریت کا دعویٰ بھی کر ڈالا چونکہ یہ براہ راست اللہ تعالیٰ کے انتخاب اور اس کے نافذ کردہ آئین اقتدار پر "شیطان" کا دائمی اعتراض تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی شخصیت اور حیثیت سے صرف نظر فرماکر ایسے لوگوں کو حزب اللہ کا نام دیا، جو منتخب خلیفہ اور اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ دستور حیات اور آئین حکمرانی کی پیروی کرتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کو حزب الشیطان کا نام دیا، جو نظام خداوندی کے مخالف اور اپوزیشن کے لیڈر شیطان اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی کرتے ہیں۔ گویا کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے ابتدا ہی سے یہی دو حزب اور پارٹیاں ہیں، جو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے برسرپیکار ہیں اور رہیں گی اس بات کی وضاحت قرآن کریم یوں فرماتا ہے:

> وقلنا اھبطوا بعضکم لبعض عدو ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین○ (پارہ:۱، سورۃ البقرہ، آیت:۳۶)
>
> "اور ہم نے کہا تم سب اترو (اس حال میں) کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لئے زمین میں ٹھکانا ہے اور سامان (معاش) ایک معین وقت تک کے لئے"۔

فاما یاتینکم منی هدی فمن تبع هدی فلا خوف علیهم ولا هم یحزنون○ والذین کفروا و کذبوا بآیاتنا اولئک اصحاب النار○

(پارہ:۱، سورۃ البقرہ، آیت:۳۸)

"پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے پس جو میری ہدایت کی اطاعت کریں گے ان پر نہ تو کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہونگے اور جو انکار کرینگے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہی دوزخی ہوں گے"۔

الم تر الی الذین تولوا قوما غضب اللہ علیهم ما هم منکم ولا منهم (الی قوله تعالیٰ) استحوذ علیهم الشیطان فانسٰهم ذکر اللہ اولئک حزب الشیطان الا ان حزب الشیطان هم الخاسرون○

(پارہ:۲۸، سورۃ المجادلہ، آیت:۱۴)

"کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اس قوم سے دوستی کر رکھی ہے جن پر اللہ کا غضب ہے نہ تو وہ تم میں سے ہیں، اور نہ ان میں سے (یعنی منافقین ہیں)" "تا آخر آیت" "ان پر شیطان نے غلبہ پالیا ہے پس شیطان نے بھلا دی ان کو اللہ کی یاد یہی لوگ شیطان کا گروہ ہے، خبردار شیطان کا گروہ ہی خسارہ میں ہوتا ہے"۔

ان الذین یحادون اللہ ورسوله اولئک فی الاذلین○

(پارہ:۲۸، سورۃ المجادلہ، آیت:۲۰)

"بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں (اسلامی اقتدار اعلیٰ کے لئے اپوزیشن کا کردار اپنا کر مقابلہ کرتے ہیں) یہی لوگ سب سے زیادہ ذلیل لوگ ہیں"۔

لا تجد قوما یومنون باللہ والیوم الآخر یوآدون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا آبائھم او ابنائھم او اخوانھم او عشیرتھم (إلٰی قولہ تعالٰی) اولئك حزب اللہ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون ○ (پارہ:۲۸،سورۃ المجادلہ، آیت:۲۲)

”آپ ایسی قوم نہ پائیں گے (یعنی مسلمان ہونے کے منافی ہے) کہ وہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اور ان لوگوں سے بھی دوستی رکھتی ہو جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، (یعنی اسلامی متشرع حزب اقتدار کے لئے اپوزیشن کا کردار اپنائیں اپوزیشن کا ساتھ دیں) اگرچہ وہ (اپوزیشن والے) ان کے باپ، یا بیٹے، یا بھائی، یا قوم، قبیلہ اور پارٹی کے لوگ کیوں نہ ہوں (تا آخر آیت) یہی لوگ اللہ کا گروہ ہے، خبردار اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے“۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اسلام مسلمانوں کو آپس میں وحدت، اخوت اور یگانگت کا حکم دیتا ہے اور گروہ بندی، فرقہ واریت اور کثیر الجماعتی نظریہ سے منع کرتا ہے اور پھر اس متحدہ محاذ کو ”حزب اللہ“ کا نام دے کر ہر زمان ہر میدان اور ہر محاذ پر ”حزب الشیطان“ کو نیچا دکھانے کا حکم دیتا ہے۔

جبکہ دین جمہوریت کی اساس اس اصول پر ہے کہ ہر حزب اقتدار خواہ وہ سو فیصد متشرع اسلامی اور حقیقی طور پر قرآن اور سنت پر مبنی کیوں نہ ہوں، اس کے خلاف اپوزیشن بنائی جائے جو قرآن وسنت پر مبنی آئین، منصوص احکامات اور نظام کے خلاف قولاً اور عملاً سرگرم عمل ہو، اور ایک ایک حکم کے خلاف حقارت آمیز بیانات کا اسمبلی، سینٹ، نشر واشاعت، جلسوں جلوسوں میں بھرمار کرنے کی نہ صرف اس کو اجازت ہو بلکہ یہی ان کا کمال سمجھا جائے، اور پھر جب مسلمان کی یہ حالت ہو کہ وہ قرآن وسنت پر مبنی نظام حکومت کے

خلاف جمہوریت کی بقا کیلئے کھلے عام مقابلہ کے لئے میدان میں نکل آئے اور اسلام کا استحصال کرے تو غیروں سے کیا گلہ ؟

چنانچہ آج پاکستان میں جمہوریت کے حوالہ سے حدود، قصاص، دیت، شہادت، میراث اور حجاب جیسی قطعی نصوص کے متعلق نام نہاد مسلمان مردوں اور عورتوں کی طرف سے جو ہتک آمیز برتاؤ ہو رہا ہے، تو دل سوختہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ

ے چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

دین اسلام اور دین جمہوریت کے اصولوں میں تضاد

اسلام اپنے پیروکاروں کو ہدایت کرتا ہے کہ تمہاری آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ یا غیروں کے ساتھ نصرت اور تعاون کے لئے بنیادی اور دائمی اصل واساس تقویٰ ہے، یعنی ہر نیک کام میں مسلمان ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں گے اور معصیت وظلم کے کام میں کسی کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے، خواہ وہ اپنی حزب اور پارٹی کا کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان ○

(پارہ:۶، المائدہ، آیت:۲)

"اور تم ایک دوسرے کی نیکی اور پرہیزگاری میں مدد کرو اور گناہ اور ظلم پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو"۔

ولا تکن للخائنین خصیما ○ (پارہ: ۵، س ۴، آیت: ۱۰۵)

"اور خیانت کرنے والے لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والا نہ بن"۔

من یشفع شفاعۃ حسنۃ یکن لہ نصیب منھا ومن یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منھا ○ (پارہ:۵، س ۴، آیت:۸۵)

"جو کوئی اچھی بات میں سفارش کرے اس کے لئے بھی اس میں سے
(اچھائی کا) ایک حصہ ہوگا، اور جو کوئی بری بات میں سفارش کرے اس
میں سے (برائی میں سے) بھی اس کے لئے ایک بوجھ ہوگا"۔

یعنی اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ ایک دوسرے سے تعاون یا عدم تعاون اور سفارش یا عدم سفارش کا معیار اور محرک، پارٹی، جماعت اور سیاسی اتحاد نہیں، بلکہ نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی ہے اپنے بھی اگر برائی اور ظلم وخیانت کا ارتکاب کرنے لگیں تو نہ صرف یہ کہ ان سے تعاون نہ کرو بلکہ انہیں اس برائی سے روکنے کے لئے حسب استطاعت عملی قدم بھی اٹھاؤ چنانچہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔

من رای منکم منکرا فلیغیره بیده فان لم یستطع فبلسانه فان لم یستطع فبقلبه وذالك اضعف الایمان.

تم میں سے جس کسی نے بدی اور برائی دیکھ لی تو اس کو طاقت سے ختم کرے اگر ایسی قوت نہ ہو تو اس کے خلاف زبان سے جہاد کرے اگر یہ طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو دل سے نفرت کرے اور اس کے مٹانے کا عزم رکھے اور یہ (آخری صورت) کمزور ایمان ہے۔

اس کے برعکس جمہوریت کے خمیر میں یہ بات گوندھی گئی ہے کہ ہر حال میں اپنی پارٹی، اس کے ورکروں، اس کے منشور اور اس کے لائحہ عمل کا ساتھ دو، اس کی حمایت اور تائید کرو خواہ حق پر ہو یا باطل پر، قرآن وسنت کی صریح نصوص کی مخالفت ہو یا موافقت، اور مخالف پارٹی کی مخالفت کرو خواہ وہ حق اور صداقت ہی پر کیوں نہ ہو اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو تم پر فلور کراسنگ کی فرد جرم عائد کی جائے گی جس کے نتیجہ میں آپ کی رکنیت، ممبری بلکہ وزارت تک ختم ہو سکتی ہے۔

اخلاقی اقدار کے معیار میں اسلام اور جمہوریت کا تضاد

دین جمہوریت میں اخلاقی قدریں، اچھائیاں اور برائیاں مستقل اور متعین نہیں ہوتیں کیوں کہ حلت اور حرمت، جواز اور عدم جواز، اچھائی اور برائی، حق اور باطل کے تعین کا معیار عوام ہیں جن کی طاقت لامحدود ہے اور دین جمہوریت کی یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ اکثریت کی خواہشات نفسانی کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ احکامات بھی بدلتے رہتے ہیں، جمہوری ممالک میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً امریکہ میں ایک مرتبہ پارلیمنٹ نے شراب کی ممانعت کردی مگر زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ اسی پارلیمنٹ نے اسے پھر جائز قرار دے دیا، اسی طرح ڈنمارک میں عورتوں کی جگہ لڑکوں سے باقاعدہ نکاح اور ازدواج کا قانون بن گیا، لندن میں بھی لواطت کو قانوناً جائز قرار دیا گیا اس لئے کہ اکثریت نے یہی چاہا نیز لندن میں ایک انگریز نے اپنی کتیا کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے نکاح کرلیا۔ اور ایک پاکستانی عورت نے ایک عورت کے لئے بیک وقت چار مردوں سے نکاح کرنے کے جواز کا اعلانیہ مطالبہ کیا، مگر تا ہنوز اکثریت کی رائے اس کے خلاف ہے اور عین ممکن ہے کہ کل کسی جمہوری ملک میں ماں، بہن اور بیٹی سے نکاح کرنا قانوناً جائز قرار دے دیا جائے کیونکہ جائز وناجائز کا معیار اکثریت کی پسند وناپسند ہے۔ ۱۹۸۹ء میں جب اکثریت نے بے نظیر بھٹو کو پاکستان کی وزارت عظمیٰ کے لئے منتخب کیا، تو نہ صرف بعض علماء نے بلکہ صدر مملکت تک نے فرمایا کہ۔

"اسلام میں تو عورت ملک کی سربراہ نہیں بن سکتی مگر ملک کے آئین میں اس پر کوئی پابندی نہیں" (ماہنامہ الرشد لاہور ۱۹۹۰ء اپریل) یعنی (پاکستان میں) جمہوری آئین ہے اسلامی نہیں اور جمہوریت میں جواز کا ماخذ اکثریت کا فیصلہ ہوتا ہے۔

شاید اسی احساس کے پیش نظر پاکستان کے سابق وزیر دفاع مسٹر علی احمد تالپور

مرحوم نے ایک اخباری بیان میں فرمایا تھا کہ۔

"میں یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ پاکستان اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا، اگر ایسا ہوتا تو کیا غلام محمد، ایوب خان، یحییٰ خان، سکندر مرزا اور بھٹو جیسے لوگ اس ملک کے حکمران ہوتے؟" (ماہنامہ المرشد لاہور اپریل ۱۹۹۰ء)

اس کے برعکس دین اسلام میں اخلاقی اقدار، اچھائی اور برائی کے اصول نپے تلے، اٹل، دائمی اور متعین ہیں، جن میں تاقیامت تغیر اور تبدیلی کا کوئی امکان نہیں اسلام میں مقتدر اعلیٰ وہی ذات ہے جو کائنات کا خالق بھی ہے اور مالک بھی، کسی جمہوری ملک کے دین جمہوریت کی اکثریت تو کیا ملک کی پوری آبادی بلکہ ساری دنیا کے انسان بھی اگر کسی حکم خداوندی یا اسلام کے متعین کردہ اخلاقی اقدار کے خلاف یا اس میں تبدیلی اور کمی بیشی وغیرہ کے حق میں ووٹ دے دیں، تب بھی وہ حکم نہیں بدل سکتا بلکہ کسی نبی اور رسول خدا کو بھی یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنی صوابدید، اکثریت بلکہ جملہ عوام اور کل امت کی خواہش کے مطابق کسی منصوص حکمِ خداوندی میں تبدیلی یا کمی بیشی کر سکے۔

اتبع ما او حی الیک من ربک لا الہ الا ھو ٥

(پارہ:۷، س۶، آیت:۱۰۶)

"یعنی اے نبی! اس وحی کی پیروی کئے جاؤ جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی الٰہ (مقتدر اعلیٰ) نہیں"۔

جب حضور علیہ السلام پر مکہ والوں کی زبردست اکثریت کی طرف سے یہ دباؤ بڑھا کہ خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی میں تغیر اور تبدیلی کی جائے۔

جس کا ذکر قرآن کریم یوں فرماتا ہے:

ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ ٥

(پارہ:۱۱، س۱۰، آیت:۵)

"اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لایئے یا اس میں کچھ تبدیلی یا کمی بیشی کیجئے"۔

اگر دین جمہوریت کی بات ہوتی تو واقعی اس مطالبے پر غور کیا جا سکتا تھا، بلکہ لازماً کیا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے اس مطالبے کو کلیۃً رد کرتے ہوئے اپنے پیغمبر کی زبانی اعلان کرا دیا کہ:

قل ما یکون لی ان ابدله من تلقاء نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم○

(پارہ:۱۱، س ۱۰، آیت:۱۵)

"یعنی اے میرے نبی! ان سے کہہ دو کہ میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے اس کتاب میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے"۔

بالغ رائے دہی اور دین اسلام

ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ دین جمہوریت جس پر آج مسلمان بھی ہزار جان سے فدا ہو رہے ہیں، اس کے بنیادی اصول "بالغ رائے دہی" کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنے ملک میں اسلامی نظام اور شریعت اسلامی لانے اور نافذ کرانے کے لئے بالغ رائے دہی کے اصول پر نمائندے منتخب کریں اور پھر یہی نمائندے اسمبلی ہال میں ہاتھ اٹھا کر اکثریت ثابت کریں۔ جس کی اساس پر پھر قرآن اور سنت پر مبنی شرعی نظام اور قوانین نافذ کئے جائیں گے، اور قرآن اور حدیث کے خلاف جو قانون بھی ہوں انہیں چن چن کر مذکورہ ترتیب (ہاتھ اٹھانے) کی اساس پر منسوخ کریں گے، اسی اصول کو جمہوری ممالک میں سب سے پہلے تحفظ دیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قوم کا ہر وہ فرد، مرد ہو یا عورت جوں ہی انتخابی

بلوغت کی عمر کو پہنچے فوراً وہ اس امر کا فیصلہ کرنے کا اہل بن جاتا ہے کہ کون شخص اسلامی قوانین وضع کرنے اسے نافذ کرنے اور قرآن وسنت کے مطابق حکمرانی کی اہلیت رکھتا ہے؟ گویا کہ انتخابی سن بلوغت کو پہنچتے ہی انسان میں یہ ملکہ از خود پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اسلامی شریعت، اسلامی حکومت اس کے لئے مقننہ ادارہ اور قوت نافذہ وغیرہ پر ماہرانہ تنقیدی نگاہ ڈالا کرے اور جسے ہم ووٹ کہتے ہیں، وہ محض ایک رائے نہیں بلکہ ووٹر کا یہی ماہرانہ حتمی فیصلہ ہوتا ہے جو وہ سوچ سمجھ اور غور وخوض کے بعد للّٰہیت کے جذبہ کے تحت کرتا ہے۔

اس اصول اور جذبے کے تحت ہر دلعزیز جمہوریت کی نگاہ میں ایک جاہل گنوار اور ایک پی۔ایچ۔ڈی کا فیصلہ اور سوچ یکساں ہیں، کیونکہ دونوں بالغ ہیں اسی طرح ایک چور، ڈاکو اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس یا قاضی القضاۃ کا فیصلہ برابر ہے، ایک ڈوم اور بھانڈ کے فیصلے اور ملک کے صدر اور وزیر اعظم کے فیصلے میں کوئی فرق نہیں ایک شرابی، زانی، سود خور اور جواباز کا فیصلہ اور ملک کے مفتی اعظم کا فیصلہ ایک جیسی قدر وقیمت رکھتا ہے، ایک اجرتی قاتل اور جرائم پیشہ کا فیصلہ اور ایک مذہبی وروحانی امام اعظم کا فیصلہ برابر وزن رکھتے ہیں۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اسلام کی بات تو بعد میں ہوگی پہلے یہ دیکھنا ہے کہ کیا عقل (Common Sense) اس اصول کی تائید کرنے کی حماقت کر سکتی ہے کہ جاہل، اوباش اور فاسق وفاجر کا یہ فیصلہ کہ فلاں شخص شرعی اور اسلامی حکومت کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اسی قدر وقیمت کا حامل ہے جو ایک صاحب کردار عالم دین، ماہر تعلیم اور دیندار متقی شخص کے فیصلے کی ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی عقلمند، دانشور عقل وہوش کے ہوتے ہوئے یہ فیصلہ دے کہ دونوں کی سوچ برابر ہے، کیونکہ دونوں بالغ ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پبلک سروس کمیشن کے ممبران میں چن چن کے ایسے لوگ کیوں رکھے جاتے ہیں جو متعلقہ سبجیکٹ اور مضمون میں اسپیشلسٹ اور ماہر

نفسیات ہوں، ایڈمنسٹریشن کے فن میں مہارت رکھتے ہوں وغیرہ وغیرہ، اگر بالغ رائے دہی کا اصول صحیح اور مشکل کشا ہے تو کیوں ایسا نہیں کیا جاتا کہ پبلک سروس کمیشن میں ایک دو رقاصائیں، دو چار ڈوم اور بھانڈ، ایک دو چور اور ڈاکو، تین چرواہے اور گنوار بھرتی کرلئے جائیں جو بالغ ہوں اور کثرت رائے سے فیصلہ دے دیا کریں کہ فلاں شخص پروفیسر یا ڈاکٹر یا انجینئر یا ایس پی یا ڈی سی کا کام کرنے کی اہلیت رکھتا ہے یہ کیسی عقل ہے کہ مذکورہ دنیاوی عہدوں کے تعین کے لئے تو دین جمہوریت کے بالغ رائے دہی کے اصول کو ترک کرتی ہے، بلکہ اس پر عمل کرنے کو نری حماقت قرار دیتی ہے اور اس کیلئے چوٹی کے ماہرین کا فیصلہ اور انتخاب ہی معیار اہلیت قرار دیتی ہے اس لئے کہ اس میدان میں محض سروں کی گنتی پر فیصلہ کرنا ملک وملت کو تباہ کرنے کے مترادف ہے یہاں گویا وہ بھی کہتے ہیں کہ ؎

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
که از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

مگر قرآن وسنت کے مطابق حکومت چلانا اسلامی اخلاق واقدار کے مطابق معاشرہ اور نظام معیشت قائم کرنا ایسا عبث اور بے کار کام ہوا کہ اس کی اہلیت کا فیصلہ ہر کس وناکس کرسکتا ہے کیوں کہ وہ بالغ ہے، اس کے لئے بلوغت کے سوا مزید علم وفضل، مہارت وہنر، تقویٰ وشرافت، خدا پرستی اور انسانیت کی کوئی ضرورت نہیں، کیا یہ اسلام کے ساتھ مذاق تمسخر اور استہزاء نہیں؟ لیکن افسوس کہ ایسا کرنے والے اور چاہنے والے عقل کے بیر داور مسلمان بھی کہلاتے ہیں۔

؎ ہزار خندۂ کفر است بر این مسلمانی

اب دیکھیں کہ اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ اسلام کی ناقابل انکار اور تغیر وتبدل سے محفوظ دستاویز یعنی قرآن کریم نے اس بارے میں ایک اصول بتایا ہے، اور بتانے کا انداز بھی نرالا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:

قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون انما يتذكر اولو الالباب ۝ (پارہ: ۲۳، س ۳۹، آیت: ۹)

"اے میرے پیغمبر! ان لوگوں سے پوچھو کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہوتے ہیں یعنی ان دونوں کا فیصلہ اور رائے کسی امر کے بارے میں یکساں ہوتا ہے؟ یقیناً سمجھتا ہے (اس سوال کا جواب) ہر عقل و ہوش رکھنے والا، یعنی اس طرز سوال کے اندر ہی اس کا جواب موجود ہے (بشرطیکہ عقل کا اندھا نہ ہو) کہ یہ دونوں ہرگز برابر نہیں ہوتے"۔

قرآن کریم کا یہ اصول ایسا جامع، ہمہ گیر، دائمی اور بین الاقوامی ہے کہ معمولی سوچ اور عقل رکھنے والا انسان بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا اور یہ "جاننا" اور "نہ جاننا" اتنا وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو اس کے دائرہ سے باہر نہیں مثلاً۔ کیا کسی مرض کے متعلق ایک ماہر ڈاکٹر اور ایک نرے جاہل گنوار کا فیصلہ اور رائے برابر ہوگی؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو کیا قرآن و سنت کے علوم تقویٰ اور خدا پرستی کی ابجد سے ناواقف، اور اسلامی علوم و اخلاق کا تربیت یافتہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ مروّجہ انتخابی اصول کے تحت تو اکثریت ان رائے دہندگان کی ہوتی ہے، جو اسلامی علوم اور اسلامی ذہنیت کو بنیاد پرستی وغیرہ القاب سے نوازتے ہیں بقول کسے ؎

زمن گیر ایں کہ مردے کور چشمے ز بینائے غلط بینے نکوتر
زمن گیر ایں کہ نادانے نکو کیش ز دانشمند بے دینے نکوتر

جب دین جمہوریت کی ابتدا ہی اسلامی حکومت چلانے والوں کی اہلیت کے بارے میں ایسی خلاف عقل اور خلاف نقل اصول سے ہے، تو اس میں کسی شک و شبہ کی سرے سے گنجائش ہی نہیں رہتی کہ جمہوریت کا یہ اصول اسلام کے مطابق تو کیا بلکہ حماقت اور جہالت کا

شاہکار ہے، بلکہ اسلام نے تو نہ جاننے والوں کی رائے کو سرے سے ہی مسترد کر دیا ہے
چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ولا تتبع اهواء الذين لا يعلمون ۝

(پارہ: ۲۵، س ۴۵، آیت: ۱۸)

''اور نہ جاننے والوں کی خواہشات کی پیروی مت کرو''۔

ارأيت من اتخذ الهه هواه افانت تكون عليه وكيلا ۝ ام تحسب
ان اكثرهم يسمعون او يعقلون ان هم الا كالانعام بل هم اضل
سبيلا ۝ (پارہ: ۱۹، س ۲۵، آیت: ۴۴)

''کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہشات کو خدا بنا رکھا ہے پھر
کیا تو اس کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ یا تو خیال کرتا ہے کہ اکثر ان میں سے سنتے
ہیں یا سمجھتے ہیں، یہ تو نرے چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ
گمراہ اور بے راہ ہیں''۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ نہ جاننے والے جو بھی فیصلہ کرتے ہیں ان کا علم
و دانش، حقیقت شناسی اور خدا پرستی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ان کی نفس پرستی اور خود
غرضی کا مظہر ہوتا ہے جسے قبول کرنا بھی انکی جہالت اور خود غرضی پر مہر تصدیق ثبت کرنے
کے مترادف ہوگا۔

رقم بر خود بہ نادانی کشیدی
چوں نادان را بصحبت بر گزیدی

ان سب حقائق کو پیش نظر رکھ کر بتایئے کہ کیا ہزار ہا سال تک مروجہ جمہوریت کے
بالغ رائے دہی کے اصول کے تحت پاکستان یا دوسرے مسلمان، جمہوری ممالک میں ماہر علماء
اسلام متشرع مقننہ اور حکمران وجود میں آسکتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں

ہے، تو کیا علماء اسلام اور حقیقی مسلمانوں کا فرض نہیں کہ دین جمہوریت جیسے باطل نظریے سے صرف یہ نہیں کہ خود اپنے دامن کو محفوظ رکھیں بلکہ اس کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے جہاد شروع کریں اور اسلام نافذ کرنے کے لئے صرف اور صرف حضور ﷺ کی ۲۳ سالہ زندگی کو ہی مشعل راہ بنائیں۔ اقبال نے کیا پتے کی بات بتائی ہے ؎

تا تہہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب دین سودائے خام

کیا ووٹ کے ذریعہ اسلامی انقلاب لانا ممکن ہے؟

چونکہ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اولین فریضہ "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" ہے، جس کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امت مسلمہ کا اولین کام اقتدار پر قبضہ کرنا ہے، کیونکہ امر اور نہی در حقیقت اس حکم کو کہا جاتا ہے جس کے پیچھے "قوت نافذہ" کا زور ہو، لہٰذا آج کے دور میں بھی جب اسلام پسند جماعتوں، اسلامی ذہن رکھنے والے حضرات اور اسلامی انقلاب کے داعی لیڈروں نے دیکھا کہ اقتدار پر قبضہ کئے بغیر اسلامی نظام کی ترویج ناممکن ہے، تو انہوں نے اس کا حل یہ تلاش کیا کہ نیک شہرت رکھنے والے صحیح مسلمانوں کو انتخابات میں نامزد کیا جائے اور عوامی فضا کو ان کے حق میں بنانے کے لئے بڑے پیمانے پر تقریریں، جلسے اور جلوسوں کا اہتمام کیا جائے اور جب ایسے افراد کی اکثریت اسمبلیوں میں پہنچ جائے گی، تو بڑی آسانی اور پر امن طریقے سے بغیر کسی خون خرابہ کے اسلامی انقلاب آجائے گا، مگر بوجوہ "ایں خیال است محال است جنون"۔

جس کا تلخ تجربہ الجزائر میں ہو چکا ہے کہ وہاں بذریعہ جمہوریت جب اسلام کے نفاذ کا صرف امکان پیدا ہوا تو جمہوریت کے محافظوں نے مارشل لاء لگوا کر اسلام پسند قائدین اور

کارکنوں کو دار ورسن تک پہنچادیا۔ اس ترتیب سے انقلاب لانا کیوں ناممکن ہے اس کی چند وجوہ ہیں۔

وجہ اول :

اسلامی انقلاب کی اولین داعی جماعت، جماعت الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پوری تاریخ کو ٹٹول کر دیکھیں کہیں بھی یہ نظر نہیں آئے گا کہ کسی پیغمبر نے وعظ و تبلیغ کے ذریعے لوگوں کی رائے اور مرضی کی اکثریت کو اپنے ساتھ ملا کر اسلامی انقلاب برپا کیا ہو۔

دور نہ جائیے قرآن کریم جو جملہ انبیاء علیہم السلام کی اصولی تعلیمات کا حامل ہے، اس کا اور سنت النبی علیہ السلام کا مطالعہ کیجئے کہ ۱۳ سال تک موثر اور بلیغ ترین انداز میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کی انتہائی کوشش کے باوجود آپ ﷺ اور آپکی جماعت اسلامی انقلاب تو کیا، الٹا ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئی۔ اور حقیقت میں آپ ﷺ اور آپ کی جماعت تو صرف "ہجرت اور جہاد" کے ذریعہ اسلامی انقلاب لانے میں کامیاب ہوئی۔

وجہ دوم :

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت و تبلیغ اور ان کے منشور کا پورا سلسلہ اگر آپ دیکھیں تو کبھی اور کہیں بھی عوام کی اکثریت نے انہیں پسند نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اسے مسترد کیا تو آج انبیاء علیہم السلام کے ورثاء کیونکر عوام سے ایسی امیدیں وابستہ کیئے ہوئے ہیں؟

وجہ سوم :

عامۃ الناس میں ہر جگہ نصف آبادی عورتوں کی ہے، دین جمہوریت میں انہیں مردوں کے ساتھ مساوی حقوق دیئے گئے ہیں جبکہ اسلامی نظام معیشت میں بعض ایسے احکامات ہیں کہ ظاہری اور سطحی نگاہ میں عورتوں کے مساوی حقوق کے منافی ہیں، مثلاً میراث، دیت اور گواہی میں مرد کی نسبت ان کا نصف حصہ، ایک مرد کے لئے چار تک بیویوں کی اجازت اور حجاب وغیرہ کی پابندیاں۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جسے بطیب خاطر کوئی عورت پسند نہیں کرتی۔ کیا ایسی بھی کوئی عورت ہوگی جو اپنے لئے بطیب خاطر خاوند کی

دوسری بیوی (سوکن) پر رضامند ہو، الا ماشاء اللہ۔ حالانکہ اسلام نے اس کی اجازت دے رکھی ہے اور پھر عورتوں کو اسلام سے نفرت دلانے کے لئے بے دین پارٹیوں کی طرف سے انتخابات میں ایسے مذکورہ امتیازی احکامات کو خوب اچھالا بھی جاتا ہے۔ تو بھلا ایسی صورت میں عورتوں سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اسلام کے حق میں ووٹ دیں گی؟

وجہ چہارم :

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، جس کا تجربہ ہر ملک، شہر اور بستی میں ہو رہا ہے کہ اگر ایک طرف ایک دینی کام یا دینی اجتماع ہو رہا ہو، جو عوام کی خواہشات نفس کے خلاف ہو اور اس کی طرف بلانے کی منادی ہو رہی ہو اور دوسری طرف اس کے مقابل بے دینی کی ایک محفل جمی ہوئی ہو، جو عوام کی خواہشات نفس کے عین مطابق ہو تو تجربہ شاہد ہے کہ بے دینی کی محفل کی طرف سب امڈ پڑتے ہیں۔ اور اس کے مقابل دینی اجتماع میں شرکاء کی نسبت "اونٹ کے منہ میں زیرہ" کے مصداق ہوتی ہے۔

تو کیا الیکشن کے دوران عوام الناس علماء کے وعظوں کو گمراہ پارٹیوں کے ناچ گانوں، دعوتوں، دولت، پر فریب نعروں اور منشوروں پر ترجیح دیں گے؟ اگر کوئی اثبات میں جواب دیتا ہے، تو یہ خلاف تجربہ، خلاف عقل اور خلاف حقیقت ہے اور ایسی بات بے وزن ہو گی۔ اگرچہ کہنے والا کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو۔

وجہ پنجم :

پاکستان میں کئی انتخابات منعقد ہوئے جن میں سے بعض واقعی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہوئے ہیں۔ ان انتخاب میں جمعیت العلماء اسلام، جمعیت العلماء پاکستان، جماعت اسلامی، سپاہ صحابہؓ، جمعیت اہل حدیث جیسی خالص اسلامی اور مذہبی جماعتوں نے بھرپور حصہ لیا۔ تقریروں، تحریروں، جلسوں جلوسوں کے ذریعہ رائے عامہ ہموار کرنے کی معتد بہ کوشش کی گئی، انتخابات سے قبل تک مبصرین کی پیشین گوئی تھی کہ مذہبی جماعتوں نے اگر

میدان نہ بھی جیتا تو بھی لادین جماعتوں کے ساتھ برابر کی چوٹ ہو گی، مگر انتخابات کے نتائج نے نہ صرف اسلام پسند جماعتوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا بلکہ مذہبی لوگ حوصلہ ہار بیٹھے۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی شترِ بے مہارِ عوام نے کلیسا کی خود ساختہ مسیحیت، پاپائیت اور آمریت کے خلاف دین جمہوریت کو وجود دیا، اب جس ازم کی بنیاد ہی دین سے بغاوت پر رکھی گئی ہو، اس سے دین اور مذہب کے فروغ کی امیدیں باندھنا خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں ہے ایک دیدہ ور نے کیا خوب نشان دہی فرمائی ہے ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الامان
یہ بھی ایک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستان سمجھا ہے تو
آہ اے نادان قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

نیز ؎ فرنگ آئینِ جمہوری نہاد است
رسن از گردنِ دیوے کشاد است

اہلِ یورپ سے گلہ اور شکایت مناسب نہیں، بلکہ وہ تو داد و تحسین کے لائق ہیں کہ کس خوبی اور سلیقے سے انہوں نے مسلمان کے ہاتھ میں تیشۂ جمہوریت تھما دیا، جسے وہ اسلام کے شجرِ طیبہ کی جڑ اور شاخوں پر بڑی فراخ دلی سے چلانے میں مصروف ہے۔ مگر حسرت تو

اپنوں پر ہے کہ وہ کس ناز و فخر سے دین جمہوریت کو دین اسلام ثابت کرنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں۔

من از بیگانگاں ہر گز نالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

علامہ اقبال شاید ایسوں کو ہی سمجھانے کے لئے فرما گئے ہیں ؎

غیر حق چوں ناہی و آمر شود
زوردر بر ناتوان قاہر شود
زیر گردون آمری از قاہری است
آمری از ما سو اللہ کافری است
سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

باب نہم

حصولِ مناصب دین جمہوریت کی نگاہ میں

دین جمہوریت میں اسمبلیوں، سینیٹ وغیرہ کی ممبری اور مملکت کی صدارت، وزارت عظمیٰ وغیرہ ایسے عہدے ہیں، جو ملک کے باشندوں کے جمہوری اور بنیادی حقوق کے زمرے میں شمار کئے جاتے ہیں، جن کے لئے وہی چند عام اور معمولی شرائط اور قیود ہوتی ہیں، جو کسی عام دوٹر یا ممبر کے لئے ہونی چاہئیں، جن کے ہوتے ہوئے ہر کس و ناکس، مرد و زن، حتی کہ ہیجڑا (مخنث) اور جاہل، فاسق و فاجر اور بری شہرت رکھنے والا بھی اس کا دعویدار بلکہ حق دار ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ دین جمہوریت میں کسی عہدے اور منصب کی حرص و طلب عیب نہیں بلکہ کمال سمجھا جاتا ہے، اس کے لئے اگر کوئی بنیادی شرط ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ مروجہ اکثریت (جو کہ در حقیقت اقلیت ہوتی ہے) حاصل کرنے کی مہارت رکھتا ہو۔

دین جمہوریت میں حصول اقتدار کے لئے بنیادی شرائط

جمہوریت میں اعلیٰ یا ادنیٰ عہدہ کے حصول کا واحد ذریعہ ان پڑھ اور نچلے طبقے (جن کی ہر جگہ اکثریت ہوتی ہے) کی حمایت حاصل کرنا لازمی شرط ہے، جس کے لئے درج ذیل ہتھیار رکھنے ضروری ہیں۔

۱۔ قوت دولت : یعنی دوٹروں کے ضمیر خریدنے کی بھرپور مالی استطاعت موجود ہو۔

۲۔ قوت خطابت : یعنی عوام کالانعام کو اُلّو بنانے کے لئے سبز باغ دکھانا اور ناممکن مراعات دینے کے جھوٹے وعدے کرنا جانتا ہو۔

۳۔ قوت پروپیگنڈہ : ملکی اور بین الاقوامی نشریاتی اداروں کو ہمنوا بنا کر ان کے ذریعے

اپنے حق میں عوامی ذہن بنانا جانتا ہو۔

۴۔ زور بازو : یعنی طاقت اور غنڈہ گردی کے بل بوتے پر ووٹروں کو ڈرانے، دھمکانے اور پولنگ اسٹیشنوں تک کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۵۔ ووٹروں کی رجسٹریشن : حلقہ بندی سے لیکر گنتی تک ہر مرحلہ میں دھاندلی، فریب کاری کی استطاعت اور مہارت رکھتا ہو۔

مذکورہ کمالات کے سوانہ تو کسی امیدوار کے لئے ایمانداری، دیانتداری اور دینداری کی ضرورت ہے اور نہ صداقت، عدالت، ذہانت، امانت اور علم جیسی صفات کی کوئی اہمیت ہے۔

چند مشہور یورپی اسکالروں کی رائے

۱۔ یورپ کے مشہور بالغ النظر مورخ "کارلائل" (Carlyle) لکھتا ہے:

"جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس میں اعلیٰ اور نیک خصلت مگر خاموش انسانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں، یہاں اقتدار لاف زنی کرنے والے دھوکا بازوں کے حصے میں آتا ہے"۔

۲۔ پروفیسر ہیئر لڈ لاسکی (Laski) اپنی کتاب "جمہوریت کا بحران" میں لکھتا ہے:

"رائے عامہ کا سرچشمہ نہ تو علم ہے اور نہ عقل و فہم، بلکہ اسے ہمیشہ اپنے اپنے گروہ کے مفادات جنم دیتے ہیں، اسی لئے انتخابات میں فیصلے ایسے عجیب و غریب وجوہ کی بنا پر کیے جاتے ہیں، جن کا کسی طرح بھی علمی تجزیہ نہیں کیا جاسکتا"۔

۳۔ مشہور یورپی تجزیہ نگار جیننگ پیری (Jenning Perry) اپنی کتاب "جمہوریت کا گھر سے آغاز ہوتا ہے" میں لکھتا ہے کہ:

"امریکہ میں اگرچہ سیاہ فام باشندوں کو ووٹ کا حق حاصل ہے مگر انہیں

عمل کی دنیا میں اس حق سے محروم کرنے کے لئے ان پر اس طرح ۱۹۰۸ء
تک برابر ایک ٹیکس لگایا جاتا رہا جس کے نتیجہ کے طور پر ۱۹۳۶ء میں
ریاست کے گورنر کے انتخاب کے دوران بارہ لاکھ ووٹروں میں سے
صرف ۳ لاکھ باون ہزار افراد ووٹ دے سکے"۔

۴۔ ریاست ٹینس سی کے اسی انتخاب میں ایک شخص ایڈورڈیل کرمپ کے متعلق یونائیٹڈ پریس کے نمائندے کا بیان ہے کہ تنہا اس شخص کے قبضے میں ساٹھ ستر ہزار ووٹ تھے، یہ شخص ٹیلیفون پر بیٹھا ووٹوں کے سودے کیا کرتا تھا۔

۵۔ یورپی اسکالر مسٹر بلیکی (Blackie) لکھتا ہے کہ:

"عوام بالعموم یا تو فتنہ انگیز خطیبوں کے بھرموں میں آجاتے ہیں یا کسی
خوشامدی کی چکنی چپڑی باتیں انہیں موہ لیتی ہیں، یا سیاسی رہنماؤں کی
ظاہری شان و شوکت ان کی نظریں مفتوح کر لیتی ہیں، اس طرح کسی بہتر
آدمی کے انتخاب کے بجائے ملک کی عنان اقتدار نااہل لوگوں کو سونپ
دیتے ہیں"۔

۶۔ آئرلینڈ کے ممتاز مورخ اور مقالہ نگار ولیم ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی اپنی کتاب "جمہوریت اور آزادی" میں لکھتا ہے کہ "ووٹروں سے ووٹوں کے حصول کے لئے مختلف طریقہ ہائے کار اختیار کئے جائینگے بعض اوقات ووٹر کو براہ راست رشوت دی جائیگی یا براہ راست دھمکی دھونس" لیکی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتا ہے "جمہوریت کی کیا کہئے جس کے سبب شرابی، آوارہ، اوباش اور سماج دشمن عناصر بھی بعض اوقات الیکشن میں کامیاب ہو جاتے ہیں"۔

۷۔ فلسفۂ تاریخ کا نامور شارح اور ناقد جرمن معاصر "شپنگلر" لکھتا ہے کہ:

"کس طرح رومی "لیڈران کرام" عوام کو متاثر کرنے اور انہیں دھوکہ

دینے کے لئے خطابت اور اس کے متعلقات کا سہارا لیتے تھے؟ اس کے خیال میں یہ لوگ ایسے حربے استعمال کرتے تھے، جن میں سے اکثر ہمارے لئے قابل نفرین اور ناقابل برداشت ہونگے مثلاً دوران تقریر مصنوعی آہ وجذبات اور اپنے کپڑے پھاڑ ڈالنا وغیرہ۔ اور تو اور قیصر روم بھی پچاس سال کی عمر میں اپنے سپاہیوں کے لئے یہ کھیل کھیلنے پر مجبور تھے کیونکہ وہ اس کے عادی ہو چکے تھے اور خدمت کی بجا آوری سے پہلے اس ڈرامے کی توقع رکھتے تھے اس طریق کار میں سامعین کی شرمناک خوشامد بھی شامل تھی، اپنے مخالفین کے بارے میں شرمناک جھوٹ بولنا، فصاحت وبلاغت کے دریا بہانا، دھمکیاں دینا اور ٹکے دکھانا، اور ان سب سے بڑھ کر دولت کے حربے آزمانا بھی شامل تھا۔ اس طریق کار کا آغاز تو ۴۰۰ قبل مسیح کے ایتھنز ہی میں ہو چکا تھا اور اس کا عروج قیصر و کسریٰ کے دور میں ہوا۔ گویا الیکشن ایک ایسا اکھاڑہ تھا، جس میں صرف دولت ہی کود سکتی تھی"۔

۸۔ مسٹر ریمسے میور (Ramsay Muir) اپنی کتاب "انگلستان میں حکومت کس طرح کی جاتی ہے" میں لکھتا ہے کہ:

"اگر ووٹوں کے استعمال کی حقیقت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے ووٹ محض اس لئے نہیں ڈالے جاتے کہ ووٹروں کی پسند کے مطابق صحیح معیاری امیدوار نہیں ملتا۔ ووٹوں کی اچھی خاصی تعداد ایک معیاری امیدوار کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے "بڑی بلا" کے مقابلے میں "چھوٹی بلا" کے اصول پر نااہل لوگوں کو حاصل ہو جاتی ہے، اور ووٹ ناکام امیدواروں کو دیئے جانے کی وجہ سے بلحاظ نتیجہ ضائع ہو جاتے ہیں"۔

حصول مناصب دین اسلام کی نگاہ میں

دین جمہوریت کے برعکس دین اسلام کی بنیادی تعلیمات کی رو سے ممبری سے لیکر رئیس مملکت اور وزارت عظمیٰ تک تمام عہدے اور مناسب حقوق نہیں بلکہ ایک فریضہ، ایک امانت، ایک ذمہ داری اور ایک بوجھ ہیں، جسے طلب نہیں کیا جاتا، بلکہ اٹھانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث صحیحہ میں عہدوں کی طلب کو امیدوار کی نااہلی کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے، چنانچہ ازروئے اسلام مذکورہ ہر ایک عہدے کے لئے اس کی اہمیت کے پیش نظر کڑی اور سخت شرائط اور قیود کی پابندی لازمی قرار دی گئی ہے۔

اسلام میں حکمرانی نیابت ہے

دین اسلام میں "حکم"، حکمرانی، امر، نہی، یا اقتدار اعلیٰ بلاشرکت غیر، اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے۔

ان الحکم الا للہ ○ (س ۶، آیت: ۵۷)

الا لہ الحکم ○ (س ۶، آیت: ۶۲)

علامہ زمخشری حکم کے معنی حکومت کے کرتے ہیں، دیکھو (حکما من اھلہ وحکما من اھلھا) (کشاف جلد ۱، صفحہ ۲۶۷)

نیز علامہ ابو البقاء الحسینی رحمہ اللہ "حکم" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"حکم" ایک تصرف ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو ایسا کرنا چاہئے یا ایسا نہیں کرنا چاہئے"۔

(کلیات العلوم ابی البقاء الحسینی (الحکم) باب الحاء صفحہ ۲۸۰)

حکم عبارت ہے حکومت اور حکمرانی سے جو کہ اصالتاً اور بالذات اللہ تعالیٰ کی صفت

ہے اور نیابتا یعنی بطور امانت انسان کو سپرد کی گئی ہے، پس جنہوں نے اس نیابت کو امانتداری سے نبھایا وہ وفادار اور مسلمان ٹھہرے، جن کے سرخیل انبیاء علیہم السلام ہیں۔
اور جن لوگوں نے اس نیابت میں خیانت کی یعنی خودسر اور مطلق العنان حکمران بنے، یا عوام الناس اور پارلیمنٹ کو اصالتاً حکمرانی، قانون سازی اور شارعیت کا مقام دیا، انہوں نے نیابتی حکومت میں خیانت، غداری اور طاغوتی روش اپنائی جس کا سرخیل ابلیس لعین ہے۔

مسلمان اور نیابتی حکمرانی لازم وملزوم

دین جمہوریت کے بانیوں نے دین اور دنیا، مذہب اور حکومت کے درمیان تفریق کے لئے جو بھرپور اور مسلسل پروپگنڈا مہم چلائی، اس کے نتیجہ میں نہ صرف مغربی تہذیب وتعلیم پر ایمان لانے والے نام نہاد مسلمان بلکہ سادہ لوح حقیقی مسلمان بھی اس زعم میں مبتلا ہیں کہ دینداری اور دنیاداری، عبادت اور حکومت، مسجد اور ایوان صدر ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور ان کے اختیارات، خصوصیات اور دائرہ کار ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں، حالانکہ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ نہ تو حضور علیہ السلام کے اور نہ ہی خلافت راشدہ کے زمانہ میں عبادت اور حکومت، مسجد اور ایوان صدر میں سر مو فرق تھا اور نہ کوئی ثابت کر سکتا ہے بلکہ قرآن کریم اور احادیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کی رو سے یہ لازم وملزوم ہیں، اور مسلمان کی تخلیق اور اس کا ظہور ہی حکمرانی اور جہان بانی کے لئے ہوا ہے۔
چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ ○ (پارہ:۴، س ۳، آیت:۱۰۹)

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی (اصلاح) کے لئے بھیجی گئی ہو۔ اچھے کاموں کا حکم کرو گے اور برائیوں سے منع کرو گے اور اللہ تعالیٰ اور اس کی

حکمرانی پر ایمان رکھیں گے"۔

اور ارشاد نبوی ہے:

قال علیه الصلوٰة والسلام من رای منکم منکرا فَلْيُغَيِّرْهُ بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه وذالك اضعف الايمان او كما قال عليه السلام. (بحوالہ مشکوٰۃ، باب الامر بالمعروف)

"حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تم میں سے جس نے برائی دیکھی، تو اس کو طاقت کے ذریعہ ختم کرے، اگر اس کی قدرت نہ ہو تو زبان کے ذریعہ ختم کرے، اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو دل میں اس سے نفرت کرے اور یہ (آخری صورت) کمترین ایمان ہے"۔

تشریح: مذکورہ آیت کریمہ میں چار الفاظ امر، نہی، معروف، اور منکر کی حقیقت کا سمجھنا ضروری ہے تاکہ اصل مدعا کا سمجھنا آسان ہو جائے، چنانچہ لغت القرآن کے امام علامہ راغب اصفہانی اپنی مشہور کتاب "المفردات فی غرائب القرآن" میں مذکورہ چار الفاظ کا مفہوم یوں بیان فرماتے ہیں۔

المعروف والمنکر

المعروف اسم لكل فعل يعرف بالعقل او الشرع حسنه والمنكر ما ينكر قبحه بهما. (المفردات صفحہ ۲۳۸)

"معروف ہر وہ کام ہے کہ جس کی خوبی اور اچھائی پر عقل سلیم یا شریعت آسمانی گواہی دیتی ہو اور منکر وہ ہے جس کی برائی عقل یا شریعت سے ثابت ہو"۔

امر

الامر امرته اذا كلفته ان يفعل شيئا. (المفردات صفحہ ۲۳)

"جب آپ کسی کو امر کریں تو یہ تب صحیح ہو گا کہ آپ اس کو کرنے پر مجبور کریں"۔

اور علم اصول کی مستند کتاب حسامی میں لکھا ہے:

الامر طلب الفعل و موجبه عند الجمهور الالزام۔ (حسامی صفحہ ۲۹)

"جمہور علماء کے نزدیک امر کا مطلب ہے کہ کسی آدمی سے کسی کام کرنے کا لازمی مطالبہ کیا جائے"۔

نہی

النھی فی الاصطلاح ھو قول القائل لغیرہ علی سبیل الاستعلاء لا تفعل الخ۔ (نظامی حاشیہ حسامی صفحہ ۴۶)

"نہی کا مطلب شریعت میں یہ ہے کہ کسی کو جبراً اور بزور کسی کام سے منع کیا جائے"۔

اس لغوی تحقیق کے بعد واضح ہوا کہ ہر وہ کام جسے عقل سلیم یا شریعت آسمانی انسانیت کے لئے باعث فوز و فلاح اور بہبود و ترقی سمجھتی ہے وہ "المعروف" نیکی اور اچھائی ہے، اور جو کام مذکورہ مقاصد کے منافی اور ان کے حصول کے لئے ضرر رساں ثابت ہو وہ "المنکر" کے زمرے میں شمار ہوگا۔

اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا کہ "امر" اور "نہی" کا مفہوم اور مطلب صرف یہ نہیں کہ محض وعظ و نصیحت دعوت و تبلیغ اور عرض و گذارش پر اکتفاء کیا جائے، جو کہ مکی دور رسالت کی خصوصیت تھی بلکہ "امر" اور "نہی" کا صحیح مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ قوت کے بل بوتے پر کسی کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اس طور سے کہنا کہ وہ اس کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو، اور اسی قوت کو اصطلاح میں حکومت اور سلطنت یا قضاء قاضی کہا جاتا ہے جس پر مدنی دور محیط ہے۔

۱۹۷۹ء میں رمضان المبارک کے مہینہ میں بندہ عمرہ کے سلسلہ میں مدینہ منورہ میں تھا، ایک دن نماز مغرب کے بعد مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے باہر نکلا تو باب عمر رضی اللہ عنہ کے آگے دیکھا کہ کچھ پاکستانی خوانچہ فروش کھڑے باہر آنے والوں کو

"پکوڑے" "سموسے" اور "چٹنی" وغیرہ خریدنے کی دعوت دے رہے تھے، جب میں نے ان سے اس بے وقت افطاری بیچنے کی وجہ دریافت کی (مدینہ منورہ میں اذان مغرب کے بعد اور نماز سے پہلے تمام نمازی اجتماعی طور پر پیٹ بھر کر مسجد نبوی میں افطار کر لیتے ہیں) تو خوانچہ فروش غصہ کے لہجے میں کہنے لگے کہ "مدینہ منورہ کے کانے (یک چشم) قاضی نے کل امر کیا ہے، کہ کوئی روزہ دار افطاری میں پیاز لہسن وغیرہ سے بنی ہوئی چیزیں مسجد نبوی کے اندر نہ لائے۔ اب اس کے نتیجہ میں مسجد کے تمام دروازوں پر پولیس متعین ہے اور ہر داخل ہونے والے کی افطاری چیک کر رہی ہے، تاکہ کوئی قاضی کے امر کی خلاف ورزی نہ کر سکے"۔

یہ سن کر میں نے اپنے ساتھی الحاج شہزادہ صاحب سے کہا کہ "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کا یہی مطلب ہے، کہ کسی کو سر تابی کی جرأت نہ ہو۔ ہم تو صرف منت سماجت ہی سے اوامر اور نواہی پر عمل کراتے ہیں۔ اور منبر پر بیٹھ کر اوامر کے فائدے گنواتے ہیں اور منکرات پر صرف بددعا کی وعیدیں سناتے ہیں، جبھی تو ہماری بات پر کوئی کان نہیں دھرتا۔

غرض یہ کہ مسلمان کی بعثت اور اخراج کے اساسی اور بنیادی مقاصد اور مصالح میں جو چیز شامل ہے، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے جس کے لئے طاقت اور سلطنت لازم ہے۔

؎ تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

باب دہم

اسلامی حکومت کی تعریف اور مقصد

اسلامی یا شرعی حکومت، خلافت یا امامت اسلامی اصطلاح میں عبارت ہے "اللہ تعالیٰ کی جانب سے نیابتی" اور "خلیفی" حکومت سے۔

چنانچہ علامہ ابوالحسن ماوردی رحمہ اللہ اپنی مستند کتاب احکام السلطانی میں لکھتے ہیں۔

الامامة موضوعة لخلافت النبوة فی حراسة الدین وسیاسة الدنیا۔ (الاحکام السلطانیہ وکذافی مقدمۃ ابن خلدونؒ)

"اسلامی حکومت کی اساس اور بنیاد حضور علیہ السلام کی حکومت کی نیابت اور نقل ہے اور اس کی اولین ذمہ داری دین اسلام اور اسلامی سیاست کی حفاظت ہے"۔

(احکام السلطانی مقدمہ ابن خلدونؒ)

اسی طرح علامہ کمال بن ابی شریف "المسامرہ فی شرح المسایرہ" لعلامہ کمال ابن الھمام میں (امامت) اسلامی حکومت کی تعریف کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں۔

الامامة خلافة الرسول فی اقامة الدین وحوزة الملة الخ۔ (المسامرۃ صفحہ ۲۶۵)

"امامت یعنی اسلامی حکومت حضور علیہ السلام کی خلافت (نیابت) ہے۔ واسطے اقامت دین اور حفاظت ملت کے"۔

علامہ سعد الدین تفتازانیؒ اپنی مایۂ ناز کتاب "شرح المقاصد" میں اسلامی ریاست کی تعریف کے متعلق لکھتے ہیں۔

والامامة ریاسة عامة فی امر الدین والدنیا خلافة عن النبی علیه الصلوٰة

والسلام۔ (شرح المقاصد جلد ۲، صفحہ ۲۷۲)

"امامت وہ اسلامی حکومت عامہ ہے، جو حضور علیہ السلام سے خلافت اور نیابت کی حیثیت پر ہو اور امور دین و دنیا کے تحفظ کے لئے ہو"۔

فقہ حنفی کے مشہور شارح علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ اپنی مشہور کتاب "ردالمحتار" میں اسلامی حکومت کی یوں تعریف کرتے ہیں۔

ریاسۃ عامۃ فی الدین والدنیا خلافۃ عن النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام

(شامی جلد ۱، صفحہ ۵۰۴ باب الامامۃ)

"اسلامی ریاست عامہ وہ ہے، جو حضور علیہ السلام کی حکومت کی نیابت کی حیثیت سے ہو واسطے نفاذ و تحفظ دین اور دنیا کے"۔

امام لغۃ القرآن علامہ راغب خلافت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں۔

والخلافۃ النیابۃ عن الغیر اما لغیبۃ المنوب عنہ واما تشریف المستخلف وعلی ھذا الوجہ الاخیر استخلف اللہ اولیائہ فی الارض۔ (المفردات صفحہ ۱۵۵)

خلافت کسی دوسرے کی نیابت، قائم مقام ہونا ہے یا تو منوب عنہ (جس کی نیابت کی جاتی ہے) کی غیر موجودگی کے سبب سے یا ان کی موت کے سبب یا ان کے عاجز ہونے کے باعث یا بغیر کسی ضرورت کے محض نیابت کے اعزاز کے لئے اسی آخری وجہ کی بنا پر اللہ نے مومنین کو نائب بنایا۔

پس ثابت ہوا کہ امامت یعنی اسلامی حکومت کے بنیادی ارکان تین ہیں، جنہیں مقاصد ثلاثہ کا نام دیا جاتا ہے۔

اسلامی حکومت کے مقاصد ثلاثہ

اسلامی حکومت یا امامت کبریٰ کی تعریف، غرض و مقصد کے ضمن میں ثابت ہوا کہ اسلامی حکومت نام ہی تین مقاصد کا ہے۔

المقصد الاول

مومنین اور مسلمانوں کی حکومت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حکومت کی نقل ہوگی جو کہ اصل کے مطابق ہو۔ علماء اسلام نے اس بارے میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں "خلافۃ عن النبی علیہ السلام" ان کا حقیقی مفہوم اور مطلب بھی یہی ہے۔

اگرچہ "اصل" یعنی حضور علیہ السلام کی حکومت اور "خلافت" یعنی اس کی نقل کے درمیان تطابق اور یکسانیت میں اعلیٰ، ادنیٰ اور اوسط کے درجات سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن بنیادی امور میں مطابقت لازمی ہوگی ورنہ یہ حکومت حضور علیہ السلام کی نیابتی حکومت یا اسلامی حکومت نہ ہوگی بلکہ جعلی اور طاغوتی حکومت ہوگی۔

المقصد الثانی

خلافت اور اسلامی حکومت کا دوسرا فریضہ یہ ہوگا کہ قرآن و سنت سے ثابت شدہ عقائد، احکامات، اوامر اور مناہی اور حلال و حرام جمہور صحابہ کے تعامل اور تشریح کی روشنی میں نافذ کرنے اور تحفظ دینے کے لئے عملی اقدامات کرے۔

المقصد الثالث

تیسرا فریضہ یہ ہوگا کہ مسلمان امت کے دنیاوی امور، سیاسی نظم وضبط، ملکی اور

دفاعی استحکام جدید تقاضوں کے مطابق دیانتداری، عدل و انصاف اور امانتداری پر قائم کریں اور اسلامی حکومت کے متعلق علماء اسلام کی تحقیقات کا نچوڑ تقریباً یہی ہے۔

چنانچہ علامہ تفتازانیؒ اس بارے میں یوں لکھتے ہیں۔

وقد ذکر فی کتبنا الفقه انه لا بد للامة من امام یحیی الدین ویقیم السنة وینتصف للمظلومین ویستوفی الحقوق ویضعها مواضعها الخ

(شرح المقاصد جلد ۲، صفحہ ۲۷۱)

"تحقیق فقہاء امت نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ امت مسلمہ کے لئے ایسا حکمران ضروری ہے کہ وہ دین اسلام کی حفاظت کرے اور حضور علیہ السلام کی حکمرانی کا طریقہ قائم رکھے اور مظلوموں کے ساتھ انصاف اور حقدار کو حق پہنچانے کی ذمہ داری نبھائے"۔

علامہ کمال الدین ابن الھمام (المسامرہ) میں اور اس کی شرح (المسایرہ) میں یوں رقمطراز ہیں۔

لان المقصود من نصب الامام بالذات اقامة امر الدین ای جعله قائم الشعار علی الوجه المامور به من اخلاص الطاعات واحیاء السنن واماتة البدع لیتوفر العباد علی طاعة المولی سبحانه. (المسامرہ صفحہ ۲۷۷)

"دین اسلام میں حکومت اور حکمرانی قائم کرنے کا اصل مقصد، دین اسلام کو قائم اور استوار کرنا ہے یعنی کہ اسلامی شعائر اور قوانین اصلی شکل میں استوار ہوں عملی طور پر مخلصانہ انداز میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی جارہی ہو، اور حضور علیہ السلام کی حکمرانی کے طور طریقوں کا احیاء ہو اور غیر اسلامی نظریات، قوانین، طرز حکومت اور رسومات کی بیخ کنی کرے تاکہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کی بندگی عمل میں آئے"۔

اہل سنت والجماعت کے مسلمہ عقائد کے مشہور مؤلف علامہ عمر النسفیؒ اپنی مشہور کتاب "العقائد النسفی" میں یوں لکھتے ہیں۔

والمسلمون لا بدلهم من امام يقوم بتنفيذ احكامهم واقامة حدودهم وسد ثغورهم وتجهيز جيوشهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبة والمتلصصة وقطاع الطريق واقامة المجمع والاعياد وقطع المنازعات الواقعة بين العباد وقبول الشهادات القائمة علی لحقوق وتزويج الصغار والصغائر الذين لا اولياء لهم وقسمة الغنائم. (شرح العقائد صفحہ ۱۱۰)

"مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایسا حکمران ڈھونڈ لائیں جو اسلامی احکامات اور شرعی حدود عملاً نافذ کرے اور ان کی اندرونی اور بیرونی کمزوریوں کا مداوا کرے، اور ان کی عسکری قوت کو مستحکم کرے اور ان کے بیت المال (خزانہ) کو خود کفیل بنادے اور سرکش، چور، ڈاکا مار قوتوں کو کچل ڈالے اور اجتماعی عبادات کو جلا بخشے اور خصومات و تنازعات کے جلد تصفیہ کے لئے مفت اور آزاد عدلیہ قائم کرے، اور اجتماعی و انفرادی حقوق کا تحفظ، بے یار و مددگار لڑکوں اور لڑکیوں کی خانہ آبادی کو یقینی بنائے اور جہاد اور اموال غنیمت کی تقسیم کو منظم کرے"۔

ان حوالوں سے ضمناً مزید دو باتیں ثابت ہوئیں۔

اول : یہ کہ جہاں کہیں مسلمانوں کی حکومتوں کی اساس اور قیام، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے نیابتانہ ہو اور نہ ملکی اور حکومتی قوانین کا ماخذ قرآن و سنت ہو، بلکہ قوانین کا سرچشمہ عوامی خواہشات یا ان کے منتخب پارلیمنٹ کی اکثریت کی خواہشات کے تحت "ہاں اور نہیں" ہو ایسی حکومت کو اسلامی حکومت کہنا سیاہ کو سفید کا نام دینے کے مترادف ہو گا۔

دوم : یہ کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ ایسے حکمران بر سر اقتدار لائیں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نیابتی حکمرانی کی کسوٹی اور معیار پر پورا اتریں اور کما حقہ، اس کی اہلیت اور استعداد رکھتے ہوں۔

مسلمانوں پر فرض ہے کہ اسلامی حکومت قائم کریں

اسلامی تعلیمات کی رو سے مسلمانی اور نیابتی حکمرانی نہ صرف لازم وملزوم ہیں، بلکہ مسلمان کا وجود اور بعثت ہی نیابتاً حکمرانی کے لئے ہوا ہے۔

لہٰذا مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اہم ذمہ داری لازم کر دی گئی ہے کہ وہ اسلامی حکومت قائم کریں اس کو چلانے کے لئے ایسے حکمران منتخب کریں جو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نمائندگی اور نیابتاً حکمرانی کے لئے نسبتاً موزوں ترین ہوں۔ اس انتخاب کے بعد اگر خدانخواستہ وہ حکمران خیانت کریں۔ تو اس کا وبال اس پر ہوگا منتخب کرنے والے اس سے بری الذمہ ہونگے۔ اور اگر حکمرانوں کے انتخاب میں مسلمانوں نے حضور علیہ السلام کی نیابتی حکمرانی کو معیار اور کسوٹی نہ بنایا بلکہ قومیت، پارٹی بازی، خود غرضی، اور امید وبیم کو انتخاب کا معیار بنایا تو اس انتخاب پر بھی وہ گناہگار ہونگے اور اس کے بعد حکمرانوں کے جملہ مظالم، خیانت اور بدکرداریوں میں وہ مسلمان برابر کے شریک ہونگے۔

چنانچہ علامہ کمال ابن الھمام اپنی کتاب "المسامرہ" میں اور اس کے شارحین علامہ قاسم بن قطلوبغا الحنفی اور علامہ کمال ابن ابی شریف یوں رقمطراز ہیں۔

(ونصب الامام) بعد انقراض زمن النبوة (واجب) علی الامة عندنا مطلقا (سمعا) ای واجب من جهة السمع "قال قطلوبغا" قلت هذا قول جمهور اهل السنة الخ. (المسامرہ صفحہ ۲۶۵)

"حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد امت پر اسلامی اور نیابتی حکمرانی کا منتخب کرنا ازروئے شریعت لازم اور واجب ہے، علامہ قطلوبغا فرماتے ہیں کہ اس لزوم اور وجوب پر جمہور اہل سنت والجماعت متفق ہیں"۔

نیز علامہ تفتازانیؒ نے شرح المقاصد اور علامہ عمر النسفیؒ نے العقائد النسفی میں اسلامی

حکمران کا تقرر امت پر لازم اور واجب ٹھہرایا ہے۔ (المسامرہ صفحہ ۲۷۹، ۲۸۰)

اس فرضیت اور لزوم کی پہلی دلیل صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کا وہ عملی اجماع ہے، جس کا مظاہرہ انہوں نے حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد کیا۔ حضور علیہ السلام کی وفات صحابہ کرامؓ کیلئے اگرچہ بہت بڑا المیہ تھا مگر انہوں نے آپکی تجہیز و تدفین سے بھی جن فرائض کو مقدم سمجھا، وہ دو تھے۔

پہلا یہ کہ مسلمانوں کے لئے حضور علیہ السلام کی جگہ "خلیفہ" یعنی نیابتی حکمران مقرر کرنا وقت کی اہم ضرورت سمجھا۔

دوسرا یہ کہ حضور ﷺ کی نیابت اور نمائندگی کے لئے جو معیار اور کسوٹی ہے، یہ خلیفہ اور حکمران دوسروں کی نسبت اس پر پورا اترتا ہو۔

ان دونوں باتوں کے بارے میں نہ تو اس وقت صحابہ کرام اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مابین اختلاف تھا اور نہ ہی بعد کے آنے والوں میں پیدا ہوا، البتہ بعد میں روافض نے جو اختلاف کیا وہ بھی اہلبیت کے مسئلے پر تھا کہ ان کے زعم فاسد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل تھے، اس لئے حضور ﷺ کی جانشینی کے لئے انہیں لائق گردانتے تھے۔ نفس خلیفہ کے تقرر میں انہیں بھی کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ وہ بھی خلیفہ کے تقرر کو ضروری سمجھتے تھے۔

اسلامی حکمران مقرر کرنے کی فرضیت اور لزوم کی دوسری دلیل یہ ہے کہ دین اسلام کے بہت سے فرائض اور واجبات مثلاً حدود، قصاص، جہاد اور سرحدات کا تحفظ وغیرہ کا نفاذ چونکہ امام اور خلیفہ کے وجود پر موقوف ہے، کیونکہ خلیفہ کے بغیر انکا نفاذ ناممکن ہے لہٰذا ان فرائض کی طرح خلیفہ اور اسلامی حکمران کا تقرر بھی مسلمانوں پر فرض اور ضروری ہے۔

چنانچہ قاعدہ کلیہ ہے کہ۔

وما لا يتم الواجب المطلق الا به وكان مقدورا فهو واجب. (شرح المقاصد

جلد ۲، صفحہ ۲۷۳)

"جس چیز کے بغیر واجب کا اہتمام ناممکن ہو، تو اس واجب کی طرح اس چیز (موقوف علیہ) کا وجود بھی واجب ہو جاتا ہے"۔

اور امام ابوالحسن ماوردی الشافعی اور قاضی ابویعلی حنبلی مسلمان حکمران کے تقرر کے بارے میں فرماتے ہیں۔

وعقد الامامة لمن يقوم بها فى الامة واجب بالاجماع.

(الاحکام السلطانیہ للماوردی والاحکام السلطانیہ لابی یعلی)

"حکومت کے لئے ایسا حکمران مقرر کرنا جو اسلامی حکمرانی کا اہل ہو مسلمانوں پر بالاجماع واجب ہے"۔

اسی طرح امام عبدالقادر البغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

فقال جمهور اصحابنا من المتكلمين والفقهاء مع الشيعة والخوارج واكثر المعتزلة بوجوب الامامة وانها فرض وواجب.

(اصول الدین جامعہ اشرفیہ لاہور صفحہ ۲۷۱)

"اہل سنت کے جمہور علماء عقائد اور علماء فقہ اور علماء شیعہ اور علماء خوارج اور اکثر علماء معتزلہ نے اسلامی حکومت قائم کرنا مسلمانوں پر واجب اور فرض قرار دیا ہے"۔

اور علامہ ابن حزم نے اسلامی حکمران مقرر کرنے کی ذمہ داری مسلمانوں پر لازم ہونے کیلئے دلیل کے طور پر اہل سنت، مرجئہ، شیعوں اور خوارج کے علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔

(الفصل بین الملل والنحل لابن حزم جلد ۴، صفحہ ۸۷)

امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ اسلامی حکمران کے بغیر دین عملاً قائم نہیں ہو سکتا۔

(ان ولاية امر الناس من اعظم واجبات الدين بل لا قيام للدين الا بها)

(السیاسۃ الشرعیۃ لابن التیمیہ صفحہ ۱۶۱)

امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"مسلمان حکمران کی نسبت عالم کے ساتھ ایسی ہے، جیسی دل کی نسبت جسم کے ساتھ جب دل درست (صالح) ہے، تو بدن درست (صالح) ہے، اگر دل فاسد ہے تو بدن فاسد ہے صلاح بادشاہ صلاح عالم ہے اور فساد بادشاہ فساد عالم ہے"۔ (ترجمہ از فارسی)

(مکتوبات دفتر اول حصہ دوم مکتوب صفحہ ۴۷)

امام ربانی نے کیا عجیب مثال دیکر بات سمجھائی ہے، یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے اسلامی حکمرانوں کے لئے کڑی شرائط لگادی ہیں، جن میں سے اولین شرط یہ ہے کہ وہ حضور علیہ السلام کی حکمرانی کی نیابت اور نمائندگی کی بالفعل یعنی عملاً اہلیت رکھتے ہوں۔

اسلامی حکمرانی یا امامت، فرع ہے نبوت کی

علامہ قاسم بن قطلوبغا نے "المسایرہ صفحہ ۲۰۶ پر تصریح کی ہے کہ "امارت" اور "سلطنت" فرع ہے نبوت کی۔

یوں سمجھ لیجئے کہ "نبی" کی دو جہتیں اور حیثیتیں ہیں، یعنی نبی اور پیغمبر کا ایک تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے جہاں سے وحی جلی اور خفی کی صورت میں ہدایات، احکامات، "امر" اور "نہی" نازل ہوتے ہیں اور "نبی" انہیں محفوظ کرتا ہے۔ اس اعتبار سے اصالتاً اور حقیقتاً حاکم یعنی "امر" اور "نہی" کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور "نبی" و پیغمبر اس کا نائب اور خلیفہ ہے۔ اس حیثیت سے تو نبی کا کوئی امتی قائم مقام اور خلیفہ نہیں بن سکتا۔

نبی کا دوسرا تعلق امت یعنی مومنین اور مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ احکامات جوں کے توں اپنے آپ اور مسلمانوں پر عملاً نافذ کرتا ہے، اور غیر مسلموں کو اس کی دعوت دیتا ہے، اس حیثیت سے نبی پیغام رساں اور داعی ہے۔ اور حکمران حاکم اور امام بھی ہے، بلکہ علامہ کمال ابن ابی شریف تصریح کرتے ہیں کہ

نبی پوری امت کا سیاست دان اور سیاست کرنے والا ہوتا ہے۔ (المسامرہ صفحہ ۲۰۳)

اس اعتبار سے حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد مسلمانوں کا مقرر کردہ حکمران نبی کا نائب، خلیفہ اور قائم مقام ہوتا ہے، یعنی دین اسلام کے جو احکامات نبی نے اپنے آپ اور امت پر عملاً یا اعتقاداً نافذ کئے تھے اور وہ کسی کی خصوصیت نہ تھی وہی کچھ بعینہ یہ اسلامی حکمران بھی اپنے آپ اور رعیت پر عملاً نافذ کرے گا، اور غیر مسلموں کو ان ہدایات اور احکامات اسلامی کی دعوت بھی دے گا اور قیامت تک جو بھی جدید مسائل پیش آئیں گے ان کو اسلام کے اصولوں یعنی دلائل اربعہ (قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس مجتہدین) کی روشنی میں طے کرتا رہے گا، چونکہ اس دوسرے اعتبار سے نبی منوب عنہ (جس کی نیابت اور نمائندگی کی جاتی ہے) ہوتا ہے اور اسلامی حکمران اس کا نائب اور خلیفہ (نیابت کرنے والا) ہوتا ہے، لہٰذا اس تعلق کی بنا پر علماء اسلام فقہاء اور متکلمین نے نبی اور اسلامی حکمران کے لئے بیشتر شرائط ایک جیسی ذکر کی ہیں۔

اسلام میں حکمرانی اور امامت کے لئے بنیادی شرط

اسلامی حکمرانی چونکہ نیابتی امانت ہے، اس لئے نبی کی اطاعت در حقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور مسلمان حاکم اور امیر کی اطاعت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے اور یہ اس لئے کہ نبی اللہ تعالیٰ سے احکامات اور حکمرانی اخذ کرتا ہے، اور مسلمان حاکم اور امیر، رسول اللہ ﷺ سے احکامات نقل کرتا ہے۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صحیح حدیث منقول ہے۔

عن ابی ہریرۃؓ قال قال رسول اللہ ﷺ من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن اطاع الامیر فقد اطاعنی ومن عصی الامیر فقد عصانی۔ (بخاری کتاب الاحکام، صفحہ ۱۰۵۷ وکذافی مسلم باب اطاعت الامیر)

"ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا! جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی"۔

اور اگر امام اور حاکم وقت نے نیابتی حکمرانی میں خیانت کی یعنی اسلامی احکامات کے برخلاف احکامات اور قوانین جاری کئے تو وہ قوانین اور احکامات مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول اور مردود ہوں گے۔

چنانچہ اس بارے میں ارشاد نبوی ہے کہ:

عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قال قال النبی ﷺ السمع والطاعۃ علی المرا المسلم فیما احب وکرہ مالم یومر بمعصیۃ فاذ امر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ۔ (بخاری جلد ۲، الاحکام صفحہ ۱۰۵۷، مسلم باب اذالامر بمعصیۃ الخ)

"عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مسلمان

پر اپنے حاکم کی اطاعت اور حکم ماننا لازم ہے، خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند تاوقتیکہ اسے اسلام کے خلاف حکم نہ دیا جائے اور جب گناہ کا حکم دیا جائے تو وہ نہ مانے"۔

اس قسم کی احادیث بکثرت صحاح ستہ میں موجود ہیں، میں نے اختصار کی غرض سے صرف مذکورہ دو حدیثوں پر اکتفاء کیا چونکہ نبی معصوم ہوتا ہے، اس لئے شرعاً یہ ناممکن ہے کہ کوئی پیغمبر اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف حکم کرے ورنہ پیغمبر کے بھی کسی ایسے حکم کی اطاعت ہرگز لازم نہ ہوتی۔ خلاصہ یہ کہ نبوت اور امامت کی حکمرانی اور اس کے اختیارات اور دائرہ کار ایک جیسے ہیں۔

دین اسلام میں ملک اور حکومت کے سربراہ کیلئے شرائط

علماء اور فقہاء دین نے شرعی دلائل کی روشنی میں امام یعنی اسلامی حکمران کے اوصاف اور شرائط بیان فرمائی ہیں کسی نے اجمال اور اختصار کے ساتھ اور کسی نے تفصیل کے ساتھ مگر علامہ قرطبیؒ نے بہ نسبت دوسرے علماء اور اسلامی اسکالروں کے یہ شرائط تفصیل سے بیان کی ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ مسلمانوں کے سربراہ کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان ہو

یا ایها الذین آمنوا اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم ○ (پارہ:۵، س۴، آیت:۵۹)

"اے ایمان والو! اللہ کی فرمانبرداری کرو اور رسول کی کرو اور ان حاکموں کی جو تم میں سے ہوں"۔

تشریح : "منکم" کی قید کا مطلب یہ کہ وہ تم جیسا مسلمان ہو یعنی سربراہ کی فرمانبرداری کے لئے اس کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا بطانۃ من دونکم۝

(پارہ: ۴، س ۳، آیت: ۱۱۸)

”اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی کو (غیر مسلم کو) بھیدی نہ بناؤ“۔

تشریح: چونکہ ریاست کا سربراہ پوری ملت کے راز جاننے والا (بھیدی) ہوتا ہے اس لئے اس آیت سے غیر مسلم حکمران کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا۝

(پارہ: ۵، س ۴، آیت: ۱۴۱)

”اور اللہ کافروں کو مومنوں پر ہرگز برتری اور تسلط نہیں دے گا“۔

اسی آیت سے فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ ”کافر کی گواہی مسلمان کے خلاف جائز نہیں ہے“ جب قرآن کی اس آیت سے کافر کی مسلمان کے خلاف گواہی جیسے ادنیٰ اختیار کی نفی ہوتی ہے تو سلطنت جیسے اعلیٰ اختیار کی نفی پر یہ آیت بطریق اولیٰ دلالت کرتی ہے۔

واضح رہے کہ ”نبوت“ کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ کفر سے معصوم ہو، نہ صرف نبوت کے دوران بلکہ نبوت سے پہلے بھی نبی کفر سے معصوم ہوتا ہے، حتیٰ کہ بچپن میں بھی، والدین کے کفر کے باوجود نبی پر قطعاً کفر کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ نبی مومن اور عارف باللہ ہوتا ہے۔ قاسم ابن قطلوبغا نے اس پر جمہور کا اتفاق نقل کیا ہے۔ (المسایرہ صفحہ ۲۰۴)

چونکہ مسلمان ریاست کا سربراہ حکومت چلانے میں نبی کا نائب ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے کم از کم اس عہدہ کے دوران مومن اور مسلمان ہونا شرط ہے، جس کے لئے ایک اہم دلیل یہی ہے کہ امارت، نبوت کی فرع ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے سربراہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ مرد ہو

اسلام کے جمہور علماء اور فقہاء نے نبوت کے لئے مرد ہونا لازم ٹھہرایا ہے، اور اسی

پر ان کا اجماع ہے جس کی اساس یہ آیت کریمہ ہے کہ:

وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیھم○

(پارہ: ۱۳، یوسف، آیت: ۱۰۹)

"اور میں نے تجھ سے پہلے کسی قوم کی طرف پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا مگر مرد"۔

ویسے بھی "امامت کبریٰ" (حکومت کے سربراہ) اور امامت صغریٰ (نماز کی امامت) کے لئے مرد ہونا شرط قرار دیا ہے، اور جو دلائل نبی کے مرد ہونے کے لئے پیش کئے ہیں زیادہ تر وہی دلائل ملک اور حکومت کے صدر اور وزیر اعظم کے مرد ہونے کے لئے بھی پیش کئے ہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

الرجال قوامون علی النساء○

(پارہ: ۵، س ۴، آیت: ۳۴)

"مرد عورتوں پر حاکم اور مسلط ہیں"۔

نیز حضور علیہ السلام نے فرمایا:

"وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی، جس نے عورت کو سربراہ بنایا"۔ (بخاری شریف اور مسلم شریف)

اور فرمایا "جب تمہارے دنیاوی امور عورتوں کے سپرد ہو جائیں تو زمین کا باطن اس کے ظاہر سے بہتر ہے" یعنی زندگی سے موت بہتر ہے۔

قال علی رضی اللہ عنہ لو کانت الخلافۃ تصلح لأمرأۃٍ لکانت عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنھا تستحق الخلافۃ. (شرح المسایرہ للعلامہ قطلوبغا صفحہ ۲۰۶)

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا اگر عورت کا سربراہ بننا جائز ہوتا تو حضور علیہ السلام کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا خلافت کی مستحق ہوتیں"۔

نیز صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عملی اجماع سے ثابت ہے کہ ریاست کے سربراہ کے لئے مرد ہونا شرط ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو کم از کم کوئی ایک صحابیؓ تو ام المومنین حضرت عائشہ یا حضرت فاطمۃ الزہرہ رضی اللہ عنہما جیسی عظیم ترین خواتین کا نام خلافت کے لئے بطور تجویز پیش کرتا بلکہ خیر القرون اور اس کے بعد اسلامی تاریخ میں رضاکارانہ انداز میں بھی ایسی کسی تجویز کا ثبوت تک نہیں چہ جائیکہ سربراہ مقرر کرنا۔

علامہ ابن الھمام المسایرہ میں اور اس کے شارح المسامرہ میں نبی کے لئے مرد ہونے کی شرط کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ:

(لان اشتراط الذکورة لکون امر الرسالة مبنیا علی الاشتھار والاعلان والتردد الی المجامع للدعوة) ای مواضع اجتماع الناس لیدعوھم الی الایمان بما جاء به والعمل بمقتضاہ (ومبنی حالھن علی التستر والقرار) لا التردد والاشتھار. (المسامرہ صفحہ ۲۰۷)

"نبی کے لئے مرد ہونا اس لئے شرط ہے کہ رسالت کا تقاضا ہے کہ پیغمبر اعلانیہ، برسر عام مجلسوں اور اجتماعات میں دعوت و تبلیغ کے لئے باربار آتا جاتا رہتا ہے اور لوگوں کو ایمان اور اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے، جبکہ عورتوں کے حال کا تقاضا ہے کہ وہ حیاء اور پردے کے ماحول میں رہیں اور عام اجتماعات اور شہرت و نمود کے مواقع سے دور رہیں"۔

علماء اسلام اور مذہبی اسکالروں نے سربراہ ریاست کے مرد ہونے کی شرط کے لئے بعینہ انہی مذکورہ وجوہات کو اساس بنایا ہے۔ اور پھر خاص کر آج کل کے دور حکمرانی میں جلسوں سے خطاب، جلوسوں کی قیادت اور غیر مسلم حکمرانوں کے ساتھ اندرون اور بیرون ملک گھنٹوں تنہائی، خلوت اور رازداری میں ملاقاتیں کرنا ایک فیشن بن چکا ہے، ایسے حالات میں عورت کو سربراہ مملکت بنانے کی قباحت اسلامی اصول اور اخلاق وحمیت کی رو سے اظہر من الشمس ہے۔

۳۔ مسلمانوں کے سربراہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ جید عالم دین ہو

خلیفہ اور اسلامی حکمران چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نائب اور قائم مقام ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ اس نیابت کو نبھانے کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لائے ہوئے دین اسلام کا نہ صرف علم رکھتا ہو، بلکہ اس کے اندر اتنی علمی استعداد ہو کہ جدید دور کے تمام مسائل کو قرآن وسنت کے مطابق حل کر سکتا ہو، اور اگر اس میں ذاتی طور پر اتنی استعداد نہ ہو تو اس پر لازم ہو گا کہ ایسے مسائل کے بارے میں جید علماء اسلام کا ایک بورڈ تشکیل دے تاکہ وہ ایسے مسائل میں ان کی ہدایات سے رہنمائی حاصل کرتا رہے۔

چونکہ مسلمان سربراہ مسلمانوں کے صرف دین کا محافظ نہیں بلکہ ان کے دنیاوی معاملات اور ضروریات کا بھی ذمہ دار ہے، اس لئے اس شعبہ میں بھی سربراہ کے لئے ایسے ہی معیار اور طریق کار کے علوم کی ضرورت ہے جیسے کہ دینی علوم کے متعلق ذکر ہوا۔ چنانچہ ابتدائے آفرینش کے وقت زمین کی خلافت اور حکمرانی کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کا انتخاب بھی انہی علوم کے سبب ہوا تھا۔ اس انتخاب کے لئے محض تقویٰ اور عبادت کو معیار نہیں بنایا گیا تھا، ورنہ فرشتے اس انتخاب میں نہ ہارتے۔ اور نہ ہی اس انتخاب کا معیار مروجہ جمہوریت کی سیاست دانی تھا "جو کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے انکار، خود ستائش، نسل پرستی، مکروفریب، مادہ پرستی اور خود غرضی کا مجموعہ ہے" اگر ایسا ہوتا تو اس انتخاب میں جیتنے والا امیدوار ابلیس ہی ہوتا کیونکہ مذکورہ تمام اوصاف ابلیس کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھے۔

بلکہ خلافت ارض کے لئے انتخاب کا معیار، معرفت الٰہی، اللہ تعالیٰ کی اطاعت، زمین کی تعمیر وترقی اور اصلاح کے علوم (واستعمر کم فیھا) اور کائنات کی تسخیر کے علوم (وسخر لکم ما فی الارض جمیعًا) تھے جس پر حضرت آدم علیہ السلام پورا اتر کر خلیفۃ الارض کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔

خلاصہ یہ کہ خلافت ارض یعنی زمین پر حکمرانی کا اسلامی معیار علوم الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں، جس کی قرآن کریم یوں تصریح کرتا ہے۔

ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم ○ (پارہ: ۵، س ۴، آیت: ۸۳)

"اور اگر وہ اسے (پیش آمدہ مسائل کو) رسول علیہ السلام اور مسلمان امراء کے سامنے پیش کرتے تو اسے حل کرتے ان میں سے وہ حضرات جو مسائل کے استنباط کی استعداد رکھتے ہیں"۔

چونکہ اولوالامر میں علماء اور امراء المسلمین دونوں داخل ہیں، لہٰذا اس آیت کریمہ سے صاف اشارہ ملتا ہے کہ مسلمانوں کے حکمرانوں میں دینی اور دنیاوی مسائل کے حل کرنے کی ایسی اہلیت ہونی چاہیے جس کی روشنی میں وہ جدید پیش آمدہ مسائل حل کر سکیں۔

قال ان اللہ اصطفاہ علیکم وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم ○

(پارہ: ۲، س ۲، آیت: ۲۴۷)

"پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے اسے (بادشاہی کے لئے طالوت کو) تم پر ترجیح دی اور اس کو علم اور جسم میں زیادتی دی ہے (یہ گویا وجہ ترجیح ہے)"۔

دیکھیے یہاں حکمرانی کے استحقاق کے لئے قرآن کریم نے علم میں زیادتی اور جسمانی ساخت کی موزونیت کو وجہِ ترجیح قرار دیا۔

قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون انما یتذکر اولوا الالباب ○ (پارہ: ۲۳، س ۳۹، آیت: ۹)

"(اے پیغمبر ان سے) کہدو! کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں؟ تحقیق اس (عدم برابری) کو سمجھتے ہیں وہ لوگ جو عقل والے ہیں"۔

تشریح : آج پوری انسانیت اس پر متفق اور عمل پیرا ہے کہ ہر کام کو اس کام کے

ماہر کے حوالہ کیا جائے اس لئے اسلامی ریاست کے سربراہ کے لئے دین اور دنیا دونوں علوم میں دیدہ ور ہونا لازم ہے۔ اور آخرت کی لیڈری (امامت کبریٰ) کے مستحق تیری اولاد میں سے وہ لوگ نہیں ہیں جو ظالم ہیں۔

قولہ تعالیٰ: قال لا ینال عھدی الظالمین○

(پارہ: ۱، س ۲، آیت: ۱۲۴)

"فرمایا میرا یہ اقرار (معاہدہ امامت) ظالموں کے لئے نہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس بات کی واضح دلیل ہے، کہ ظالم (غیر عادل) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نیابتی حکمرانی (اسلامی حکمرانی) کا اہل نہیں۔

ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ھواہ وکان امرہ فرطا○

(پارہ: ۱۵، س ۱۸، آیت: ۲۸)

"اور اس شخص کی فرمانبرداری نہ کرو جو میری اطاعت سے غافل ہو، اور اپنی خواہشات کی اطاعت کرتا ہو اور اس کا کام حد سے تجاوز کرنا ہو"۔

ولا تطیعوا امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون○ (پارہ: ۱۹، س ۲۶، آیت: ۱۵۱)

"اور (شریعت کی) حدود سے تجاوز کرنے والوں کی فرمانبرداری نہ کرو یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے" (اللہ کی نافرمانی فساد، اللہ کی اطاعت اصلاح ہے)

ان اکرمکم عند اللہ اتقکم○

(پارہ: ۲۶، س ۴۹، آیت: ۱۳)

"اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہو"۔

جب ان آیات میں واضح احکامات ہیں کہ غلام، فاسق اور شریعت کی حدود سے تجاوز کرنے والوں کی فرمانبرداری جائز نہیں، اور وہ قابل عزت واحترام نہیں، تو پھر کیونکر ایسے شخص کو مسلمان ملت کی فرمانروائی کے عظیم منصب پر مقرر اور فائز کرنا جائز کہلا سکتا ہے؟

۴۔ حر۔ یعنی آزاد ہو غلام نہ ہو

۵۔ بالغ ہو بچہ نہ ہو

۶۔ عاقل ہو دماغی مریض نہ ہو

ظاہر بات ہے کہ از روئے عقل اور نقل ان لوگوں کا اپنے جان ومال پر تصرف اور اختیار نہیں چلتا وہ تو خود دوسروں کی سرپرستی میں ہوتے ہیں، تو ملت اسلامیہ کے محافظ اور نگہبان کیونکر ہو سکتے ہیں؟

۷۔ جسمانی لحاظ سے صحیح الاعضاء ہو

یعنی ناقص الاعضاء یا بیماریوں میں مبتلا نہ ہو، جس کے نتیجہ میں اس کی جسمانی کارکردگی متاثر ہو یا اس سے عموماً نفرت کی جاتی ہو۔

۸۔ شریف النسب ہو یعنی نسب کے لحاظ سے معیوب نہ ہو

یعنی ولد الزنا وغیرہ، نسبی عیوب اور کمزوریوں سے برتر ہو۔

۹۔ شجاع اور بہادر ہو بزدل اور ڈرپوک نہ ہو

اس لئے کہ ایسا شخص نتائج بھگتنے کے خوف سے سرکش اور باغی قوتوں کو کچلنے کے

جرأت مندانہ اقدامات سے ہچکچاتا ہے، جس کے نتیجے میں بدامنی، غنڈہ گردی اور ملکی سلامتی کو سنگین خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

امام المسلمین کے لئے قریشی ہونے کی شرط

مسلمانوں کی سربراہی کا منصب چونکہ عظیم ترین عہدہ اور نبوت کی نیابت ہے، اس لئے مذہبی اور دنیاوی دونوں پہلوؤں سے اس منصب کی عظمت اور اہمیت پر پوری امت متفق ہے، نیز اس پر بھی تقریباً اجماع ہے کہ اس منصب کے لئے موزوں ترین شخص کا انتخاب ضروری ہے جو کہ قوت ایمان، قوت علم و دانش، قوت عمل اور قوت بازو میں سب سے اعلیٰ ہو۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ان مجموعہ اوصاف کے حامل افراد مجموعی طور پر قریشی النسب تھے، ایمان اور اسلام لانے میں، قرآن فہمی، دین کے لئے سختیاں برداشت کرنے، قربانیاں دینے وفاداری اور صداقت میں ان کی سبقت مسلم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی پشت پر قریش جیسی ناقابل تسخیر اور عظیم قومی قوت بھی تھی، لہٰذا قوت بازو میں قریشی النسب فرد کی اہمیت قبائلی طرز معاشرہ میں نہ اس وقت کوئی نظر انداز کر سکتا تھا نہ آج کے ترقی یافتہ دور میں اِسے پس پشت ڈالا جا سکتا ہے۔

حضور علیہ السلام اپنا جانشین صراحتاً نامزد کرنے کے حق میں تو نہ تھے، لیکن آپ اس اہم اور یقینی طور پر پیش آنے والے مسئلے سے بے فکر بھی نہ تھے بلکہ عین ممکن ہے کہ نبوت کی بصیرت یا وحی کے ذریعہ حضور علیہ السلام کو اپنی وفات کے فوراً بعد پیش آنے والا واقعہ "السقیفہ" کا علم یا اندازہ ہوا ہو اس لئے آپ نے اپنے نائبین اور خلفاء کے اوصاف کے متعلق اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو انتشار سے بچانے کی خاطر اصولاً ایک ہدایت دی یا مستقبل کی خبر دی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

قوله عليه الصلوة والسلام الائمة من قريش الخ وقوله عليه السلام

الولاۃ من قریش الخ (شرح المقاصد جلد، صفحہ ۲۷۷)

"میرے بعد ائمہ (اسلامی حکمران) قریش میں سے ہونگے"۔ (حدیث)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے فوراً بعد آپ کے دفن سے پہلے جب سقیفہ بنی سعد کے مقام پر انصار مدینہ منورہ اور مہاجرین کے سرکردہ افراد کی شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا تاکہ حضور علیہ السلام کا جانشین (خلیفۃ المسلمین) مقرر کیا جائے، جس کے ابتدائی مرحلہ میں انصار اور مہاجرین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان اختلاف کی شکل نمودار ہوئی تو انصار کی طرف سے تجویز پیش ہوئی کہ دو امیر المسلمین مقرر کرلیں گے ایک انصار میں سے اور ایک مہاجرین میں سے اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کا مذکورہ فرمان نقل کیا کہ امراء قریش میں سے ہونگے جس پر سب خاموش ہو گئے اور مسئلہ طے ہو گیا

شرح المقاصد میں ہے:

لما قال الانصار یوم السقیفة منا امیر ومنکم امیر منعھم ابوبکرؓ بعدم کونھم من قریش ولم ینکرہ علیہ احد من الصحابة الخ (شرح المقاصد جلد ۲، صفحہ ۲۷۷)

ترجمہ: جب سقیفہ والے دن انصار نے کہا کہ ایک امیر ہم میں سے ہوگا اور ایک تم میں سے۔ تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس بات سے منع فرمایا کیونکہ وہ قریش میں سے نہیں تھے، اور اس بات پر صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے بھی انکار نہیں کیا۔

حضور علیہ السلام کی ہدایت (الائمة من قریش) نے امت کی کشتی کو نہایت خطرناک گرداب سے نکالنے میں کتنا اہم کردار ادا کیا۔

قریشی کی شرط کے متعلق اشکال اور اس کا حل

حضور علیہ السلام کے مذکورہ فرمان "الائمة من قریش" کو معمول بنانا خیر القرون

کے زمانہ میں سہل تھا اس لئے کہ امام المسلمین کے زیر فرمان رعیت، افراد، اور رقبہ، آبادی کے لحاظ سے محدود اور محصور تھا۔ مگر تا قیامت آنے والے زمانے کو ملحوظ رکھتے ہوئے قریشی کی شرط پر عمل پیرا ہونا آسان نہیں اس لئے ابتدا ہی سے اسلامی علوم کے ماہرین کا اس میں اختلاف رہا ہے۔

حضور علیہ السلام کے مذکورہ فرمان میں کئی مطالب اور مفاہم کی گنجائش ہے، مثلاً یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مذکورہ فرمان بحیثیت امر اور حکم ہے، یا بحیثیت اخبار عن المستقبل اور پیشین گوئی ہے کہ آئندہ خلفاء قریش میں سے ہوں گے پھر اگر امر اور حکم تسلیم کیا جائے تو کیا یہ امر اور حکم تعبدی ہے جس میں بلاعذر شرعی کے ردو بدل کی گنجائش نہیں یا یہ حکم معلول بالعلت ہے، یعنی حضور علیہ السلام نے اس لئے یہ حکم کیا تھا کہ اس زمانہ کے لحاظ سے خلافت کے لئے مطلوبہ جملہ شرائط بمعہ قوت نافذہ اور عمومی شوکت وغلبہ کے اگر کسی قبیلہ میں بدرجہ اتم واکمل موجود تھیں تو وہ قریش ہی میں تھیں۔

علامہ ابن خلدونؒ بھی اسی نظریئے کے موئید ہیں۔

اسی نظریئے کی تائید میں حسب ذیل دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں۔

مذکورہ "الائمة من قريش" کے ساتھ حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا ہے "ما اقاموا الدين" جب تک قریش اقامت دین کا فریضہ ادا کرتے رہیں، نیز فرمایا ہے "ما حكموا بالعدل" جب تک قریش عدل اسلامی کو قائم رکھیں، اسی طرح یہ بھی ایک مسلّم امر ہے کہ اسلام میں شرف اور برتری کا معیار نسب نہیں اگر ایسا ہوتا تو پھر قریشی کے بجائے ہاشمی اور سید ہونا قابل ترجیح ہوتے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے "مواہب الرحمٰن" کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ سے روایت ہے کہ قریشی ہونا خلافت کے لئے شرط نہیں ہے۔

تاہم فقہاء اور خاص کر احناف رحمہم اللہ کے نزدیک خلافت کے لئے قریشی ہونا اگر

شرط صحت نہیں تو شرط اولویت ضرور ہے، اس لئے کہ اسلام اور حضور ﷺ کے ساتھ قریش کو جو وابستگی رہی ہے، اس کا اثر اس پندرھویں صدی میں بھی دیگر اقوام کی نسبت یقینا قابل احترام ہونا چاہئے۔

ان کی مخمور نگاہوں کا اثر ہو یہ حمید
شیشۂ دل میرا ٹوٹے بھی تو پیمانہ بنے

باب یازدہم

عورت کی سربراہی کے مسئلے پر ایک تحقیقی مقالہ

دین جمہوریت میں عورت کا سربراہ مملکت بننا نہ صرف جائز ہے بلکہ یہ اس کا بنیادی حق سمجھا جاتا ہے اور جو مسلمان دین جمہوریت کو بہ دل و جان قبول کر چکے ہیں نیز وہ حضرات جو دین جمہوریت کے فروغ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، وہ اس طرح سے عورت کی سربراہی کے لئے دین اسلام سے سند جواز پیش کرنے کے لئے دور از کار تاویلات اور بے جا تاریخی واقعات سے استدلال پیش کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں، جس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

وہ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

مثلاً بعض نام نہاد عالموں کا دعویٰ ہے کہ حافظ ابن جریر طبریؒ جیسے عظیم علامہ اور مفسر عورت کی سربراہی کے جواز کے قائل تھے۔ یا ملکہ بلقیس کے واقعہ سے جواز پر استدلال کرتے ہیں، یا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے جنگ جمل کے واقعہ سے یا رضیہ سلطانہ کے واقعہ سے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ایک تحریر سے بھی دلیل پیش کرتے ہیں۔

اس لئے مناسب ہے کہ پہلے اس مسئلہ کو قرآن و سنت، تعامل صحابہ اور ۱۴سو سالہ تحقیقات امت مسلمہ کی روشنی میں دیکھا جائے اس کے بعد مجوزین کے مذکورہ دلائل کا تجزیہ کیا جائے کہ ان میں کتنی حقانیت ہے۔

ایک ضروری اور اہم تنبیہ :

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ دین جمہوریت میں سب کچھ جائز ہے، بشرطیکہ عوام کی اکثریت اسے جائز قرار دے خواہ ماں، بہن، بیٹی سے یا مرد کا مرد سے نکاح کا مسئلہ ہو لہٰذا دین

جمہوریت کی عینک اتار کر خالص اسلامی زاویہ نگاہ سے ذیل کے دلائل کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

قوله تعالی: الرجال قوامون علی النسآء بما فضل الله بعضهم علی بعض وبما انفقوا من اموالهم فالصالحات قانتات حافظات للغیب بما حفظ الله والتی تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن فی المضاجع واضربوهن فان اطعنکم فلا تبغوا علیهن سبیلا ○ (پارہ:۵، النساء، آیت:۳۴)

"مرد عورتوں پر قوام (نگران، سربراہ، حاکم) ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے نیز اس لئے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں پس صالح عورتیں وہ ہیں جو اطاعت گذار اور حکم بردار ہوتی ہیں اور مردوں کی غیر موجودگی میں اللہ تعالی کے حکم کے مطابق مردوں کے جملہ حقوق کی حفاظت کرتی ہیں اور جن عورتوں سے تمہیں نافرمانی کا اندیشہ ہو انہیں نصیحت کرو، ان سے ہم بستری چھوڑ دو، اور انہیں مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت فرمانبرداری کریں تو ان پر زیادتی نہ کرو"۔

تشریح: امام المفسرین علامہ آلوسیؒ مفتی اعظم بغداد اپنی مشہور تفسیر "روح المعانی" میں تحریر فرماتے ہیں (قوامون علی النسآء) "ای شانهم القیام علیهن قیام الولاة علی الرعیة بالامر والنهی" یعنی مرد عورتوں کے لئے نگہبان اور حکمران ہیں (قانتات) "مطیعات لله تعالی ولازواجهن" یعنی اللہ تعالی کی اطاعت کرتے ہوئے اپنے خاوندوں کی فرمانبرداری کرتی ہیں۔ (نشوزهن) "ای ترفعن عن مطاوعتکم وعصیانهن لکم" یعنی وہ عورتیں جو تمہاری اطاعت سے اپنے آپ کو بلند کر کے تمہاری نافرمانی کرتی ہیں۔

(المضاجع) "ای مواضع الاضطجاع والمراد اترکوھن منفردات فی مضاجعھن فلا تدخلونھن تحت اللحف ولا تباشروھن" یعنی انہیں بستروں میں اکیلی چھوڑ دیں اور ان کے ساتھ ہم بستری نہ کریں (فان اطعنکم) "ای وافقنکم وانقدن لما او جب اللہ تعالی علیھن من طاعتکم" یعنی اگر وہ عورتیں نافرمانی سے باز آکر تمہارے لئے منقاد اور فرمانبردار بنیں۔ (روح المعانی جز۵، صفحہ ۲۳تا۲۶)

قوام اور قانتات کے لفظ نے مرد اور عورت کے درجات اور مقام کو واضح کر دیا کہ مرد حکمران اور عورت محکوم ہے، اگر عورت اپنے مقام سے برتری اور سرکشی کرے تو خاوند تعزیری سزا دیا کرے تاوقتیکہ وہ مطیع و فرمان بردار بن جائے۔ نیز "مضاجع" کے لفظ نے واضح کر دیا کہ یہ سزا خاوند دے گا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام احکامات کے نفاذ کا حق خاوند کو حاصل ہے۔

منکر حدیث غلام احمد پرویز یا اس کے ہم مشرب مولوی عمر احمد عثمانی نے "فقہ القرآن جلد سوم" میں ان آیات کا مفہوم بیان کیا ہے کہ اس آیت میں سزا دینے، یا اطاعت کرنے سے مراد مسلمانوں کی سوسائٹی، یا حکومت وقت کی عدالت کی طرف سے سزا دینا اور عدالت کی اطاعت مراد ہے لیکن "مضاجع" کا لفظ بتاتا ہے کہ آیت مذکورہ کے لئے ایسا مفہوم متعین کرنا تفسیر قرآن نہیں بلکہ تحریف قرآن ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ آیات گھریلو اور خانگی امور کے لئے ہیں، اس لئے ملک اور حکومت کی سربراہی کے مسئلے میں ان آیات سے عورت کی سربراہی کے عدم جواز پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

اول تو یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ مذکورہ آیات میں مرد کی حاکمیت اور عورت کی محکومیت کے احکامات گھر کی چار دیواری کے اندر تک محدود ہیں، قرآن کریم کے الفاظ مطلق ہیں لہٰذا حکم بھی مطلق اور عام ہے۔ اگر ہم تسلیم کریں کہ یہ احکامات ایک گھر کے لئے

ہیں تو جب عورت صرف ایک گھر کی چار دیواری کے اندر حاکمیت اور سربراہی کے لئے نااہل ثابت ہوئی تو پورے ملک اور ملت کے لاتعداد گھروں کی سربراہی کے لئے تو بطریق اولی نااہل ٹھہری، لہٰذا اسی آیت کریمہ سے بطور دلالت النص ثابت ہوا کہ عورت ملک اور حکومت کے لئے از روئے دین اسلام اہل نہیں ہے۔

وللرجال علیھن درجة ○ (البقرہ، آیت: ۲۲۸)

"اور مردوں کو عورتوں پر فوقیت اور فضیلت ہے"۔

یہ فضیلت اور فوقیت شرعی احکامات، سائنس، طب، عقل، جسمانی ساخت اور مشاہدہ کی روسے روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

مرد اور عورت کا، شرعی احکامات میں فرق

۱۔ مرد پر نماز پنجگانہ باجماعت پڑھنا ضروری ہے عورت کے لئے نہیں ہے۔

۲۔ مرد پر نماز جمعہ و عیدین واجب ہیں عورت پر نہیں ہیں۔

۳۔ مرد پر جہاد بالسیف فرض ہے عورت پر نہیں۔

۴۔ مرد کے لئے تنہا حج پر جانا جائز ہے عورت کے لئے جائز نہیں ہے۔

۵۔ مرد کے لئے نماز باجماعت کی امامت جائز ہے عورت کے لئے جائز نہیں۔

۶۔ مرد حیض، نفاس، ماہواری، زچگی کی آلائشوں سے پاک ہے جبکہ عورت ان آلائشوں میں مبتلا ہو کر کئی شرعی احکامات کی بجا آوری سے قاصر رہتی ہے۔

۷۔ مرد منصب نبوت و رسالت پر فائز ہیں اور عورت اس منصب کی اہل نہیں ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیھم ○

(سورہ یوسف، آیت: ۱۰۹)

"اے پیغمبر ہم نے تجھ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں وہ سب کے سب مرد ہی تھے"۔

وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیهم فاسئلو اهل الذکر۞

(سورۃ النحل، آیت: ۴۳ و سورۃ الانبیاء آیت: ۷)

"اور ہم نے اے پیغمبر تجھ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں وہ سب مرد تھے سو اہل علم سے پوچھ لو"۔

۸۔ مرد نان و نفقہ دینے والا ہے اور عورت لینے والی۔

۹۔ مرد طلاق دے سکتا ہے اور عورت نہیں دے سکتی۔

۱۰۔ مرد پر عدت نہیں عورت پر عدت لازم ہے۔

۱۱۔ مرد کے لئے چار تک بیویاں جائز ہیں، عورت کے لئے صرف ایک خاوند جائز ہے۔

۱۲۔ عورت کی گواہی مرد کی گواہی سے آدھی (نصف) ہے۔

۱۳۔ میراث میں بھی عورت کا حصہ مرد کے حصے کا نصف ہے۔

۱۴۔ دیت میں بھی عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے۔

مرد و زن میں اسی طرح کئی امتیازات ہیں، جس پر قرآن کریم اور احادیث صحیحہ اور اجماع امت ایک جاوداں اور نا قابل انکار حجت ہیں۔

مرد اور عورت کا سائنسی اور ڈاکٹری نقطۂ نگاہ سے فرق

عظیم سائنسی محقق پروڈن مرد اور عورت کی باطنی قوت اور کیفیات کے امتیازات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"عورت کا وجدان بمقابلہ مرد کے اسی قدر کمزور ہے، جس قدر اس کی عقلی قوت

مرد کی عقلی قوت کے مقابلے میں ضعیف نظر آتی ہے۔اس کی اخلاقی قوت بھی مرد کے اخلاق سے بالکل مختلف ہے اور ایک دوسری قسم کی طبیعت رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جس چیز کے حسن و قبح کے متعلق وہ رائے قائم کرتی ہے وہ مردوں کی رائے کے مطابق نہیں ہوتی۔ پس مرد اور عورت میں یہ فرق کوئی عارضی فرق نہیں۔ بلکہ یہ عورت کی طبعی خاصیت پر مبنی ہے"۔

(ابکار الطام تالیف فلاسفر علامہ پروذن بحوالہ قرآن اور عورت تالیف پروفیسر محمد دین قاکی صفحہ ۴۳۶)

علامہ فرید وجدی صاحب اپنی مشہور تالیف "مسلمان عورت" میں صفحہ ۲۴ پر لکھتے ہیں:

"حواس خمسہ جس پر انسان کی عقلی اور دماغی نشوونما کا دارومدار ہے، اس میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے علامہ "نیکولیس" اور علامہ "بیلی" نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے حواس خمسہ مرد کے حواس خمسہ سے ضعیف ہیں"۔

(بحوالہ قرآن اور عورت پروفیسر قاکی صاحب)

علامہ وجدی صاحب مزید رقم طراز ہیں:

"سائیکولوجیا نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے بھیجے (دماغ کا گودا) اور مرد کے بھیجے میں مادتاً اور شکلاً سخت اختلاف ہے، مرد کے بھیجے کے وزن کا اوسط عورت کے بھیجے کے وزن سے سو گرام زیادہ ہے"۔ (مسلمان عورت)

اور جدید تحقیقات نے تو اس بات کو واضح اور بے نقاب کر دیا ہے کہ عورت کا دماغ مرد کے دماغ سے حجم میں چھوٹا ہوتا ہے جس کا اثر عقل و شعور پر بھی ہوتا ہے، حتیٰ کہ وزن کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ احمق کا دماغ عقل مند شخص کے دماغ کی نسبت بہت چھوٹا ہوتا ہے چنانچہ علامہ فرید وجدی صاحب رقمطراز ہیں:

"یہی وہ قوائے عقلیہ کا سرچشمہ ہے، جس میں مرد کا پلہ عورت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے مرد کے دماغ کا اوسط وزن ۴۹ اوقیہ، اور عورت کے دماغ کا وزن صرف ۴۴ اوقیہ ہے۔

دو سو اٹہتر (۲۷۸) مردوں کے دماغ وزن کئے گئے تو سب سے بڑے دماغ کا وزن ۶۵ اوقیہ اور سب سے چھوٹے دماغ کا وزن ۳۴ اوقیہ ثابت ہوا لیکن جب دو سو اکیانوے (۲۹۱) عورتوں کے دماغ کا وزن کیا گیا تو سب سے زیادہ وزنی ۵۴ اوقیہ کا اور سب سے کم وزنی دماغ ۲۱ اوقیہ کا نکلا۔ کیا یہ اختلاف اس امر کا ثبوت نہیں، کہ عورتوں کے عقلی قویٰ مرد کے قویٰ سے بدرجہا ضعیف ہوتے ہیں"۔ (مسلمان عورت)

مشاہدات اور مسلّمات

ہر زمانہ اور ہر دور میں یہ ایک بدیہی اور تسلیم شدہ امر ہے کہ مرد اور عورت کے ظاہری جسم کے عضو کا مجموعی اور جزئی حجم، وزن، طول، عرض، سختی و نرمی اور قوت و ضعف کا جب اوسط تناسب لیا جائے، تو مرد کا پلہ بلاشک وشبہ بھاری ہوتا ہے، نیز دونوں صنفوں کی زور آزمائی، پہلوانی اور جفاکشی میں بھی ہمیشہ میدان مرد کے ہاتھ میں رہتا ہے۔

غم اور خوشی، صبر اور بے صبری، شجاعت اور بزدلی میں بھی اگر اوسط تناسب لیا جائے تو بھی مرد کا درجہ بلند ہے۔

بلکہ عورت کی جسمانی ساخت چہرہ وغیرہ کو قدرت نے جس انداز سے بنایا ہے، اس کی حرکات وسکنات اور آواز میں جو فرق قدرت نے ملحوظ رکھا ہے وہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ مرد کو اللہ تعالیٰ نے عورت پر فوقیت اور قوت نافذہ و فاعلہ دی ہے۔

یہ تمام تفصیل گویا کہ قرآنی آیت (وللرجال علیهن درجة) کی جیتی جاگتی تفسیر ہے، اگر عورت کا درجہ بہت زیادہ بھی بڑھایا جائے تو مرد ایک درجہ فوق ہی رہے گا۔

نیز عورت کی زندگی میں چار ایسے اہم اور انقلابی مراحل پیش آتے ہیں جو کہ سابقہ طبعی زندگی سے یکسر مختلف ہوتے ہیں مثلاً۔

۱۔ حیض (ماہواری)

۲۔ حمل کا ٹھہر جانا، اس کے ساتھ ہی ان گنت جسمانی عوارضات اور تکلیفات کا شروع ہونا۔

۳۔ وضع حمل، زچہ، بچہ کی تکلیفات حتیٰ کہ آپریشن اور عمل جراحی تک نوبت پہنچنا تو آج کل معمول بن چکا ہے۔

۴۔ رضاعت، بچے کو دودھ پلانا اور پرورش کرنا۔

چونکہ ان تکلیفات سے ہر کسی کو واسطہ پڑتا ہے، اور یہ امور کسی سے پوشیدہ نہیں اس لئے ڈاکٹری تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں کسی کو تفصیلی معلومات کی خواہش ہو تو کوئی ڈاکٹری کتاب دیکھ کر تفصیل معلوم کر سکتا ہے، خاص کر ڈاکٹر کاشی رام کی کتاب "امراض نسواں" اس موضوع پر جامع اور مستند کتاب ہے۔ ان جملہ تکلیفات سے اللہ تعالیٰ نے مرد کو بالاتر رکھا ہے ان نسوانی وجوہات کو بھی (وللرجال علیھن درجۃ) کی تفسیر کے طور پر مرد کی فضیلت میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

عورت کا دائرہ کار گھر کی چار دیواری ہے

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ ۝

(سورۃ احزاب، آیت: ۳۳)

"اور اپنے گھروں میں قرار اور وقار کے ساتھ رہو اور پچھلی جاہلیت کی طرح بن سنور کر باہر نہ جاؤ"۔

عورتوں کی مخصوص تکلیفات اور کیفیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر عقل سلیم کا مالک یہی فیصلہ کرے گا، کہ عورت گھر کے اندر ایسی چین و راحت اور وقار کی زندگی گذارے کہ اس کے نرم و نازک کندھوں پر مزید کوئی بوجھ نہ ڈالا جائے حتیٰ کہ عورت کی ذاتی ضروریات زندگی، روٹی، کپڑا، مکان اور علاج معالجہ جیسے ادنیٰ مسائل کا بوجھ بھی شریعت اسلامی نے مرد

کے کندھوں پر ڈال کر عورت کو اس سے بھی سبک دوش کر دیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: او من ينشوء في الحلية وهو في الخصام غير مبين ○ (پارہ: ۲۵، الزخرف، آیت: ۱۸)

"جو زیورات اور زیبائش میں پرورش پاتی ہے، وہ خصومت و نزاعی مسائل میں واضح کردار ادا کرنے سے فطرتاً قاصر رہتی ہے"۔

یہاں بھی عورت کی دو طبعی اور فطرتی ایسی خصوصیات کی طرف اشارہ ہے جن کا عورتوں میں بہ نسبت مردوں کے زیادہ پائے جانے پر انسانی تاریخ گواہ ہے اور ان کے عیب اور خلاف کمال ہونے پر نسل انسانیت کا اجماع ہے، اور وہ ہے زیب و زینت اور ہار سنگار کا دلدادہ ہونا اور نزاع و مخاصمت کے دوران واضح کردار ادا کرنے سے قاصر ہونا۔

یہ دونوں صفتیں یا کمزوریاں اگرچہ مردوں میں بھی موجود ہیں مگر ان کی بہ نسبت عورتوں میں زیادہ ہیں۔

قولہ تعالیٰ: واذا بشر احدهم بما ضرب للرحمٰن مثلا ظل وجهه مسودا وهو كظيم ○ الآيه (پارہ ۲۵، الزخرف، آیت: ۱۷)

"اور جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی (بیٹی کی پیدائش کی) خوشخبری دی جائے جسے وہ رحمان کے لئے (مشرکین) ٹھہراتے ہیں، تو اس کا منہ غم سے سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ دل میں کڑھتا رہتا ہے"۔

خواہ پیروکار دین جمہوریت اور مدعیان مساوات مرد و زن مانیں یا نہ مانیں، مگر نسل انسانیت کی ابتدا سے تاہنوز طبعی اور فطرتی اجماع ہے کہ والدین اور گھر والے چھوٹے بڑے، لڑکے کی پیدائش کے زیادہ آرزومند ہوتے ہیں بہ نسبت لڑکی کے، نیز لڑکا پیدا ہونے کی صورت میں خوشی کا بڑھ چڑھ کر مظاہرہ کرتے ہیں بہ نسبت لڑکی پیدا ہونے کے اگرچہ وہ والدین، یا گھر والے، مرد و زن، کے مساوات کے داعی اور علمبردار ہی کیوں نہ ہوں۔

لیکن ان سب کچھ کے باوجود عورت کے وجود کی اہمیت سے نہ تو دین اسلام انکار کرتا ہے اور نہ ہی کوئی ذی شعور انکار کر سکتا ہے، حتیٰ کہ اس دار فانی میں مرد کی بقا کے لئے عورت کا وجود شرط اول ہے۔

امامت صغریٰ اور امامت کبریٰ

دین اسلام میں ملک اور حکومت کی سربراہی اور مسجد کی امامت اور پیشوائی اس حد تک آپس میں مربوط ہیں کہ اصطلاح شریعت میں دونوں کی قیادت کو امامت اور ان کے قائد کو امام کہا جاتا ہے، چنانچہ دونوں کے لئے امامت صغری (چھوٹی امامت) اور امامت کبریٰ (بڑی امامت) امام الحی (گاؤں اور محلے کا امام) اور امام المسلمین (جملہ مسلمانوں کا امام) جیسے الفاظ بولے جاتے ہیں، قرآن کریم نے ہر جگہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حکومت کو امامت سے تعبیر کیا ہے۔

(الف) قرآن کریم نے تو دونوں اماموں کو اس حد تک مربوط کیا ہے کہ سربراہ حکومت کا اولین فریضہ "اقامت صلوٰۃ ٹھہرایا ہے، کہ خود بھی اور رعیت سے بھی اقامت صلوٰۃ کا اہتمام کرائے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوۃ وآتوا الزکوۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر ○ (سورۃ الحج، آیت: ۴۱)

"وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں"۔

(ب) حضور علیہ السلام سے لیکر عہد صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین، بلکہ اس کے بعد صدیوں تک مسلمان کا بلا استثنیٰ معمول رہا ہے کہ جس مجمع میں سربراہ حکومت یا مملکت موجود ہو تا نماز کی امامت بھی وہی کرتا، یہی وجہ ہے کہ جملہ مکاتب فکر کے فقہاء اس پر متفق

ہیں کہ نماز کی امامت کا سب سے پہلا حقدار مسلمان سربراہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ کسی میت کے نماز جنازہ کی امامت میں شریعت نے سربراہ حکومت یا مملکت کو میت کے قریب ترین ورثاء پر فوقیت اور ترجیح دی ہے۔

(ج) صحابہ کرامؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دلائل اور وجوہ ترجیح، میں سے ایک اہم دلیل یہ ٹھہرائی کہ آپ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مرض وفات میں اپنی جگہ نماز کی امامت کے لئے مقرر فرمایا، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

ولقد امره رسول الله ﷺ باالصلوة بالناس وهو حى.

(مستدرک الحاکم صفحہ ۲۶ جلد ۳ وقال: صحیح علی شرط شیخین)

دوسری طرف اس بات پر جملہ مذاہب اسلامیہ کے اماموں کا اتفاق ہے کہ عورت نماز میں مردوں کی امامت نہیں کر سکتی۔

انصاف کیجئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عورت کو چھوٹے درجے کی امامت اور قیادت کی ذمہ داری نہیں سونپی تو بڑے درجے کی امامت اور قیادت اس کو کیسے سونپی جا سکتی ہے؟

ملک اور حکومت کی سربراہی کے لوازمات اور عورت

جیسے کہ ہر ایک جانتا ہے کہ حکومت کے سربراہ کو نہ صرف اپنے ملک کے خواص وعوام سے روزمرہ مل بیٹھنے کی ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ بیرونی ممالک کے وفود اور سربراہوں سے جلوت اور خلوت میں تبادلہ خیال اور سرگوشیوں کی ضرورت پیش آتی ہے، خاص کر موجودہ دور میں جس میں سربراہ کے لئے جلوسوں کی قیادت، بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کرتے ہوئے چیخنا، چلانا، اچھلنا، کودنا، حتیٰ کہ بسا اوقات کپڑے پھاڑنا، کوٹ اتار پھینکنا، عوام کی ریلیوں اور مجمع میں گھل مل جانا، روزمرہ کی تقریبات میں شرکت کرنا بیرونی

ممالک کے دورے کرنا، سربراہان ممالک سے خالص ایسی تنہائی میں ملنا جس میں تیسرے فرد کے لئے گنجائش نہ ہو، ایک لازمی بین الاقوامی فیشن بن چکا ہے۔ جب کہ دین اسلام نے عورت کو چشم اغیار سے بالاتر بیش بہا مقام پر رکھا ہے۔

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى○

(الاحزاب، آیت: ۳۳)

"اور اپنے گھروں میں قرار اور وقار کے ساتھ رہو اور جاہلیت قدیمہ کی طرح ہار سنگار کر کے باہر نہ جاؤ"۔

عورت کے متعلق دین اسلام کا اصلی اور حقیقی حکم یہی ہے کہ بلا ضرورت شرعیہ عورت کو باہر جانے کی جب ضرورت پیش آئے تو ایسی حالت کے لئے قرآن کریم نے چشم اغیار سے پوشیدہ رہے تاکہ کسی کی نگاہوں کے تلذذ کے لئے مال غنیمت نہ بنے۔ البتہ عارضی اور استثنائی احکامات جاری فرمادیے ہیں چنانچہ ارشاد فرمایا ہے:

یا ایها النبی قل لازواجك وبناتك ونسآء المومنين يدنين عليهن من جلابيبهن ذالك ادنى ان يعرفن فلا يوذين○

(الاحزاب، آیت: ۵۹)

"اے نبی اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ (باہر جاتے وقت) اپنے پورے بدن اور لباس وزینت کو بڑی چادروں سے ڈھانپ لیا کریں ایسا کرنا ان کی پاکدامنی اور شرافت کی علامت سمجھی جائیگی پس انہیں فساق نہیں ستائیں گے"۔

تشریح: علامہ آلوسیؒ تفسیر روح المعانی میں اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

والظاهر ان المراد بعليهن على جميع اجسادهن.

"ظاہر ہے کہ یہاں پورے جسم کو ڈھانپ لینے کا حکم دیا گیا"۔

"حضرت ابن جریر اور ابن المنذر علامہ محمد بن سیرین سے روایت کرتے ہیں، کہ انہوں نے عبیدہ سلمانی سے اس آیت (یدنین علیهن) کے متعلق پوچھا۔ تو حضرت عبیدہ نے اپنی چادر اٹھائی اور پورا سر اور پیشانی اور پورا منہ ڈھانپ کر بائیں طرف والی آنکھ کو کھلا رکھا"۔ (روح المعانی جزء ۱۲ صفحہ ۸۹)

رئیس المفسرین حضرت ابن عباس ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رضی اللہ عنہم سے بھی ایسی ہی تفسیر منقول ہے۔

نیز اس آیت میں (ونساء المومنین) نے حجاب کا حکم واضح کر دیا کہ یہ حکم صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیویوں اور بیٹیوں کے لئے نہیں ہے، جیسا کہ بعض مغرب زدہ ذہنیت رکھنے والے حضرات کہتے ہیں بلکہ جملہ مسلمان عورتوں کے لئے بھی یہی حکم ہے۔

قولہ تعالی: ولا یضربن بارجلهن لیعلم ما یخفین من زینتهن○

(النور، آیت: ۳۱)

"اور اپنے پاؤں زمین پر زور سے نہ ماریں تاکہ ان کی چادر یا برقعہ کے اندر مخفی زیب و زینت ظاہر نہ ہو جائے"۔

تشریح: یعنی ضرورت کے وقت گھر سے باہر جاتے ہوئے ایسے ناز و نخرے سے نہ چلیں، جس سے دیکھنے اور سننے والوں کے جذبات شہوانیہ کو دعوت اشتعال دلانا مقصود ہو۔

قال رسول اللہ ﷺ المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشیطان.

(جامع ترمذی ابواب النکاح)

"حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے "عورت پوشیدہ چیز ہے، پس جب بھی وہ باہر نکلتی ہے، تو شیطان اس کی تاک میں لگ جاتا ہے"۔

قال علیه الصلوة والسلام لیس علی النساء غزو ولا جمعة وتشییع

جنازة. (مجمع الزوائد جلد ۲، صفحہ ۱۷۰)

"حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا عورتوں پر نہ جہاد فرض ہے، اور نہ جمعہ فرض ہے نہ جنازہ کے پیچھے جانا جائز ہے"۔

دیکھئے اتنی اہم دینی عبادتوں اور دینی مہمات کے لئے بھی عورتوں کو گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں، اسی لئے یہ عبادات ان کے ذمہ سے ساقط کی گئی ہیں۔

قرآن وحدیث کے ان صریح احکامات پر عمل کرتے ہوئے کیا کوئی صحیح العقیدہ مسلمان یہ کہہ سکتا ہے؟ کہ دین اسلام میں عورت کی سربراہی کی گنجائش ہے، کلا وحاشا۔

قال علیہ الصلوۃ والسلام لن یفلح قوم ولو امرھم امرأۃ۔

(بخاری کتاب المغازی باب کتاب النبی علیہ السلام الی کسری وقیصر و کتاب الفتن باب الفتنۃ التی تموج کموج البحر)

"حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے "وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جو اپنے معاملات کی ذمہ داری کسی عورت کے سپرد کر دے"۔

(بخاری کتاب المغازی باب کتاب النبی علیہ السلام قیصر و کسریٰ کے نام نیز باب الفتن التی تموج موج البحر)

قال النبی علیہ الصلوۃ والسلام اذا کانت أمورکم الی نساءکم فبطن الارض خیر لکم من ظھرھا. (جامع ترمذی ابواب الفتن جلد ۲، صفحہ ۵۲)

"حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے سپرد ہو جائیں تو زمین کا پیٹ تمہارے لئے اس کی پشت سے بہتر ہوگا"۔

قال علیہ الصلوۃ والسلام ھلکت الرجال حین اطاعت النسآء. قال الحاکم صحیح الاسناد وصححہ الذھبی.

(مستدرک الحاکم جلد ۴، صفحہ ۲۹۱ کتاب الادب باب سجدۃ الشکر)

"حضور علیہ السلام نے فرمایا جب مرد عورتوں کے زیر حکم ہونا قبول کرنے لگیں، تو وہ تباہ وبرباد ہیں" امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے، امام ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔

یہ احادیث عورت کی سربراہی کے عدم جواز کے بارے میں اتنی واضح ہیں کہ اس کی مزید کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

عورت کی سربراہی کے عدم جواز پر "اجماعِ امت"

قرآن وسنت کے مذکورہ دلائل کے پیش نظر چودہ سو سالہ ماضی میں امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع رہا ہے کہ اسلام میں سربراہ حکومت یا مملکت کی ذمہ داری کسی عورت کو نہیں سونپی جاسکتی، بلکہ زمانہ خیر القرون سے لیکر صدیوں تک کسی بھی عظیم ترین اور افضل ترین عورت کی سربراہی کا مسئلہ مسلمانوں کے اندر تجویز کی حد تک بھی پیش نہیں ہوا ہے۔

علامہ ابن حزمؒ نے امت کے اجماعی مسائل یعنی وہ مسائل جس پر امت کا اجماع ہے، یکجا کر کے انہیں کتابی شکل دے کر اسے "مراتب الاجماع" کا نام دیا ہے چنانچہ اس کتاب میں علامہ موصوف لکھتے ہیں:

"واتفقوا ان الامامة لا تجوز لِامرأةٍ" (صفحہ ۱۲۶)

یعنی امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ حکومت کی سربراہی کسی عورت کے لئے جائز نہیں ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ جیسے امام نے علامہ ابن حزمؒ کی مذکورہ کتاب پر ایک تنقیدی کتاب "نقد مراتب الاجماع" کے نام سے لکھی ہے، جس میں آپؒ نے علامہ ابن حزم سے بعض مسائل میں اختلاف کیا ہے جسے ابن حزمؒ نے تو اجماعی قرار دیا ہے، مگر وہ حضرت ابن تیمیہؒ کی تحقیق کے مطابق اجماعی نہیں بلکہ اس میں کسی نہ کسی کا اختلاف موجود ہے۔ مگر اس کتاب میں بھی علامہ ابن تیمیہؒ نے عورت کی سربراہی کے مسئلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا دیکھئے "نقد مراتب الاجماع لابن تیمیہؒ"۔

یاد رہے کہ شریعت اسلامی میں احکامات کے ثبوت کے لئے امت مسلمہ کا اجماع

ایک مستقل دلیل ہے۔

اسلامی سیاست کے ماہرین جیسے علامہ ماوردی رحمہ اللہ اور علامہ ابو یعلی نے اپنی مشہور کتابوں میں تصریح کی ہے، کہ حکومت کی سربراہی تو کجا عورت کو کسی ادنیٰ وزارت کی ذمہ داری سونپنا بھی جائز نہیں ہے دیکھئے۔

(الاحکام السلطانیہ للماوردی صفحہ ۲۵ تا ۲۷ الاحکام السلطانیہ لابی یعلی صفحہ ۳۱)

امام الحرمین علامہ جوینی رحمہ اللہ اپنی کتاب "الارشاد" میں تحریر فرماتے ہیں:

واجمعوا ان المرأة لا یجوز ان تکون اماما۔

"اور اس بات پر اجماع ہے، کہ عورت کے لئے سربراہ حکومت یا مملکت بننا جائز نہیں ہے"۔

پانچویں صدی ہجری کے مایۂ ناز مفسر و فقیہ امام بغویؒ لکھتے ہیں:

اتفقوا علی ان المرأة لا تصلح ان تکون اماما لان الامام یحتاج الی الخروج لاقامة امر الجهاد والقیام بامور المسلمین والمرأة عورة لا تصلح للبروز. (شرح السنہ للبغوی جلد ۱۰، صفحہ ۷۷، باب کراہیۃ تولیۃ النساء)

"اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ عورت سربراہ حکومت نہیں بن سکتی کیونکہ سربراہ حکومت کو جہاد کے معاملات انجام دینے اور مسلمانوں کے امور نمٹانے کے لئے باہر نکلنے کی ضرورت پڑتی ہے، اور عورت کو (از روئے اسلام) پوشیدہ رہنا چاہیے اس کا مجمع عام میں ظاہر ہونا جائز نہیں"۔

تاریخ اور سیاست اسلامی کے امام علامہ قلقشندیؒ نے اپنی مشہور کتاب "اسلام کے اصول سیاست" میں سربراہ حکومت کی اہلیت کے لئے چودہ صفات بیان کی ہیں، ان میں شرط اول کے طور پر سربراہ کا مرد ہونا ذکر کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

الاول! الذکورة والمعنی فی ذالك ان الامام لا یستغنی عن الاختلاط

بالرجال والمشاورة معهم فی الامور والمرأة ممنوعة من ذالك الخ

"پہلی شرط مرد ہونا ہے، اور اس حکم کی حکمت یہ ہے کہ سربراہ حکومت کو مردوں کے ساتھ اختلاط اور ان کے ساتھ مشوروں وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور عورت کے لئے یہ باتیں ممنوع ہیں"۔

علامہ قاضی ابو بکر ابن العربیؒ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث شریف "هلكت الرجال حين اطاعت النساء" کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وهذا نص فی ان المرأة لا تكون خليفة ولا خلاف فيه.

(احکام القرآن لابن العربی جلد ۳، سورۃ النمل)

"اور یہ حدیث اس بات پر نص ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہو سکتی اور اس میں کوئی اختلاف نہیں"۔

علامہ قرطبیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں ابن عربیؒ کا یہ اقتباس نقل کر کے اس کی تائید کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس مسئلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

(تفسیر القرطبیؒ جلد ۱۳، صفحہ ۱۸۳، سورۃ النمل)

علامہ امام غزالی رحمہ اللہ اپنی کتاب "فضائح الباطنیہ صفحہ ۱۸۰ پر بحوالہ "الامامۃ العظمیٰ صفحہ ۲۴۵ تالیف عبداللہ الدمیجی" تحریر فرماتے ہیں:

الرابع الذكورية فلا تنعقد الامامة لامرأة وان الصفت بجميع خلال الكمال وصفات الاستقلال. (فضائح الباطنیہ للغزالی صفحہ ۱۸۰)

"سربراہی کی چوتھی شرط مرد ہونا ہے، لہٰذا کسی عورت کی امامت منعقد نہیں ہوتی خواہ تمام اوصاف کمال سے متصف ہو، اور اس میں استقلال کی جملہ صفات پائی جاتی ہوں"۔

علامہ قاسم ابن قطلوبغا الحنفی شرح المسایرہ میں لکھتے ہیں:

ولان النسآء لا يصلحن للامارة والسلطنة والقضاء واقامة الصلوة

بالاجماع. (المسامرۃ، صفحہ ۲۰۶)

"اور اس لئے کہ عورت کے (ازروئے اسلام) حکومت کی سربراہی، سلطنت، قضاء اور نماز کی امامت کے لئے اہل نہ ہونے پر مسلمانوں کا اجماع ہے"۔

علامہ تفتازانی اپنی مشہور آفاق کتاب "شرح المقاصد" میں تحریر فرماتے ہیں:

یشترط فی الامام ان یکون مکلفا حراً ذکراً عدلاً۔

(شرح المقاصد جلد ۲، صفحہ ۲۷۷)

"سربراہ حکومت کے لئے شرط یہ ہے، کہ وہ عاقل، بالغ ہو، آزاد ہو، مرد ہو اور عادل ہو"۔

عہد حاضر کے بعض محققین کی تحقیقات

ڈاکٹر محمد منیر عجلانی لکھتے ہیں:

لا نعرف بین المسلمین من اجاز خلافة المرأة فالاجماع فی هذه القضية تام لم يشذ عنه احد. (عبقریۃ الاسلام فی اصول الحکم صفحہ ۷۰، بیروت)

"ہمیں مسلمانوں میں کوئی ایسا عالم دین معلوم نہیں ہے، جس نے عورت کی خلافت کو جائز کہا ہو لہٰذا اس مسئلے میں مکمل اجماع ہے، جس کے خلاف کوئی شاذ قول بھی موجود نہیں"۔

ڈاکٹر ضیاء الدین الریس نے اسلام کے سیاسی احکام پر جو محققانہ مبسوط کتاب لکھی ہے اس میں موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ اگرچہ بعض فقہاء نے مخصوص اور محدود حالات میں عورت کی قضاء کے جواز کا قول کیا ہے، مگر عورت کی سربراہی کے جواز کا قول کسی نے نہیں کیا ہے۔

فلم یرو عنهم خلاف فیما یتعلق بالامامة بل الکل متفق علی انه لا یجوز

ان يليها إمرأة. (النظريات السياسية الاسلامية صفحہ ۲۹۴ مطبوعہ القاہرہ)

"لیکن حکومت کی سربراہی کے بارے میں کوئی اختلاف منقول نہیں بلکہ سب اس بات پر متفق ہیں، کہ کسی عورت کا سربراہی کے منصب پر فائز ہونا جائز نہیں"۔

ڈاکٹر ابراہیم یوسف مصطفیٰ عجو لکھتے ہیں:

مما اجمعت عليه الامة على ان المرأة لا يجوز لها ان تلى رياسة الدولة.

ترجمہ: اور جن مسائل پر امت کا اجماع ہے ان میں سے یہ مسئلہ بھی ہے کہ عورت کا سربراہ مملکت بننا جائز نہیں۔ (تعلیق تہذیب الریاسۃ وترتیب السیاسۃ للقلعی صفحہ ۸۲)

عبداللہ بن عمر بن سلیمان الدمیجی لکھتے ہیں:

من شروط الامام ان يكون ذكرا ولا خلاف فى ذالك بين العلماء.

(الامامۃ العظمیٰ عند اہل السنۃ صفحہ ۲۴۳)

"سربراہ حکومت کے لئے شرائط میں یہ بات داخل ہے، کہ وہ مرد ہو اور اس میں علماء کے اندر کوئی اختلاف نہیں"۔

عہد حاضر کے مشہور مفسر قرآن علامہ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

من شروط الامام الاعظم كونه ذكرا ولا خلاف فى ذالك بين العلماء.

(اضواء البیان فی تفسیر القرآن بالقرآن جلد ۱، صفحہ ۶۵)

"امام اعظم (سربراہ حکومت) کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی ہے، کہ وہ مرد ہو اور اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں"۔

پاکستان کے ۲ ہزار علماء کا فتویٰ

بے نظیر دور حکومت میں، ملک بھر سے تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے دو ہزار علماء اور مشائخ کا ایک نمائندہ اجتماع جامعہ اسلامیہ راولپنڈی میں ہوا، جس میں ایک متفقہ

قرارداد کی شکل میں پوری قوم کو آگاہ کیا گیا کہ قرآن وحدیث اور اجماع کے دلائل کی روشنی میں مسلمانوں کی کسی مملکت یا حکومت کی سربراہی عورت کے سپرد کرنا قطعاً ناجائز ہے۔

(بحوالہ ہفت روزہ تکبیر ۱۶ مارچ ۱۹۸۹ء صفحہ ۵)

علماء حرمین شریفین کا فتویٰ

پاکستان پر نسوانی حکمرانی کے دوران اہلیان پاکستان نے دنیا بھر کے قابل اعتماد علماء کرام اور علوم اسلامی کے مراکز کی طرف رجوع کیا، اور معلوم کرنا چاہا کہ کیا اس بیسویں صدی میں عورت کی سربراہی کی گنجائش ہے یا نہیں؟ جن میں سے چند قابل ذکر علماء کرام کی رائے آپ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز وائس چانسلر مدینہ یونیورسٹی ومفتی اعظم حرمین شریفین کا فتویٰ

الجواب: الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ وآلہ واصحابہ۔

اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ سے بخاری شریف میں ایک روایت ہے آپ نے فرمایا ہے "لن يفلح قوم ولوا أمرهم امرأة" وہ قوم نجات نہیں پاسکتی جس نے کسی عورت کو اپنا سربراہ بنایا" حدیث میں نفی عام ہے، قوم اور امر کے الفاظ مطلق فرمائے گئے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کو اس کی ہرگز اجازت نہیں، کہ وہ اپنے امور جن میں مملکت کی صدارت، وزارت عظمیٰ، صوبہ جات اور بلدیات کی ریاست اور عدالت کے مناصب وغیرہ امور شامل ہیں، عورتوں کے سپرد کریں قرآن مجید میں "الرجال قوامون على النساء" مردوں کو عورتوں پر نگران بنایا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ مرد حاکم ہوگا اور عورت محکوم ہو

گی، رسول اللہ ﷺ انصاف کے تقاضوں کے پورا کرنے والے تھے اور عورتوں کے حقوق کے محافظ رہے لیکن اللہ جل جلالہ اور اس کے رسول ﷺ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور ائمہ اربعہ نے کبھی عورت کو حکومت، ریاست اور مردوں کے امور عامہ کی قیادت کا مختار نہیں بنایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صرف قصاص کا مطالبہ لیکر اٹھی تھیں، اور کچھ لوگ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی ہوگئے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت نے حضرت عائشہؓ کی اس بارے میں شدید مخالفت کی حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکومت کی قیادت کا مطالبہ نہیں کیا تھا، بلکہ صرف قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ لیکر اٹھی تھیں، متعدد اہل علم مثلاً قرطبیؒ نے مذکورہ بالا دلائل کے پیش نظر عورت کی ولایت عامہ کے عدم جواز پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے، اور جمہور علماء ولایت عامہ سے کم درجے کے مناصب مثلاً صوبہ اور شہر کی قیادت، وزارت وعدالت وغیرہ کے لئے بھی عورت کے تقرر کے عدم جواز کے قائل ہیں اور یہی حق ہے۔ (شیخ بن باز کے فتویٰ کا اردو ترجمہ)

فتویٰ الشیخ عبدالقادر الموقر شیخ التفسیر مدینہ یونیورسٹی

"تمام اہل اسلام اور اہل علم متفق ہیں کہ عورت کو وزارت عظمیٰ کے لئے منتخب کرنا ناجائز ہے، صرف خارجی اس کو جائز سمجھتے ہیں" (آگے چل کر شیخ لکھتے ہیں) "ایسی قوم اور مجمع سے اللہ کی پناہ جو اس درجہ اسلام سے گرنے کے بعد بھی اسلام کی مدعی ہو"۔

علماء حرمین کا مذکورہ فتویٰ ملک بھر میں پمفلٹوں، اخبارات اور مختلف رسائل میں شائع ہوا۔ (ہفت روزہ تکبیر ۸ دسمبر ۱۹۸۸ء)

دین جمہوریت کے پیروکاروں کا جھوٹا فتویٰ

بے نظیر دور حکومت میں جمہوریت پرستوں نے علماء حق کے متفقہ فتویٰ کے توڑ

کے لئے اس بات کی تشہیر کی کہ ہمارے پاس دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ موجود ہے کہ عورت کی سربراہی اسلام میں جائز ہے حتیٰ کہ وزیراعظم بے نظیر صاحبہ کے ایک اہم مشیر نے دوران گفتگو مجھے بتایا کہ ہمارے پاس بھی مستند فتویٰ موجود ہے، اس پر دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے عورت کی سربراہی کے عدم جواز کا مفصل اور مدلل فتویٰ شائع ہوا، جس کے چند ابتدائی جملے درج کئے جاتے ہیں۔

مفتی دارالعلوم دیوبند علامہ حبیب الرحمان صاحب خیر آبادی لکھتے ہیں۔

"ایک فتویٰ دیکھنے میں آیا جس میں اسلامی مملکت کے اندر عورت کی سربراہی کو قرآن وحدیث اور فقہی روایات سے مطلقاً جائز قرار دیا گیا ہے اور اس فتویٰ کو دارالعلوم دیوبند کی طرف منسوب کر کے مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کے نام سے شائع کیا گیا ہے، حالانکہ دارالعلوم دیوبند سے جواز کا کوئی فتویٰ نہیں دیا گیا، اور نہ اس فتویٰ نویس کا دارالعلوم سے کوئی تعلق ہے، اس لئے بعض بزرگوں کی درخواست پر اس کا تفصیلی جواب تحریر کیا جارہا ہے"۔

(مفتی حبیب الرحمان)

دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث علامہ ارشد مدنی اسی جعلی فتویٰ کے متعلق لکھتے ہیں:

"آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اس کے جواب میں یہ عرض ہے کہ سید احمد علی سعید نام کے کوئی صاحب دارالعلوم دیوبند میں نہ مدرس ہیں، اور نہ مفتی، اور نہ ہی دارالعلوم کے کسی شعبہ میں ملازم ہیں۔

رہی یہ بات کہ علماء دیوبند کے نزدیک عورت کی سربراہی کی کیا حیثیت ہے تو اس بارے میں دارالعلوم دیوبند کے کل مفتیان فتویٰ دے چکے ہیں، جو دارالعلوم کے اساتذہ کی تصدیق کے ساتھ پاکستان بھیجا جا چکا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے"۔

(ارشد مدنی)

(تفصیلی فتویٰ کے لئے ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک دسمبر ۱۹۸۹ء و ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ دسمبر ۱۹۸۹ء دیکھئے)

اگر علماء اسلام، فقہاء، ائمہ، مفسرین، محدثین اور متکلمین کی وہ عبارات اور دلائل جو انہوں نے عورت کی سربراہی کے عدم جواز کے بارے میں اپنی تصنیفات میں درج فرمائے ہیں جمع کیے جائیں تو صرف ان ہی سے ایک ضخیم کتاب وجود میں آجائیگی اس لئے انہی چند اقتباسات پر اکتفاء کررہا ہوں۔

بعض درباری اور مفاد پرست ملاؤں کا فتویٰ

آپ نے علماء حق کا متفقہ فتویٰ پڑھ لیا کہ دین اسلام کی رو سے عورت کی سربراہی ناجائز ہے، اب چند درباری نام نہاد علماء کا فتویٰ کہ "اسلام میں عورت کی سربراہی مطلقاً جائز ہے" بھی ملاحظہ کرلیں نیز ان کے بے بنیاد دلائل اور علماء حق کی طرف سے ان کے جوابات بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ملکۂ بلقیس کے واقعہ سے استدلال

آج کل جمہوریت پرست حضرات عورت کی سربراہی کا جواز یمن کی ملکۂ بلقیس کے اس واقعے سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو قرآن کریم نے "سورۃ النمل" میں بیان فرمایا ہے۔ یہ حضرات قرآن کے بیان کردہ اس قصہ سے اس اساس پر استدلال کرتے ہیں، کہ سابقہ شریعتوں کے واقعات کے بارے میں علماء اسلام نے جو اصول و قواعد وضع کیے ہیں، ان کے مطابق جب اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں یا رسول خدا ﷺ اپنی احادیث میں گذشتہ امتوں کے واقعات میں سے کوئی واقعہ اس انداز سے بیان کریں کہ طرز بیان سے کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ اور رسول خدا ﷺ کی ناخوشی اور ناپسندیدگی ظاہر نہ ہوتی ہو تو ایسا طرز بیان اس بات کی واضح دلیل ہے، کہ امت مسلمہ کے لئے ایسا واقعہ دہرانا اور وہی کام کرنا جائز ہے۔

چنانچہ تفسیر اتقان وغیرہ میں تصریح ہے کہ "اذا قص اللہ ورسولہ علینا امرا من

غیر نکیر علیه فهو حجة لنا"۔

اور یہ بات بعض روایات میں وارد ہوئی ہے، کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں بلقیس کے اسلام لانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو دوبارہ ملک یمن کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے، کہ دور سلیمانی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں عورت کی سربراہی جائز تھی مشرکوں کے دین میں بھی اور سلیمان علیہ السلام کے دین میں بھی، چونکہ قرآن وحدیث نے اس قصہ کو ایسے انداز میں نقل کیا ہے جس میں کوئی ناخوشی اور نکیر نہیں لہٰذا دین اسلام میں بھی عورت کی سربراہی جائز ہے۔

شاید کسی ایسی ہی مناسبت سے فارسی کا مقولہ وجود میں آگیا ہوگا۔

؎ چہ خوش گفت سعدی در زلیخا

قرآن کریم اُٹھا کر پڑھے آپ کو حسب ذیل باتیں نمایاں نظر آئیں گی۔

۱۔ سلیمان علیہ السلام نے پرندوں میں سے "ہدہد" کو غیر حاضر پاکر اسے قرار واقعی سزا دینے کا اعلان کیا الا یہ کہ ہدہد کوئی قابل قبول وجہ پیش کرے۔

۲۔ ہدہد نے سزا سے بچنے کے لئے جو دلیل پیش کی وہ یہ خبر تھی کہ "مجھے آج ایسی چیز کا علم ہوا جو آپ کے تصور میں بھی نہیں۔

فقال أحطت بما لم تحط به وجئتك من سبأٍ بنبأٍ يقين○ انی وجدت إمرأة تملكهم○ (النمل، آیت: ۲۳)

"ہدہد نے کہا مجھے ایک ایسی چیز معلوم ہوئی ہے، جس کی آپ کو خبر نہیں اور میں آپ کے پاس شہر سبا سے ایک سچی خبر لیکر آیا ہوں، میں نے ایک عورت دیکھی کہ ان لوگوں پر سربراہی کرتی ہے"۔

یہاں ہدہد نے اپنی گلوخلاصی کے لئے جس چیز کو اہم ترین دلیل (سلطان مبین) کے طور پر پیش کیا۔ اسی کے ضمن میں یہ دعویٰ بھی کیا کہ تجھے اس کی کوئی خبر نہیں۔ اور سلیمان

علیہ السلام کو جس چیز کی خبر نہ تھی، وہ عورت کی سربراہی کی بات تھی، چنانچہ سلیمان علیہ السلام کو یہ خبر اتنی اچھی اور عجیب لگی کہ آپ نے ہدہد کو صرف معافی سے نہیں نوازا بلکہ اسے سفیر بنا کر تحقیق و تفتیش پر مامور کیا، یہ سب کچھ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ دور سلیمانی میں عورت کی سربراہی لوگوں میں معروف اور معتادبات نہ تھی اور نہ شریعت سلیمانی علی صاحبہا السلام میں یہ مشروع امر تھا۔

۳۔ بلقیس کی حکومت جمہوری طرز کی تھی وہ قومی نمائندوں کے مشوروں سے فیصلے کرتی تھی۔

ما کنت قاطعة أمرًا حتى تشهدونo

(النمل، آیت:۳۲)

”میں تمہاری رائے سامنے آنے سے پہلے کوئی فیصلہ کرنے والی نہیں ہوں“۔

۴۔ ایمان لانے سے قبل ملکہ بلقیس سورج پرست مشرکین کی ملکہ تھی، اور خود بھی سورج کی عبادت کیا کرتی تھی۔

وجدتها وقومها يسجدون للشمس من دون الله.

”میں نے اس کو اور اس کی قوم کو پایا ہے، کہ وہ اللہ کی بجائے سورج کو سجدہ کرتے ہیں“۔

۵۔ سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس اور اس کی قوم کی مذکورہ مجموعی روش کو رد کرتے ہوئے شاہانہ اور حاکمانہ انداز میں لکھ بھیجا کہ ”میرے حکم سے سرکشی نہ کرو اور مطیع و فرمانبردار بن کر میرے سامنے پیش ہو جاؤ“۔ ”ان لا تعلوا علی واتونی مسلمین“۔

۶۔ ملکہ بلقیس نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے بالواسطہ اپنی سربراہی کی حیثیت تسلیم کروانے کی کوشش کی تھی، اور دوسربراہوں کے درمیان تحائف کا تبادلہ کرنے کے معمول اور رسم کا سہارا لیا تھا، چنانچہ سلیمان علیہ السلام کو قاصدوں اور سفیروں کے ہاتھ

بیش بہا تحائف بھیجے۔

وانی مرسلة الیھم بھدیة فناظرة بم یرجع المرسلون ○

"اور میں ان کی طرف کچھ تحفہ بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لاتے ہیں"۔ (النمل، آیت: ۳۵)

۷۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دھمکی آمیز انداز میں ان کے تحفے ٹھکرا دیے تھے۔ گویا کہ انہوں نے بلقیس کی سربراہانہ حیثیت کا انکار کر دیا۔

فما آتنی اللہ خیر مما آتاکم بل انتم بھدیتکم تفرحون ○ ارجع الیھم فلناتینھم بجنود لا قبل لھم بھا ولنخرجنھم منھا اذلة وھم صاغرون ○ (النمل، آیت: ۳۶)

"پس جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے، وہ اس سے بہت بہتر ہے، جو تمہیں دیا ہے، تم ہی اپنے تحفے پر خوش ہوتے ہو گے۔ ان کے پاس واپس لوٹ جاؤ ہم ان پر ایسے لشکر سے حملہ کریں گے جن کے مقابلے کی ان کو طاقت نہ ہو گی اور ان کو وہاں سے بے عزت کر کے نکال دیں گے اور وہ ذلیل و خوار ہوں گے"۔

۸۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کا تخت اپنے قبضہ میں لیکر اس کی شکل بدل ڈالی۔ (آیت: ۴۰، ۴۱)

۹۔ ملکہ بلقیس پر اس کی سطح نظری اور چمک دمک کی دلدادہ نگاہ کی غلطی، واضح کرنے کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے شیشے کے انوکھے محل میں داخل ہونے کا حکم دیا، بلقیس نے شیشے کے فرش کو گہرا پانی سمجھ کر اپنی پنڈلیاں کھولیں تو اسے بتایا گیا کہ یہ پانی نہیں بلکہ شیشے کا فرش ہے، تو اس پر اپنی سطحی نگاہ کی حقیقت واضح ہو گئی۔ (النمل، آیت: ۴۴)

۱۰۔ بلقیس نے سلیمان علیہ السلام کے دربار میں قبول اسلام کا اعلان کر دیا۔

قالت رب انی ظلمت نفسی وأسلمت مع سلیمان للہ رب العالمین٥ (النمل، آیت:۴۴)

"کہنے لگی اے میرے رب میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا اور میں سلیمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی فرمانبردار ہوئی جو سارے جہاں کا رب ہے"۔

ملکہ بلقیس کے اس آخری اعلان پر قرآن کریم یہ قصہ ختم کر کے قوم ثمود کا قصہ شروع کرتا ہے۔

قرآن کریم کے بیان کردہ اس واقعہ میں کہیں دور دور تک کوئی ایسا شائبہ بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ یا اللہ کے پیغمبر سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس اور اس کی قوم کے کسی کردار کو جائز اور قابل تحسین قرار دیا ہو، بلکہ ہر قدم پر اسے ٹھکرایا گیا، اور آخر کار ملکہ بلقیس سے اعلان کروایا کہ "میں نے اس سے پہلے اپنے آپ پر ظلم کیا یعنی جو کچھ کیا وہ بے موقع، بے محل کیا اور اپنے دائرہ عمل سے باہر قدم رکھ کر غلطی کی ہے۔

ظلم کی تعریف :

ظلم کے بارے میں امام لغت القرآن علامہ راغب فرماتے ہیں:

والظلم عند اهل اللغة وكثير من العلماء! وضع الشئی فی غیر موضعه المختص به. (المفردات للراغب اصفہانی صفحہ ۳۱۸)

"ظلم کی تعریف اہل لغت اور بیشتر علماء کے نزدیک یہ ہے، کہ کسی چیز کا اپنے مخصوص محل اور دائرہ سے تجاوز کر کے غیر محل میں استعمال کرنا"۔

رہی یہ بات کہ بعض روایات میں بلقیس کو بعد از اسلام حضرت سلیمان علیہ السلام نے دوبارہ ملکہ یمن بنا کر بھیجا۔ یہ اسرائیلی روایات ہیں۔ جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ

سلیمان علیہ السلام نے خود ان سے نکاح کیا، اور بعض میں ہے کہ ان کا نکاح ہمدان کے بادشاہ سے کر دیا، بعض میں ہے کہ اسے شام بھیج دیا لیکن ایسی تمام روایات قطعی طور پر غیر مستند ہیں، کسی بھی صحیح حدیث سے کسی ایک روایت کی تائید نہیں ملتی ہے۔

بلکہ علامہ قرطبیؒ ان تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد رد فرماتے ہیں:

لم یرد فیه خبر صحیح لافی انه تزوجها ولا فی انه زوجها.

(تفسیر قرطبی، سورۃ النمل)

"اس بارے میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے، نہ اس بارے میں کہ انہوں نے بلقیس سے نکاح کیا اور نہ اس بارے میں کہ کسی اور سے اس کا نکاح کرایا"۔

حضرت عائشہؓ کے قصہ سے استدلال :

قصاص عثمان کے سلسلہ میں عموماً مسلمانوں کا یہی موقف تھا کہ خلیفہ مظلوم کے قاتلوں پر قرآن کریم کے مطابق قصاص کا حکم نافذ کیا جائے کیونکہ یہ ایک اسلامی فریضہ ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بعض قریبی رشتہ دار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس پر آمادہ کیا کہ آپ بصرہ تشریف لے جایئے تاکہ وہاں کے مسلمانوں کی رائے کو بھی جلد از جلد قصاص لینے کے لئے ہموار کیا جائے، اس طرح قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے مطالبہ میں قوت آجائیگی جس کے نتیجہ میں فریضہ قصاص کا مطالبہ جلد پورا ہو سکے گا اور مسلمانوں کے درمیان پیدا شدہ جنگ کا خطرہ ٹل جائے گا، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آمادۂ سفر ہو گئیں ایک اونٹ پر آپ کے لئے باپردہ کجاوہ کا انتظام کر کے روانہ کیا گیا، آپ کے ساتھ مسلمانوں کی کافی تعداد بھی شریک سفر ہو گئی۔ مگر بد قسمتی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جو متحدہ محاذ بنانا چاہتی تھیں وہ نہ بنا سکیں۔ بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش کرنے والوں نے ایک منظم سازش کے ذریعہ ام المومنین

رضی اللہ عنہا کے اس مصالحانہ سفر کو جنگ میں تبدیل کر دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامیوں کے درمیان معمولی جنگ ہوئی مگر اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل قصاص سے محفوظ ہو گئے۔

اس پورے واقعہ میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں امارت، اور خلافت کا دعویٰ کیا تھا یا یہ کہ آپؓ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت تسلیم کرنے میں پس و پیش کی تھی بلکہ حقیقت میں ام المومنینؓ نے تو حضرت علی کی خلافت تسلیم کرتے ہوئے ان سے قاتلوں سے قصاص کا مطالبہ شروع کیا تھا، اگر وہ خود خلافت کا دعویٰ کرتیں تو حکومت وقت سے کیوں کر قصاص کا مطالبہ کرتی پھرتیں۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ اس قصہ سے استدلال کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

اگرچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک اہم قرآنی فریضہ کے نفاذ کے لئے راہ ہموار کرنے کے لئے نیک نیتی سے گھر سے نکلی تھیں، مگر کئی اکابر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور حضور علیہ السلام کی ازواج رضی اللہ تعالیٰ عنہن نے (باوجود اس کے قصاص کے مطالبہ کے سب حامی تھے) آپؓ کے اس سفر اور گھر سے باہر جانے کو سخت ناپسند کیا اور آپ کو خطوط لکھے، جس میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا خط قابل ذکر ہے۔

اور بعد میں خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس فعل پر اتنی پشیمان اور نادم تھیں کہ تاریخ کی مستند کتابوں میں تحریر ہے۔

اذا قرات هذه الآیه "وقرن فی بیوتکن بکت حتی تبل خمارها".

(طبقات ابن سعد جلد ۸، صفحہ ۸۰ و سیر اعلام النبلاء جلد ۲، صفحہ ۸۷۷)

"جب تلاوت قرآن کریم کے دوران وہ سورہ احزاب کی اس آیت پر پہنچتیں جس میں اللہ تعالیٰ نے خواتین کو یہ حکم دیا ہے، کہ تم اپنے گھروں کی چار دیواری کے اندر قرار اور

وقار سے رہو تو اس قدر روتی تھیں کہ آپ کی اوڑھنی آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی"۔

پھر اس ندامت کا یہ عالم رہا کہ آپ نے اپنے حجرہ مبارک میں حضور علیہ السلام اور اپنے والد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں اپنے دفن کے لئے جو مقام مختص کیا تھا محض اسی ایک فعل کے سرزد ہونے کے باعث اس سے دست بردار ہو گئیں۔

قالت عائشة رضی الله عنها و كان تحدث نفسها ان تدفن في بيتها مع رسول الله ﷺ وابی بكر رضی الله عنه فقالت انی حدثت بعد رسول الله ﷺ حدثا ادفنونی مع ازواجه فدفنت بالبقيع. (قال الحاكم هذا حديث صحيح على شرط شيخين و وافقه الذهبی) (مستدرک الحاکم جلد ۴، صفحہ ۶)

"حضرت عائشہؓ کی دلی خواہش تھی، کہ انہیں ان کے حجرہ میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کے پہلو میں دفن کیا جائے لیکن بعد میں انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ایک بدعت کا ارتکاب کیا ہے، اب مجھے آپ ﷺ کی دوسری ازواج مطہرات کے ساتھ دفن کرنا۔ چنانچہ انہیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ حاکم اور ذہبی نے اس روایت کو شرط شیخین کے مطابق اور صحیح کہا ہے"۔

امام الحدیث حافظ ذہبیؒ حضرت عائشہؓ کے قول کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

تعنی بالحدث مسيرها يوم الجمل فانها ندمت ندامة كلية وتابت من ذالك على انها ما فعلت ذالك الا متاولة قاصدة للخير. (سیر اعلام النبلاء جلد ۲، صفحہ ۱۹۳)

"بدعت سے حضرت عائشہؓ کی مراد جنگ جمل میں ان کا جانا تھا اس لئے وہ اپنے اس عمل پر کلی طور سے نادم تھیں، اور اس سے توبہ کر چکی تھیں، باوجودیکہ ان کا یہ اقدام تاویل واجتہاد پر مبنی تھا اور ان کا مقصد خیر اور صلح تھا"۔

آپ خود انصاف کیجئے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے جس فعل کو خود ہی غلط سمجھا، اور اس سے توبہ کر کے روتی رہیں حتیٰ کہ فرط ندامت کی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قریب دفن ہونے سے بھی شرمائیں۔ اس عمل سے کیسے استدلال کیا جاسکتا ہے؟ اور استدلال بھی سربراہی حکومت کے جواز پر۔ جس کا تصور بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ہمسفر حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حاشیہ خیال میں لمحہ بھر کے لئے نہیں گذرا۔

حافظ ابن جریر طبریؒ کی طرف غلط نسبت

بعض لوگوں نے مشہور مفسر قرآن حافظ ابن جریر طبریؒ کی طرف غلط طور پر یہ بات منسوب کی ہے کہ وہ عورت کی سربراہی کے جواز کے قائل تھے۔ لیکن کوئی بھی ایسا دعویٰ کرنے والا اپنے دعویٰ کے اثبات کے لئے امام ابن جریرؒ کا اپنا کوئی اقتباس پیش نہیں کر سکا۔ البتہ بعض علماء نے ابن جریرؒ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ وہ عورت کو قاضی بنانے کے جواز کے قائل تھے۔ اس بات کو سمجھنے میں بعض لوگوں سے شاید غلطی ہو گئی ہے، یا جان بوجھ کر انہوں نے غلط مفہوم بیان کیا ہو گا۔

حضرت ابو بکرؓ کی روایت کردہ حدیث "لن یفلح قوم ولوا امرھم إمراۃ" کے تحت علامہ ابن العربی تحریر فرماتے ہیں۔

وھذا نص فی ان المراۃ لا تکون خلیفۃ ولا خلاف فیہ ونقل عن محمد بن جریر الطبریؒ امام الدین انہ یجوز ان تکون المراۃ قاضیۃ ولم یصح ذالک عنہ الخ. (احکام القرآن لابن العربی جلد ۳، صفحہ ۱۴۴۵)

"اور حضرت ابو بکرؓ کی یہ حدیث اس بات پر صراحت ہے، کہ عورت خلیفہ نہیں بن سکتی اور اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں البتہ امام محمد ابن جریر طبریؒ سے منقول ہے، کہ ان

کے نزدیک عورت کا قاضی ہونا جائز ہے، لیکن اس مذہب کی نسبت ان کی طرف صحیح نہیں ہے"۔

اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ عورت کی سربراہی از روئے شریعت ناجائز ہے، اور اجماع کا یہ دعویٰ ایرے غیرے نے نہیں بلکہ ایسی عظیم شخصیات نے کیا ہے جو اپنے دور میں اور آج بھی علوم کے سمندر تسلیم کئے جاتے ہیں، جیسے علامہ ابن تیمیہؒ، امام الحرمین علامہ جوینیؒ، علامہ قلقشندیؒ، علامہ بغویؒ، علامہ ابن العربی اور علامہ شنقیطیؒ وغیرہ۔ پھر کیونکر ہو سکتا ہے کہ امام ابن جریرؒ جیسے علامہ کے متعلق یہ بات صحیح ہو کہ آپ جواز کے قائل تھے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ایک تحریر سے استدلال

یہ بات کثرت سے سننے میں آئی ہے کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ جلد ۵ صفحہ ۹۱ تا ۹۳ میں جمہوری حکومت کی سربراہی کا منصب عورت کے لئے جائز قرار دیا ہے۔ یہ بات اس حد تک تو صحیح ہے، کہ مولانا تھانویؒ کا یہ فتویٰ امداد الفتاویٰ میں موجود ہے، مگر یہ بات درست نہیں کہ عورت کی سربراہی کے مسئلے میں حضرت تھانویؒ نے پوری امت مسلمہ کے اجماعی موقف سے ہٹ کر مطلقاً عورت کی سربراہی کے جواز کا ایک شاذ موقف اور قول اپنایا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ بھی پوری امت کے علماء کی طرح اسی بات کے قائل ہیں کہ عورت کو اسلامی حکومت کا سربراہ بنانا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ آپ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اور ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے، پس بلقیس کے قصہ سے کوئی شبہ نہ کرے۔ اول تو یہ فعل مشرکین کا تھا، دوسرے اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کی تقریری بھی کی ہو تو شریعت محمدیہ میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے وہ حجت نہیں"۔

(بیان القرآن جلد ۸، سورۃ نمل، صفحہ ۸۵)

حضرت تھانویؒ نے "احکام القرآن" کا جو حصہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے لکھوایا ہے، اس میں بھی ملکہ بلقیس کے واقعہ کے تحت یہ مسئلہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور مفتی صاحب نے خود حضرت تھانویؒ کے حوالے سے اس استدلال کو رد کیا ہے، کہ قرآن کریم نے ملکہ بلقیس کا واقعہ بیان کر کے اس پر کوئی نکیر نہیں کی۔

(احکام القرآن مفتی محمد شفیع جلد ۳، صفحہ ۲۹)

یہ تو ہے عورت کی سربراہی کے مسئلے میں حضرت تھانویؒ کا اصل موقف۔ اب رہی یہ بات کہ تھانوی صاحب نے امداد الفتاویٰ میں جمہوری حکومت کی سربراہی کے متعلق جواز کا جو فتویٰ دیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ واضح رہے کہ اصول شریعت کے ایک متفقہ اصول اور قاعدہ کے مطابق جب کہیں دلائل یا کسی کے اقوال میں بظاہر تناقض اور ٹکراؤ نظر آجائے، تو پہلے ان میں موافقت اور مطابقت کی صورت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اگر ایسی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو جو دلیل یا قول شرعی لحاظ سے قوی تر اور مضبوط ہو اسی کو ترجیح دی جاتی ہے اور دوسرا قول خود بخود متروک العمل ہو جاتا ہے۔

حضرت تھانویؒ کے دو مذکورہ اقوال میں تطبیق

حضرت تھانویؒ نے عورت کی سربراہی کے جواز کا جو قول اختیار کیا ہے، وہ یا تو اضطراری حالات کے پیش نظر اختیار کیا ہے، یا جمہوریت پرستوں کے ظاہری دعوؤں سے آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔

اضطراری حالات: یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریز سامراج مسلمان ریاستوں کو مختلف ہتھکنڈوں اور معمولی گڑبڑ کے بہانہ سے یکے بعد دیگرے ہڑپ کرتا چلا جارہا تھا۔

مثلاً ریاست بھوپال کے نواب نذر محمد ولد وزیر محمد خان نے ۱۸۱۶ء میں انگریزوں کے ساتھ ایک باقاعدہ معاہدہ کیا، جس کی رو سے انگریزوں نے ذمہ لیا کہ ریاست بھوپال کا

علاقہ نواب کے لئے اور اس کی اولاد کے لئے محفوظ رہے گا، اور اس کے بدلے میں نواب کی فوج، پنڈاریوں کے خاتمے میں انگریزوں کی مدد کرے گی ۱۸۲۰ء میں نواب کا انتقال ایسی حالت میں ہوا کہ اس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، صرف ایک چھوٹی بچی سکندر بیگم نواب کی وارث رہ گئی، معاہدہ کی رو سے ریاست کی ولایت سکندر بیگم کو منتقل ہونا تھی، لیکن چونکہ وہ ابھی چھوٹی تھی اس لئے اس کی ماں اور نواب کی زوجہ قدسیہ بیگم ریاست کی نگران منتظمہ بنی سکندر بیگم کی بلوغت کے بعد ۱۸۸۵ء میں وہی ریاست کی باقاعدہ والی بنی اس طرح یہ سلسلہ بیگمات ۱۹۴۶ء میں سلطانہ بیگم کے بیٹے اور آخری نواب حمید اللہ خان کی مسند نشینی پر ختم ہوا۔ (ہفت روزہ تکبیر کراچی ۱۵ دسمبر ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۱)

ان حالات اور سیاق و سباق میں مولانا تھانویؒ سے استفتاء پوچھا گیا کہ جب عورت کی سربراہی اسلام میں منع ہے، تو کیا مذکورہ رئیسات اس حکم میں داخل نہیں ہیں؟ عین ممکن ہے کہ اس استفتاء کے پیچھے بھی انگریزوں کا خفیہ ہاتھ ہو۔ تاکہ مذکورہ معاہدہ ختم ہو اور انگریز اس ریاست پر قبضہ کرسکے۔

مولانا تھانویؒ اور دیگر علماء نے مسلمانان ہندوستان کو بڑے شر (انگریزی حکومت) سے تحفظ دینے کی غرض سے چھوٹے شر (عورت کی حکمرانی) میں رہنے کو ترجیح دے کر مذکورہ فتویٰ دے دیا اور اس وقت کی سیاسی مصلحت کے پیش نظر اس جواز کی علت "اضطرار" کو ذکر نہیں کیا بلکہ عام اور مبہم الفاظ استعمال کئے۔ ظاہر ہے کہ شرعی لحاظ سے بھوکے مرنے والوں کو اپنی زندگی بچانے کے لئے خنزیر کا گوشت کھانے کا فتویٰ دیا جاسکتا ہے، لہٰذا کسی ایسے فتویٰ کو ایک عام اور مطلق فتویٰ قرار دیکر نسوانی اقتدار کا بہانہ بنانا غلط ہوگا۔

دوسری وجہ تطبیق اور سبب مغالطہ

ہر ایک کو معلوم ہے، کہ دین جمہوریت کے موجدوں نے جمہوریت کی مقبولیت کے

جھوٹے دعوے کا اتنا بھرپور پروپیگنڈہ کیا ہے کہ پوری دنیا کے خواص و عوام کو مغالطہ میں ڈال دیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ان کا یہ دعویٰ اور پروپیگنڈہ بھی ہے کہ جمہوریت میں حکومت عوام کی ہوتی ہے "عوامی حکومت" "عوام کی حکمرانی" جیسی اصطلاحات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ جمہوریت میں سربراہ، حاکم نہیں بلکہ عوام کا محکوم ہے، اسی اساس پر کہا جاتا ہے۔ کہ جمہوری حکومت کا سربراہ صرف ظاہراً اور نام کا حکمران کہلاتا ہے، درحقیقت وہ عوام یا عوام کے نمائندوں کا محکوم ہوتا ہے، اس کے اختیارات زیادہ سے زیادہ اتنے ہیں جتنے کہ ملک کے ایک عام باشندہ کے اختیارات یا کسی عام عوامی نمائندہ کے یعنی یہ کہ وہ محض ایک مشورہ یا تجویز پیش کر سکتا ہے، جس کے نفاذ کا اسے ذرہ بھر اختیار نہیں ہوتا۔ بلکہ قوت اور اتھارٹی صرف اور صرف عوام یا عوام کے نمائندوں کی اکثریت کے پاس ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر حقیقت میں ایسا ہی ہو تو جمہوریت کا سب سے بڑا سربراہ سب سے بڑھ کر محکوم ہوا چونکہ مولانا تھانویؒ کے زمانہ میں برصغیر میں دین جمہوریت کے متعلق اس قسم کے بے بنیاد اور جھوٹے دعوؤں کی تشہیر کا توزور تھا، مگر تاہنوز برصغیر میں خواص و عوام کو جمہوری حکومت کا تجربہ اور مشاہدہ نہیں ہوا تھا۔ کہ ان پر واضح ہو جاتا کہ "ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہیں"۔

اسی بنیاد پر حضرت تھانوی کو مغالطہ ہوا۔ اور جمہوری سربراہ کو حقیقی سربراہ نہ سمجھتے ہوئے انہوں نے اس منصب پر عورت کے بیٹھنے کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ نے اپنے مذکورہ فتویٰ میں بعینہٖ یہی دلیل پیش کی ہے کہ چونکہ جمہوری حکومت میں سربراہ محض ایک ظاہری سربراہ ہوتا ہے، حقیقی سربراہ اور حکمران نہیں ہوتا زیادہ سے زیادہ اس کی حیثیت ایک مشورہ دینے والے کی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی مذکورہ فتویٰ میں صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

"کسی عورت کی سلطنت جمہوری ہو تو اس میں والی صوری درحقیقت والی نہیں ہوتی

بلکہ ایک رکن مشورہ ہے"۔(امداد الفتاویٰ جلد ۵، صفحہ ۹۲)

حضرت تھانوی مزید لکھتے ہیں کہ عورت سے مشورہ لینا جائز ہے، آپ اسی فتویٰ میں لکھتے ہیں کہ جمہوری حکومت کے لئے عورت کی سربراہی اس لئے جائز ہے کہ اس کی حکمرانی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ محض مشورہ دے گی "راز اس میں یہ ہے کہ حقیقت اس کی حکومت کی" محض مشورہ کی ہے اور عورت اہل ہے مشورہ کی"۔(حوالہ مذکورہ)

مغالطے کی حقیقت

جبکہ دوسری طرف حقیقت کچھ اور ہے، کیونکہ دین جمہوریت میں خواہ وہ اشتراکی جمہوریت ہو یا سرمایہ دارانہ جمہوریت، عملاً اور حقیقتاً سربراہ حکومت یا سربراہ مملکت یعنی وزیراعظم اور صدر مملکت کسی بھی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یا ڈکٹیٹر سے کم نہیں ہوتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ مارشل لاء کو عوامی مارشل لاء جیسے خوشنما رنگ میں مسلط کیا جاتا ہے اور پارلیمانی نظام میں وزیراعظم اور صدارتی طرز حکومت میں صدر مملکت واحد حکمران بن جاتا ہے، پارلیمنٹ کی نیز پارلیمانی نظام میں وزیراعظم اور صدارتی نظام میں صدر مملکت پارلیمنٹ کو بیک جنبش قلم توڑ سکتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ حضرت تھانوی صاحب کے فتوے کے اقتباسات اس بات کی کھلی شہادت ہیں، کہ آپ عورت کی حقیقی سربراہی کو ناجائز اور موجب عدم فلاح ہونے کو تسلیم فرماتے ہیں، اور اس مسئلے میں آپ کو جمہور علماء اسلام سے کوئی اختلاف نہیں، لیکن جمہوری حکومت کے سربراہ کو آپ اپنی معلومات کے مطابق حقیقی سربراہ نہیں سمجھ رہے تھے۔ لہٰذا جمہور سے ان کا یہ اختلاف اصل مسئلے میں نہیں بلکہ جمہوری حکومت کی حقیقت میں ہے۔

جمہوری حکومت کے تین اہم اجزا

جمہوری حکومت میں بظاہر ریاست کے تین کام الگ الگ کردیئے جاتے ہیں۔
ایک کام قانون سازی، جو مقننہ یعنی پارلیمنٹ کے سپرد ہوتی ہے۔
دوسرا کام ملک کا انتظام چلانا جو انتظامیہ کے سپرد ہوتا ہے۔
تیسرا کام تنازعات کا فیصلہ جو عدلیہ کے سپرد ہوتا ہے۔

ریاست کے ان تین اداروں، مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ میں سے لفظ ''حکومت'' کا اطلاق انتظامیہ ہی پر ہوتا ہے، مقننہ اور عدلیہ ریاست (State) کے ذیلی ادارے ضرور ہیں، لیکن حکومت (Government) کا حصہ نہیں ہیں۔ حکومت صرف انتظامیہ ہی کو کہا جاتا ہے، اور وزیراعظم اس انتظامیہ کا سربراہ ہوتا ہے، اسے آئین کے دائرے میں رہتے ہوئے کاروبار حکومت چلانے کا مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے، نہ وہ ہر چیز کو مقننہ کے مشورے کے لئے پیش کرتا ہے، اور نہ اس کا پابند ہے، اہم انتظامی فیصلے وہ کابینہ کے سامنے رکھتا ضرور ہے، لیکن کابینہ کی رائے کا پابند نہیں، بلکہ کابینہ کے اجلاس میں اس کا فیصلہ حتمی حیثیت رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے بااختیار شخص کو محض ''رکن مشورہ'' نہیں کہا جاسکتا۔

پارلیمانی نظام حکومت میں وزیراعظم کی ایک اور اہم حیثیت بھی ہے، وہ یہ کہ پارلیمانی پارٹیوں کے مروجہ نظام نے اسے محض ''رکن مشورہ'' نہیں رہنے دیا بلکہ وہ پارلیمنٹ میں بھی برسر اقتدار اکثریتی پارٹی کا لیڈر اور قائد ایوان ہوتا ہے، لہٰذا پارلیمنٹ میں اس کی رائے محض ایک شخصی رائے اور مشورہ نہیں بلکہ ایوان کی اکثریت کی رائے سمجھی جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ اپنی جماعت کے ارکان کے لئے جب پارٹی کے نام سے کوئی ہدایت جاری کردے تو اس کی جماعت کے تمام ارکان پارلیمنٹ انہی احکامات کے مطابق اسمبلی میں ووٹ دینے کے پابند ہوتے ہیں، اگر کوئی سرپھرا رکن وزیراعظم کی ہدایت کے خلاف ووٹ استعمال کرے تو

اس کی رکنیت تک ختم کی جا سکتی ہے۔ پارلیمانی اصطلاح میں اس ہدایت کو "جماعتی کوڑا" (Party Whip) کہا جاتا ہے، یعنی اس کوڑے کو حرکت میں لانے کے بعد تمام پارٹی ارکان پارلیمنٹ میں وہی رائے دینے پر مجبور ہوں گے جس کے لئے وہ کوڑا حرکت میں لایا گیا ہے، اس اختیار کی بنا پر تو وزیر اعظم کو "قائد ایوان" کہا جاتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جو شخص یہ کوڑا حرکت میں لا سکتا ہو اس کو محض ایک "رکن مشورہ" نہیں کہا جا سکتا، بلکہ وہی سب کچھ ہے دیگر جماعتی ارکان پارلیمنٹ در حقیقت ربڑ کی مہروں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، جو کہ وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ وہ جہاں اور جس رائے پر ثبت کرنا چاہے ان مہروں کو ثبت کر دیتا ہے۔ یہ تو اس جمہوری حکومت کی حقیقت ہے، جو کہ جمہوریت کے قوانین کا پاس رکھنے کا رضاکارانہ جذبہ رکھتی ہے۔ ورنہ جمہوریت میں "حکمرانی" عملی میدان میں کسی بھی سفاکانہ ملوکیت سے کم نہیں، میرے اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے کتاب ھذا کا ابتدائی حصہ دیکھئے وہاں کی واقعاتی اور تاریخی شہادتوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ جمہوری حکومت میں عدلیہ کی آزادی، پریس کی آزادی اور شخصی آزادی وغیرہ آزادیاں صرف کاغذی اور زبانی ہیں، عملی میدان میں یہ تمام آزادیاں سربراہ حکومت کی مرضی کی دست نگر اور مرہون منت ہیں، اس طرح سربراہ حکومت در حقیقت ایک خودسر ڈکٹیٹر ہی ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے تو شاعر مشرق علامہ محمد اقبال نے جمہوری حکومت کو "دیو استبداد" "چنگیزیت" "اندرون تاریک تر" جیسے القاب سے نوازا ہے۔

حضرت تھانویؒ کے زمانہ میں برصغیر میں جمہوری حکومت کے متعلق کاغذی اور زبانی پروپیگنڈہ اور چرچا یقیناً ہو گا، یعنی یہ کہ جمہوریت "عوام کی حکمرانی" اور "عوام کی حکومت" ہے۔ لیکن عملی میدان میں کسی کو اس ملوکیت اور آمریت کا مشاہدہ نہ تھا، اس لئے آپ نے مذکورہ فتویٰ دے دیا۔ اگر حضرت تھانویؒ کے سامنے جمہوری حکومت اور اس کے

سربراہ کی یہ کارگزاریاں ہوتیں، جن کا نصف صدی سے برصغیر میں ہم مشاہدہ کر رہے ہیں، تو یقیناً جمہوری حکومت کی سربراہی کے متعلق آپ کا فتویٰ کچھ اور ہوتا۔

ان تمام حقائق کے باوجود اگر کوئی شخص حضرت تھانویؒ کے مذکورہ فتویٰ کے متعلق کوئی بھی تاویل تسلیم نہیں کرتا تو ایسے شخص کا جواب یہی ہے کہ اسلامی اصول اور قوانین کی رو سے حضرت تھانویؒ کا وہی اول فتویٰ جو "بیان القرآن" اور "احکام القرآن" کے حوالے سے ذکر ہوا ہے، دلائل اور جمہور علماء سے موافقت کی بناپر واجب الاتباع ہے، اور دوسرا قول جو "امداد الفتاویٰ" کے حوالہ سے ذکر ہوا ہے دلائل کی رو سے اور جمہور امت سے اختلاف اور شذوذ کی بناپر مرجوح اور واجب الترک اور تفرد سمجھا جائے گا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک عورت کے قاضی بنانے کے جواز سے استدلال

عورت کی سربراہی کے متمنی حضرات کو جب قرآن وسنت سے کوئی دلیل ڈھونڈ نکالنے میں بری طرح ناکامی ہوئی تو غیر متعلقہ دلائل کی تلاش کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ مثلاً یہ کہ احناف کے نزدیک ایک محدود دائرہ کے اندر عورت کو قاضی بنانے کی گنجائش ہے، اس لئے عورت کو حکومت کا سربراہ بنانا بھی جائز ہے۔ حالانکہ باوجود اس کے کہ احناف کے نزدیک کسی ایسے تنازعہ اور مقدمہ میں (جس میں عورت کی شہادت جائز ہو) کسی مسلمان متقی اور اصول شریعت کی پابند عورت کو قاضی یا حکم بنانا جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ عین شریعت اسلامی کے مطابق فیصلہ کرے، مگر پھر بھی مذہب حنفی میں وہ شخص یا افراد جنہوں نے عورت کو ایسے محدود مسئلے میں قاضی بنایا ہے گناہگار ہونگے۔

صاحب در مختار تحریر فرماتے ہیں:

قوله (المرأة تقضى فى غير حدود وقود وان اثم المولى) لخبر البخارى لن يفلح قوم ولو امرهم امرأة) (شامی جلد ۴، صفحہ ۳۹۵ قبیل مسائل شتی)

"عورت حدود اور قصاص کے علاوہ قاضی بن سکتی ہے، اگرچہ قاضی بنانے والا گناہگار ہوگا، بوجہ حدیث بخاری کے کہ وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جس نے اپنے امر کا والی عورت کو بنادیا"۔

علامہ ابن الھمام "صاحب فتح القدیر" امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

نسب علیہ ﷺ لمن یولیھن عدم الفلاح فکان الحدیث متعرضا للمولین ولھن بنقص الحال وھذا حق لکن الکلام فیما لو ولیت فقضت بالحق لماذا یبطل الحق. (فتح القدیر جلد ۵، صفحہ ۴۸۶)

"حضور علیہ السلام نے فلاح نہ پانے کی نسبت ان لوگوں کی طرف کی ہے، جنہوں نے عورت کو کسی امر کا والی بنادیا۔ اور عورتوں کی طرف نسبت ہے ان کے نقص حال کے لحاظ سے اور یہ بات حق ہے، لیکن بحث اس میں ہے کہ اگر کسی عورت کو قاضی بنادیا گیا اور اس نے برحق فیصلہ کر لیا تو کیا اس کے برحق فیصلہ کو باطل تصور کیا جائے"۔

دیکھئے صاحب فتح القدیر اور صاحب در مختار نے امام ابو حنیفہؒ کا مذہب بالکل واضح کردیا کہ عورت کو قاضی بنانے کا مسئلہ در حقیقت دو شقوں پر مشتمل ہیں۔

ایک شق یہ ہے، کہ عورت کو منصب قضاء پر فائز کرنا اور اسے یہ عہدہ سپرد کرنا مسلمانوں کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

تو اس مسئلہ میں حضرت امام ابو حنیفہؒ امت کے جمہور علماء کے ساتھ متفق ہیں، کہ عورت کو قضا کا عہدہ سپرد کرنا گناہ اور معصیت ہے۔ اور سبب عدم فلاح ہے، جس پر صاحب "فتح القدیر" اور "در مختار" کے مذکورہ اقتباسات گواہ ہیں۔

دوسری شق یہ ہے کہ اگر عورت کو عہدہ قضا سپرد کیا گیا اور اس نے کسی تنازعہ میں قرآن وسنت کے عین مطابق مبنی برحق فیصلہ کردیا تو کیا یہ فیصلہ ایک معتبر اور قابل قبول

فیصلہ تصور کیا جائے گا یا اسے کالعدم اور باطل فیصلہ سمجھا جائے گا؟

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ جب ایک حقیقت وجود میں آچکی ہے، یعنی قرآن وسنت کے مطابق ایک حق فیصلہ وجود میں آچکا ہے، تو اسے کیونکر ناحق فیصلہ اور کالعدم قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ شریعت کی طرف سے اس فیصلے کو حق فیصلہ سمجھنے سے کوئی مانع موجود نہیں، اس کے برعکس حدود اور قصاص کے بارے میں مانع موجود ہونے کی وجہ سے فیصلہ کی قبولیت قابل تامل ہے۔ رہی یہ بات کہ حدیث کی رو سے عورت کو ابتداءً قاضی نہیں مقرر کرنا چاہئے تو یہ بالکل مسلّم ہے مگر وہ الگ مسئلہ ہے۔

علامہ ابن الھمام کی وضاحت سے معلوم ہوا کہ نہ تو امام ابو حنیفہؒ عورت کو منصب قضا پر متعین کرنے کے قائل ہیں، اور نہ ایسا کرنا جائز قرار دیتے ہیں بلکہ اس مسئلہ میں آپ کا مسلک وہی ہے جو ائمہ ثلاثہ اور جمہور علماء کا ہے، البتہ امام ابو حنیفہؒ کو ائمہ ثلاثہ سے اس میں اختلاف ہے کہ ائمہ ثلاثہ عورت کا حق فیصلہ بھی ناحق اور کالعدم قرار دیتے ہیں، اور امام ابو حنیفہؒ اس فیصلہ کو معتبر قرار دیتے ہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شخص نے ایک ناجائز فعل کیا مثلاً کسی کو جانی یا مالی نقصان پہنچایا تو اگرچہ اس شخص کو ایسا کرنا جائز نہ تھا مگر جب کر لیا تو شریعت کی رو سے وہ کام اور اس کے نتائج کالعدم قرار نہیں دیئے جاسکتے ہیں، بلکہ اس کا اعتبار کیا جاتا ہے اور اس پر متعلقہ شرعی احکامات لاگو ہوں گے۔

اب انصاف کیجئے کہ اس مسئلہ قضاً کے بارے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب سے کہیں دور دور سے بھی عورت کی سربراہی کے جواز کا کوئی تعلق ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو کوئی حنفی المذہب عالم دین یا فقیہ ضرور کہیں تو لکھ دیتا۔ کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اس موقف سے عورت کی سربراہی کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

؎ بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی ست

جمعیت العلماء اسلام کی طرف فاطمہ جناح کی حمایت کرنے کی غلط نسبت

بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں جب عورت کی سربراہی کا مسئلہ ہر خاص و عام کے لئے موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ تو کئی اخبارات میں مضامین شائع ہوئے کہ صدر ایوب خان مرحوم کے مقابلہ میں جب فاطمہ جناح صدارت کی امیدوار بنیں تو اس وقت جمعیت العلماء اسلام نے اس کی حمایت کی۔ حالانکہ یہ سفید جھوٹ ہے۔ کیونکہ بالخصوص اس صدارتی انتخاب کے مسئلے پر غور و خوض کرنے کے لئے ملک بھر سے جمعیت العلماء اسلام کے چیدہ چیدہ علماء کرام کا ایک ہنگامی اجلاس ملتان میں مدرسہ قاسم العلوم کچہری روڈ کے مقام پر طلب کیا گیا تھا، جس میں راقم الحروف خود حاضر تھا مسلسل دو دن تک اس پر غور و خوض ہوتا رہا اور تیسرے دن حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی صاحب امیر جمعیت العلماء اسلام اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے جلالی انداز میں فرمانے لگے۔ "میں رات بھر استخارہ کرتا رہا اور ہر بار مجھے بتایا گیا کہ دونوں فریق جہنم کے راستہ پر گامزن ہیں لہذا ہمیں چاہئے کہ کسی ایک فریق کا بھی ساتھ نہ دیں اور غیر جانب دار رہیں"۔

چونکہ جمعیت کے اکابرین شرعی دلائل کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ صدر ایوب خان میں سوائے اس کے کہ وہ مرد ہے فاطمہ جناح کی نسبت سے اور کوئی خوبی نہیں اور فاطمہ جناح میں سوائے اس کے کہ وہ عورت ہے صدر ایوب خان کے مقابلہ میں کوئی عیب نہیں اور از روئے اسلام عورت کی سربراہی جائز نہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی مدظلہ العالی کے مذکورہ خطاب پر متفقہ فیصلہ ہوا کہ جمعیت اس صدارتی انتخاب میں کسی ایک فریق (صدر ایوب خان اور فاطمہ جناح) کی بھی حمایت نہیں کرے گی بلکہ قطعی طور پر غیر جانب دار رہے گی۔

پاکستان کے علماء کا اجماع کہ عورت کی سربراہی جائز نہیں

خواجہ ناظم الدین کے دور حکومت ۱۹۵۱ء میں پاکستان بھر کے جملہ مکاتب فکر کے چیدہ چیدہ نمائندہ علماء کرام نے اس وقت کے سربراہ حکومت خواجہ ناظم الدین کے اس اعلان کے جواب میں کہ "اگر علماء دین کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں شریعت کے کسی ایک فارمولے اور بل پر متفق ہو جائیں تو میں بلا تاخیر شریعت کے نفاذ کا اعلان کر دوں گا" ایک متحدہ محاذ بنایا گیا اور ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ملک بھر میں کلمہ گو اور ختم نبوت پر ایمان رکھنے والوں کو بھی متحد کرنے کے لئے مشترکہ جلسے اور جلوسوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ پوری قوم نے علماء کے اس اتحاد کی متفقہ منظوری دی یہاں تک کہ ملتان کے قاسم باغ میں ایک عظیم جلسہ ہوا، اس جلسے میں میں خود حاضر تھا امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری مرحوم جلسہ سے خطاب فرما رہے تھے، اور شیعہ فرقہ کے مشہور روحانی پیشوا سید گردیزی صاحب صدر جلسہ تھے۔

اس طرح ان بتیس نمائندہ علماء کرام نے اسلامی دستور کے لئے بطور اصول بائیس نکات مرتب فرما کر خواجہ ناظم الدین کو پیش کئے جن میں سے بارھویں دفعہ حسب ذیل ہے:

"(۱۲) رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے"۔

جن علماء نے ان بائیس بنیادی نکات کو مرتب کر کے ان پر اپنے دستخط ثبت کئے۔ ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت علامہ مولانا سید سلیمان ندوی صدر مرکزی جمیعت العلماء اسلام وصدر تعلیمات اسلامی بورڈ دستور ساز اسمبلی پاکستان

۲۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب نائب صدر مرکزی جمیعت علماء اسلام و مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور

۳۔ حضرت مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد صاحب صدر مرکزی جمیعت العلماء پاکستان

۴۔ حضرت مولانا داؤد غزنوی صدر جمیعت اہل حدیث مغربی پاکستان

۵۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نائب صدر مرکزی جمیعت العلماء اسلام

۶۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری امیر انجمن خدام الدین لاہور

۷۔ حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان

۸۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نائب صدر مرکزی جمیعت العلماء اسلام و رکن تعلیمات اسلامی بورڈ دستور ساز اسمبلی پاکستان و سرپرست دار العلوم کراچی

۹۔ حضرت مولانا شمس الحق افغانی وزیر معارف ریاست قلات

۱۰۔ حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی صدر جمیعت العلماء پاکستان سندھ

۱۱۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

۱۲۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحب مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان

۱۳۔ حضرت مولانا حاجی محمد امین صاحب خلیفہ حاجی ترنگ زئی مرحوم پشاور سرحد

۱۴۔ حضرت مولانا اطہر علی صاحب صدر جمیعت علماء اسلام مشرقی پاکستان

۱۵۔ حضرت مولانا ابو جعفر محمد صالح صاحب (پیر سرسینہ) صدر مرکزی جمیعت العلماء اسلام و امیر جمیعت حزب اللہ مشرقی پاکستان

۱۶۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی ناظم جمیعت اہل حدیث پاکستان

۱۷۔ حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب جامعہ دینیہ دار الہدیٰ ٹھیڑھی خیر پور میرس سندھ

۱۸۔ حضرت مولانا محمد صادق صاحب مہتمم مدرسہ مظہر العلوم کھڈا کراچی

۱۹۔ حضرت مولانا شمس الحق صاحب فریدپوری پرنسپل جامعہ قرآنیہ ڈھاکہ

۲۰۔ حضرت مولانا پیر محمد ہاشم جان صاحب مجددی سرہندی ٹنڈو سائیں داد حیدر آباد

۲۱۔ مولانا مفتی محمد صاحبداد صاحب کراچی

۲۲۔ حضرت مولانا راغب احسن صاحب ایم اے، نائب صدر جمعیت العلماء اسلام مشرقی پاکستان

۲۳۔ حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب نائب صدر جمعیت المدرسین سرسینہ شریف مشرقی پاکستان

۲۴۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی نائب صدر مرکزی جمعیت العلماء اسلام وصدر جمعیت اہل حدیث

۲۵۔ حضرت مولانا کفایت حسین صاحب مجتہد ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان

۲۶۔ حضرت مولانا مفتی جعفر حسین صاحب مجتہد رکن تعلیمات اسلامی بورڈ دستور ساز اسمبلی پاکستان

۲۷۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری شیخ التفسیر دار العلوم اسلامیہ ٹنڈوالٰہیار سندھ

۲۸۔ حضرت مولانا محمد علی جالندھری صاحب صدر مجلس احرار اسلام پاکستان

۲۹۔ حضرت مولانا امین الحسنات صاحب پیر مانکی شریف نائب صدر مرکزی جمعیت العلماء اسلام

۳۰۔ جناب قاضی عبدالصمد صاحب سربازی قاضی قلات

۳۱۔ جناب مولانا احتشام الحق صاحب مہتمم دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈوالٰہ یار و خطیب جامع مسجد جیکب لائن کراچی

۳۲۔ مولانا ظفر احمد صاحب انصاری سیکریٹری تعلیمات اسلامی بورڈ، دستور ساز اسمبلی پاکستان

گویا کہ یہ علماء پاکستان اور پاکستانی عوام کا جدید ترین اجماع ہے، جو کہ ۱۹۵۱ء میں عورت کی سربراہی کے عدم جواز پر بلا نکیر منعقد ہو چکا ہے۔

مختلف شکوک وشبہات کا جامع جواب

مسلمانوں کی تاریخ میں مخصوص حالات میں چند ایسی مثالیں ضرور موجود ہیں، کہ عورتوں نے ریاست کی سربراہی کا عہدہ سنبھالا ہے، جن کی حکمرانی سے یار لوگ بے نظیر صاحبہ کی حکمرانی کے لئے سند اور جواز پیش کرتے ہیں، مثلاً "شجرۃ الدرر" "رضیہ سلطانہ" "چاند بی بی" یا ریاست بھوپال کی بیگمات اور شاید آئندہ نسلوں میں بے نظیر کی حکمرانی کو عورت کی سربراہی کے جواز کے لئے دلیل اول کے طور پر پیش کیا جائے۔

مگر یاد رہے کہ ان جزوی واقعات کے متعلق اتنی بات تو صحیح ہے کہ یہ عورتیں مسلمانوں کی حکمران بنیں، مگر کبھی بھی متدین مسلمانوں اور علماء اسلام نے ان کی حکمرانی اسلامی شریعت کی رو سے جائز قرار نہیں دی، بلکہ علماء اسلام اور متدین مسلمانوں نے ان کے خلاف ہر دور میں مسلسل جدوجہد جاری رکھی یہاں تک کہ وہ رئیسات بدترین اور بھیانک انجام سے دوچار ہوئیں۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ ہر دور میں مسلمانوں کے اندر اسلامی احکامات کی شدید ترین نافرمانیاں اور قطعی حرام افعال کا ارتکاب ہوتا رہتا ہے مثلاً شراب پینا، رشوت خوری، قحبہ خانے، سود، قمار، سینمابینی، وی سی آر اور رقص وسرور کی محفلیں، اگر ان غیر اسلامی افعال کے جواز کے لئے مسلمانوں کا عمل دلیل نہیں بن سکتا اور یقیناً نہیں بن سکتا، تو کسی عورت کو سربراہ بنانے کے لئے مسلمانوں کا عمل کیونکر دلیل بن سکتا ہے؟

البتہ جب کسی امر کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں شریعت کی طرف سے صریح احکامات موجود نہ ہوں تو ایسی صورت میں خدا ترس اور حقیقی مسلمانوں کا عمل بطور دلیل پیش کیا جاسکتا ہے، مگر عورت کی سربراہی کے عدم جواز کے بارے میں تو شریعت کی طرف سے صریح احکامات موجود ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس لئے کسی قوم کی طرف سے عورت کو

حکومت وغیرہ کی سربراہی کا عہدہ سپرد کرنا جواز کی دلیل نہیں بن سکتا۔

البتہ ان مذکورہ چند عورتوں کی سربراہی کے انجام نے حضور علیہ السلام کے مذکورہ فرمان کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کردی کہ "وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی، جس نے اپنے امور کی سربراہی عورت کے سپرد کی"۔

"لن یفلح" کی حقیقت شریعت اسلامی کی نگاہ میں

"فلاح" یا "عدم فلاح" یعنی "کامیابی" یا "ناکامی" کے الفاظ لوگوں کی اصطلاح میں عموماً دنیاوی کامیابی وکامرانی اور ترقی کے لئے یا دنیاوی نامرادی، ذلت وپستی کے لئے بولے جاتے ہیں جو کہ لغوی اعتبار سے بھی صحیح ہیں۔

مگر شریعت اسلامی اور قرآن کریم میں یہی الفاظ عموماً اخروی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن کریم میں ف، ل، ح کے مادے سے بنے ہوئے الفاظ مختلف صیغوں اور لفظی شکلوں میں (مثلاً "افلح، تفلحون، مفلحون، یفلحون، یفلح، لا یفلح، لا یفلحون) تقریباً چالیس مقامات پر آچکے ہیں۔ ہر مقام پر یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے آخرت ہی کی کامیابی وناکامی کے مفہوم میں استعمال فرمائے ہیں۔

الذین یقیمون الصلوۃ ویوتون الزکوۃ وھم بالآخرۃ ھم یوقنون٥

اولئك علی ھدی من ربھم واولئك ھم المفلحون٥

(پارہ:۲۱، س۳۱، آیت:۵)

"وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوۃ دیتے ہیں، اور آخرت پر بھی ایمان ویقین رکھتے ہیں، یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں، اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

دیکھئے یہاں قرآن کریم ان لوگوں کو کامیاب وکامران قرار دے رہا جو صلوٰۃ وزکوٰۃ

کی پابندی کے ساتھ ساتھ صاحب ایمان بھی ہوں۔

ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولئك ھم المفلحون ○ (پارہ:۴، س۳، آیت: ۱۰۴)

"اور چاہئے کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو نیک کام کی طرف بلاتی رہے، اور نیکی کا حکم کرتی رہے، اور برے کاموں سے روکتی رہے، اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

دیکھئے یہاں قرآن کریم ان لوگوں کو فلاح پانے والے قرار دیتا ہے، جنہوں نے دعوت الی اللہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اپنایا ہو۔

انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا واولئك ھم المفلحون ○

(پارہ:۱۸، س۱۳، آیت:۵۱)

"مومنوں کی بات تو یہی ہوتی ہے کہ جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے، تاکہ وہ ان کے آپس کے تنازعات کا فیصلہ کرے تو وہ کہتے ہیں، کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا اور وہی لوگ فلاح و نجات پانے والے ہیں"۔

تشریح : یہاں اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کو نجات اور فلاح پانے والے ٹھہرایا جو قانون شریعت پر اپنے آپس کے تنازعات کا تصفیہ کرتے ہیں۔

فالذین آمنوا به وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معه اولئك ھم المفلحون ○ (پارہ:۹، س۷، آیت:۱۵۷)

پس جو لوگ اس (پیغمبر خدا) پر ایمان لائے اور اس کی حمایت کی اور اس کی مدد کی اور اس نور (قرآن) کے تابع ہوئے جو اس کے ساتھ بھیجا گیا ہے،

یہی لوگ فلاح و نجات پانے والے ہیں"۔

اس آیت کریمہ میں نجات اور کامیابی کے لئے اللہ تعالیٰ نے پورے قرآنی نظام پر عمل کو شرط قرار دیا ہے۔

فمن ثقلت موازینه فاولئك هم المفلحون ○

(پارہ:۸، س ۷، آیت:۹)

"قیامت کے دن جس شخص کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو گا سو وہی لوگ کامیاب ہیں"۔

ان آیات میں کامیاب اور ناکام ہونے کا فیصلہ کن معیار متعین کیا گیا، نیز ان تمام آیات قرآنی میں کامیاب زندگی گذارنے اور فلاح پانے والے وہی لوگ قرار دیئے گئے جنہیں آج کل کی ترقی پسند دنیا پس ماندگی کی علامت کے طور پر رجعت پسند، قدامت پرست اور بنیاد پرست کے القاب سے نوازتی ہے، پس ثابت ہوا کہ اسلام میں فلاح اور کامیابی کا مفہوم آخرت کی کامیابی اور نجات ہے۔

یا ایها الذین آمنوا لا تاکلوا الربو اضعافا مضاعفة واتقوا الله لَعَلَّكُمْ تفلحون ○ (پارہ:۴، س ۳، آیت:۱۳۰)

"اے ایمان والو! سود، دونے پر دونا مت کھاؤ (یعنی اصل سے کئی حصے زائد کر کے) اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پالو"۔

آپ نے دیکھا کہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فلاح یافتہ اور کامیاب زندگی کے لئے سود سے اجتناب کو شرط قرار دیتے ہیں، جب کہ تقریباً پوری دنیا اس دنیاوی زندگی کو کامیاب اور فلاحی زندگی بنانے کے لئے سودی نظام کو شرط اول سمجھتی ہے۔

انما الخمر وَالْمَيْسِرُ والانصاب والازلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون ○ (پارہ:۷، س ۵، آیت:۹۰)

"بے شک شراب پینا، جوا کھیلنا، بت اور فال نکالنے کے تیر، سب کے سب شیطان کے گندے اور پلید اعمال ہیں پس ان سے دور رہو تاکہ فلاح پاؤ"۔

دیکھئے دنیا جس چیز پر مر مٹنے کو ترقی، عیش و عشرت اور کامرانی کا منتہا سمجھتی ہے، اسی چیز سے دوری اور اجتناب کو اللہ تعالیٰ کامیاب اور فلاحی زندگی کی اساس قرار دیتا ہے۔

ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن (الی) لعلکم تفلحون ۝ (پارہ:۱۸، س ۲۴، آیت:۳۱)

"اور عورتیں اپنے پاؤں زمین پر زور سے نہ ماریں تاکہ ان (عورتوں) کا مخفی زیب و زینت معلوم ہو جائے (تا) تاکہ تم فلاح پاؤ"۔

آپ نے دیکھا کہ آج جب دنیا عورتوں کی نازک خرامی، رفتار کی جاذبیت، رقص و پاکوبی کو کامیابی و کامرانی کا معراج قرار دیتی ہے، عین انہی چیزوں کو اللہ تعالیٰ ناکامیوں کی دہلیز قرار دیتا ہے، اور ان سے اجتناب کرنے والوں کو کامیاب اور فلاح پانے والے قرار دیتا ہے۔

قد افلح من زکھا ۝ وقد خاب من دسھا ۝

(پارہ:۳۰، س ۹۱، آیت:۱۰)

"تحقیق فلاح پائی اس نے جس نے نفس کو پاک و صاف کیا اور ناکام ہوا وہ جس نے نفس کو گناہ آلود کیا"۔

ناکام لوگ

آئندہ چند آیات میں ان لوگوں کی چند صفات سنئے جنہیں قرآن کریم نے واضح الفاظ میں ناکام اور نامراد قرار دیا ہے۔

انہ لا یفلح الکافرون ۝

(پارہ:۱۸، س ۲۳، آیت:۱۱۷)

"تحقیق کافر لوگ فلاح نہیں پائیں گے"۔

انہ لا یفلح الظالمون○

(پارہ: ۷، س ۶، آیت: ۲۱)

"تحقیق ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے"۔

انہ لا یفلح المجرمون○

(پارہ: ۱۱، س ۱۰، آیت: ۱۷)

"تحقیق جرم کرنے والے فلاح نہیں پائیں گے"۔

لا یفلح الساحرون○

(پارہ: ۱۱، س ۱۰، آیت: ۷۷)

"جادوگر فلاح نہیں پائیں گے"۔

قل ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون○

(پارہ: ۱۱، س ۱۰، آیت: ۶۹)

"آپ کہدیں بے شک وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں فلاح نہیں پائیں گے"۔

ان تمام آیات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، کہ شریعت کی اصطلاح میں جن لوگوں کو فلاح یافتہ، کامیاب اور کامران بتایا گیا ہے وہ دنیاوی زندگی میں مادی لحاظ سے عموماً ان صفات کے مصداق نہیں ہیں۔ اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ناکام ونامراد بتایا ہے، وہ لوگ دنیاوی زندگی اور مادی لحاظ سے ترقی وکامرانی کے بام عروج پر ہیں، ان حقائق اور مشاہدات کے پیش نظر، یہ امر قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ شریعت کی اصطلاح میں "فلاح" اور "عدم فلاح" سے مراد آخرت کی کامیابی اور ناکامی ہی ہے، اس تعین اور وضاحت کے بعد عورت کی حکمرانی کے متعلق جو شکوک وشبہات مغرب زدہ طبقہ

پیش کرتا ہے، کہ فلاں قوم کے حاکم و محکوم عورت کی سربراہی میں ترقی و کامیابی کی چوٹی پر جا پہنچے۔ اگر ان کا یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی حضور علیہ السلام کی مذکورہ حدیث "وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے عورت کو سربراہ بنادیا" پر انگشت برداری کا حق کسی کو نہیں ہے، اس لئے کہ حدیث میں "عدم فلاح" سے مراد آخرت کی زندگی میں ناکامی ہی ہے جو کہ یقینی امر ہے۔

شریعت نے اخروی فلاح کا مذکورہ مفہوم ذہن نشین کرانے کے لئے پنج وقتہ نماز اور مسجد کی طرف دعوت کے لئے اذان واقامت میں "حی علی الفلاح" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خدشہ پیدا ہو کہ حضور علیہ السلام نے حضرت ابو بکر کی نقل کردہ حدیث میں عورت کو سربراہ بنانے والی ایرانی قوم کے بارے میں فرمایا تھا، کہ "ایسی قوم ہرگز فلاح نہیں پائیگی جس نے اپنے امور کے اختیارات عورت کے سپرد کئے" اس عدم فلاح سے دنیاوی عدم فلاح ہی مراد ہے اس لئے کہ اگر اس سے اخروی عدم فلاح مراد لی جائے تو "تحصیل حاصل" ہو گا جو کہ باطل ہے، کیونکہ یہ قوم اپنے کفر کے سبب آخرت میں تو بلاریب ناکام ہی تھی تو مزید ناکامی کیا معنی رکھتی ہے۔

مگر یہ خدشہ درست نہیں اس لئے کہ جیسے فلاح اور کامیابی کے متعدد درجات ہیں۔ اوّل درجہ ایمان ہے اور اس کے بعد متعدد درجات ہیں جن کے حصول کے لئے مختلف اعمال صالح کی پیروی شرط ہے اور اسی تعدد درجات پر مذکورہ آیت قرآنی گواہ ہیں، اسی طرح عدم فلاح اور ناکامی کے بھی متعدد درجات ہیں، جن میں اولین درجہ اور سبب، کفر ہے اس کے بعد ظلم، سحر، جرم اور عورت کی سربراہی ہے، جیسا کہ سابقہ بیان کی ہوئی آیات سے یہی ثابت ہوتا ہے مثلاً ایک شخص کافر بھی ہے، ظالم بھی اور ساحر وغیرہ بھی ہے۔ اب یہ شخص

(لا یفلح الکافرون، لا یفلح الظالمون، لا یفلح الساحرون) تینوں قسم کی عدم فلاح کا مصداق ہے، مگر پھر بھی تحصیل حاصل نہیں ایسے ہی ایرانی قوم کفر کے سبب بھی اور عورت کی سربراہی کے سبب بھی دوہرے عدم فلاح کی مستحق بنی۔ لہٰذا یہ تحصیل حاصل نہیں ہے۔

باب دوازدہم

اسلام میں سربراہ کے انتخاب کا طریقہ

دین اسلام میں سربراہی کا عہدہ چونکہ درحقیقت حضور کی جانشینی اور نیابت کی ذمہ داری ہے۔ اس لئے اصل اہمیت سربراہ کی اہلیت ہی کو حاصل ہے، جب سربراہ میں مذکورہ بالا اوصاف اوروں کی بہ نسبت بدرجہ اتم موجود ہوں گی تو دین اسلام کے تقاضے پورے ہوں گے خواہ یہ انتخاب نامزدگی کی بنیاد پر وجود میں آیا ہو یا اہل حل و عقد (وکیلان قوم اور نمائندگان قوم) کے مشورہ سے وجود میں آیا ہو۔ غرض یہ کہ اسلام طریقہ انتخاب کو نہیں دیکھتا بلکہ منتخب کردہ شخص کو دیکھتا ہے۔ خیر القرون کے خلفاء کے طریقہ انتخاب میں کوئی ایک خاص طریقہ انتخاب دیکھنے میں نہیں آتا: آیا جو مذکورہ بات کی واضح دلیل ہے۔

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب

حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد اور تدفین سے پہلے حضرت سعد بن عبادہؓ نے انصار کو سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع کیا۔ تاکہ وہ حضرت سعدؓ کو خلیفہ مقرر کرلیں جب یہ خبر حضور علیہ السلام کی تکفین و تجہیز میں مصروف مہاجرینؓ تک پہنچی تو حضرت عمرؓ نے ابو بکر صدیقؓ سے عرض کیا کہ ہمیں انصار بھائیوں کے پاس لے چلو چنانچہ ابو بکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، ابو عبیدہؓ بن الجراح، چار، پانچ مہاجرین وہاں جا پہنچے، اور حضور علیہ السلام کی تجہیز و تکفین کے لئے حضرت علیؓ اور دیگر اہل بیت رضی اللہ عنہم رہ گئے، سقیفہ میں کافی بحث و مباحثہ کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ کو افضلیت اور اہلیت کی اساس پر خلیفہ منتخب کرلیا گیا (تفصیل معلوم کرنے کے خواہش مند علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی کی تالیفات کی طرف رجوع

فرمائیں۔)

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا انتخاب

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آپؓ کو نامزد کیا اور چند بڑے صحابہؓ کو جنہیں حضرت عمرؓ کی سختی کے متعلق کچھ شکایات تھیں مطمئن کر لیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب

عمر فاروق نے آخری وقت میں فرمایا کہ اگر میں کسی کو نامزد کرنا چاہوں تو بھی میرے لئے راہ صاف ہے، کیونکہ مجھ سے بہتر (ابو بکرؓ) نے ایسا کیا اور اگر میں لوگوں کے مشورہ پر اس امر کو چھوڑ دوں تو حضور علیہ السلام نے ایسا ہی کیا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے عثمانؓ، علیؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عبد الرحمان بن عوفؓ پر مشتمل ایک کمیٹی نامزد کی اور حکم دیا کہ یہ چھ آدمی خود اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ مقرر کر لیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت مقدادؓ کو حکم دیا کہ یہ چھ امیدوار (ابن عمر کی بطور رائے دہندہ موجودگی میں) کسی ایسی جگہ اجلاس کریں جہاں کسی غیر کو آنے جانے کی اجازت نہ ہو اور ان لوگوں کو تین دن کے اندر اندر کسی کو لامحالہ خلیفہ منتخب کرنا ہو گا۔ حضرت عمرؓ کی تدفین کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مکان یا بقول بعض حضرات مسور ابن مخرمہؓ کے مکان میں اس کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا اور حضرت مقدادؓ اور حضرت ابو طلحہ انصاریؓ نے (۵۰ جوانوں) کا پہرہ مکان کے باہر بٹھا دیا کمیٹی کے چھ ارکان میں سے زبیرؓ، علیؓ کے حق میں طلحہؓ عثمانؓ کے حق میں اور سعدؓ، عبد الرحمان کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوئے، اور پھر عبد الرحمان بن عوفؓ نے خود خلافت سے دست بردار ہوتے ہوئے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ سے کہا کہ مجھے اختیار دو میں تم دونوں میں سے جس کسی کو ملت کے دین و دنیا کے مفاد کی خاطر منتخب کروں تو

دوسرے کو قبول ہو گا چنانچہ دونوں نے عہد کیا اس کے بعد اجلاس برخاست ہوا اور عبد الرحمان بن عوفؓ تین دن اور رات مسلسل اکابر اہل رائے سے رائے طلب کرتے رہے، حتیٰ کہ پردہ نشین عورتوں اور چرواہوں سے بھی رائے لی اور آخر کار حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اعلان کیا۔

حضرت علی ﷺ کا انتخاب

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہنگامی حالات میں باغیوں کے جبر سے ابتداءً عمل میں آیا جب کہ خود حضرت علیؓ یہ منصب نہیں چاہتے تھے۔ البتہ بعد میں صحابہ کی تائید و تصویب سے کار خلافت ان کے سپرد کر دی گئی۔

مولانا عبدالرحمان اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"اشتر" نامی شخص جو کہ باغیوں کا سرخیل تھا، نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑا اور انہیں قابو کیا اور تین بار کہا اے خائن! خدا کی قسم اگر تو نے اس امارات کو ترک کیا تو ابھی تمہاری آنکھیں نکال دی جائیں گی"۔ (خلافت و جمہوریت)

خلفاء راشدینؓ کے طریقۂ انتخاب سے ثابت شدہ امور

۱۔ اسلام میں کسی اہل شخص کو نامزد کرنا جائز ہے، جیسا کہ ابو بکرؓ نے عمر فاروقؓ کو نامزد کیا اور صحابہ کرام نے اس نامزدگی کے درست اور حق بجانب ہونے پر عملاً اجماع کیا۔

۲۔ ہر بالغ مرد اور عورت سے انتخابِ سربراہ میں رائے طلب کرنا ضروری نہیں خلفاء اربعہ کے انتخاب میں صرف دار الخلافہ مدینہ منورہ کے چیدہ چیدہ محدود افراد نے حصہ لیا حالانکہ عمر فاروقؓ کے زمانہ میں مسلمانوں کی آبادی لاکھوں تک پہنچ چکی تھی اور حجاز سے باہر تک پھیل چکی تھی، نیز مردم شماری کا شعبہ قائم ہو چکا تھا، تیز ترین سواروں کی

مدد سے پیغام رسانی اور مواصلات کا سریع الحرکت نظام قائم ہو چکا تھا، مگر پھر بھی مدینہ منورہ سے باہر کے شہریوں کی رائے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی جس کا واضح مفہوم یہی ہے کہ اسلام میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات نہ تو ضروری ہیں اور نہ ہی مطلوب ہیں۔

تاہم اس کا یہ مطلب لینا بھی درست نہ ہو گا کہ اسلام میں بالغ رائے دہی پر انتخاب کی گنجائش نہیں یا یہ دعویٰ کرنا کہ خلفاء راشدین کا طریقہ انتخاب بالغ رائے دہی کے انتخابات کی نفی کرتا ہے، جب کہ شریعت اسلامی میں "الاصل فی الاشیاء الا باحت" ہے تاوقتیکہ اباحت کے خلاف شرعی دلیل قائم نہ ہو جائے۔

۴۔ حضرت علیؓ کے انتخاب بالجبر سے نظریہ ضرورت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ طاقت کے بل بوتے پر سربراہی کے منصب پر قبضہ کرنے سے بھی خلافت منعقد ہو جاتی ہے، بشرطیکہ کسی اہل شخص کو اس منصب پر فائز کیا جائے جیسا کہ حضرت عثمانؓ کے قاتلین اور باغیوں نے اہل حل وعقد کے مشورہ کے بغیر اور حضرت علیؓ کی رضامندی کے بغیر آپؓ کو اس منصب پر مقرر کر دیا۔ اور بعد میں اسی انتخاب کو کافی سمجھا گیا کسی نئے انتخاب کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

گویا شریعت میں اصل مقصود کسی اہل شخص کو منصب سربراہی پر فائز کرنا ہے خواہ یہ مقصود اور منزل کسی بھی طریقے سے حاصل ہو جائے۔

ووٹ کی حقیقت از روئے شریعت

ووٹ در حقیقت انسان کے ضمیر اور ایمان کی آواز اور قطعی رائے اور فیصلہ ہے، جس میں تخمینہ، اندازہ، شک اور شبہ کی کوئی گنجائش نہیں اور یہی رائے جس کے حق میں دی جاتی ہے اس کی اہلیت کی گواہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ تو گویا ووٹ صرف ایک قطعی اور فیصلہ

کن رائے ہی نہیں بلکہ کسی منصب کے طالب اور اس کے استحقاق کے مدعی کے حق میں گواہی اور شہادت بھی ہے، جو کہ قاضی (چیف الیکشن کمشنر) کے نمائندے کے حضور میں انتخابی عدالت کے کڑے قوانین کے تحت دی جاتی ہے۔

ووٹ کی دوسری اہم حیثیت سفارش کی ہے کہ ووٹ دہندہ کسی منصب کے کسی امیدوار کے حق میں اس کے لئے مطلوبہ عہدہ کی سفارش کرتا ہے۔

ووٹ کی تیسری اہم حیثیت ''توکیل'' کی بھی ہے کہ ووٹر جس کو ووٹ دیتا ہے۔ گویا کہ اس کو اپنے حقوق کے لئے وکیل بناتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض اسلامی ممالک میں اسمبلی کے ممبر کو ''وکیل'' کہا جاتا ہے۔ اس حیثیت سے ووٹ دینے والا ''موکل'' اور ووٹ لینے والا ''وکیل'' ہوتا ہے۔

مفتی اعظم پاکستان علامہ مفتی محمد شفیعؒ اپنی کتاب ''جواہر الفقہ'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

''خلاصہ یہ کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے، ایک شہادت، دوسری سفارش، تیسری حقوق مشترکہ میں وکالت''۔ (جواہر الفقہ جلد ۲، صفحہ ۲۹۹)

ووٹ کے مواقعِ استعمال میں کثرت اور حکم میں وحدت

موجودہ دور میں انسانی معاشرے میں مختلف النوع جملہ ضروریات کے پیش نظر اور انہیں سر انجام دینے کے لئے مختلف ذمہ داریاں، عہدے، آسامیاں اور پیشے اتنی کثرت سے ہیں کہ گننا بھی آسان نہیں اور ہر نوع میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ عہدے اور مناصب ہیں، مثلاً سول انتظامیہ کے کسی ادنیٰ عہدے سے لیکر وزارت عظمیٰ اور صدارت تک، اسمبلیوں، سینٹ، کونسل، بلدیات، ٹاؤن کمیٹیوں کی ممبری وغیرہ، اسی طرح فوج، عدلیہ، میڈیکل، انجینئرنگ، سائنس اور ٹیکنالوجی حتیٰ کہ ڈرائیونگ اور تعلیمی کلاسوں تک کسی مقام

پر فائز ہونے کے لئے اسلامی اور غیر اسلامی مروجہ قوانین کی رو سے شرط اول یہ ہے، کہ امیدوار کے حق میں اس عہدے اور پیشے کے لئے مقرر کردہ ووٹروں کی مطلوبہ تعداد کے ووٹ یعنی امیدوار کی اہلیت کی گواہی اور سفارش میسر ہو جائے خواہ یہ ووٹ اور گواہی بیلٹ پیپر کی شکل میں ہو، خواہ ہاتھ کھڑا کرنے کی شکل میں ہو، خواہ پبلک سروس کمیشن کی سند اور سرٹیفکیٹ ہو یا کسی امتحانی بورڈ یونیورسٹی، دارالعلوم کی سند اور سرٹیفکیٹ ہو، یا قاضی اور جج کے فیصلے کی سند ہو۔ یہ جملہ اقسام درحقیقت ان مقرر کردہ ووٹروں کے ووٹ یعنی گواہی، سفارش یا وکالت کی اقسام ہی ہیں، لہٰذا سب کا حکم وہی ہے جو کہ امیدوار کے حق میں اس کی اہلیت اور استحقاق کی گواہی اور شہادت کا ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف ناموں اور اصطلاحات کا ہے۔

دین اسلام میں ووٹ ایک شرعی فریضہ اور امانت ہے

دین جمہوریت کی رو سے تو ووٹ ووٹر کا حق ہے، لہٰذا وہ اپنا یہ حق اپنی آزادانہ مرضی کے مطابق جیسا استعمال کرنا چاہے اسے کوئی منع نہیں کر سکتا، مگر دین اسلام کے لحاظ سے ووٹ ایک شہادت اور سفارش جیسی امانت، شرعی فریضہ اور ذمہ داری ہے لہٰذا ووٹر اسے شریعت کی عائد کردہ پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرے گا۔ درجہ بالا تینوں حیثیتوں سے ووٹ کا شرعی حکم ذیل کی نصوص سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

بحیثیت گواہی ووٹ کا حکم یہ ہے۔

یایها الذین آمنوا کونوا قوامین لله شهدآء بالقسط ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوی واتقوا الله ان الله خبیر بما تعملون ○ (پارہ ۶، المائدہ، آیت: ۸)

"اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لئے

کھڑے ہو جاؤ اور ایسا نہ ہو کہ کسی قوم (جماعت یا پارٹی) کی دشمنی تم سے گواہی دینے میں بے انصافی کرائے، انصاف کرو، یہی پرہیزگاری کا قریب ترین راستہ ہے اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ تمہارے اعمال کی خبر رکھتا ہے"۔

یایها الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شهدآء للّٰه ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین ان یکن غنیا او فقیرا فاللّٰه اولی بهما فلا تتبعوا الهوی ان تعدلوا وان تلووا او تعرضوا فان اللّٰه کان بما تعملون خبیرا ○ (پارہ:۵، النساء، آیت ۱۳۵)

"اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ کے واسطے گواہی دو اگرچہ وہ گواہی خود تمہارے یا تمہارے والدین یا رشتہ داروں کے خلاف پڑتی ہو، اگر کوئی دولت مند یا مسکین ہے تو اللہ ان کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، سو تم انصاف کو چھوڑ کر خواہشات نفس کی پیروی مت کرو اور اگر تم گواہی میں غلط بیانی کرو یا گواہی دینے سے روگردانی کرو تو اللہ تمہارے اس عمل سے باخبر ہے"۔

واقیموا الشهادة للّٰه ○ (پارہ ۲۸، سورۃ الطلاق، آیت:۲)

"اور گواہی محض اللہ تعالیٰ ہی کے لئے دیا کرو"۔

تشریح : ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل چند باتوں کا حکم دیا ہے۔

۱۔ گواہی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے دیا کرو یعنی اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر سچی گواہی دینے پر ہمیشہ قائم و دائم رہو۔

۲۔ اگر تمہارا دشمن حق اور سچائی پر ہو تو اس کے حق میں گواہی دینا حق اور انصاف ہے، لہٰذا تمہارے اوپر لازم ہے کہ اسی مخالف کے حق میں گواہی دو اور برادری اور پارٹی

بازی کو ترک کر دو۔

۳۔ اگر تمہاری سچی گواہی سے تمہیں خود، تمہارے ماں باپ، یا تمہارے رشتہ داروں، دوستوں، ہم قوم لوگوں، یا پارٹی والوں کو نقصان پہنچتا ہے یا شکست ہوتی ہے تو ہونے دو۔

۴۔ شہادت دینے میں کسی مالدار یا دولت مند کی دولت مندی اور غریب و مسکین کی غربت کا ہرگز لحاظ نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم خواہشات نفس کی پیروی اور کسی لالچ یا بے جا ہمدردی میں عدل و انصاف کا دامن چھوڑ کر ناحق گواہی دے بیٹھو۔

۵۔ اور اگر تم نے حق گواہی دینے میں اونچ نیچ اور کمی بیشی کی، یا حق گواہی دینے سے اعراض و پہلو تہی کی اور جانبداری برتی تو اللہ تعالٰی تمہارے اس کرتوت سے باخبر ہے۔

جھوٹی گواہی اور غلط بیانی کا حکم :

قولہ تعالٰی: فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور○

(پارہ ۱۷، س ۲۲، آیت: ۳۰)

"سو بچتے رہو بتوں کی گندگی (شرک) اور بچتے رہو جھوٹی بات (جھوٹی شہادت) سے"۔

قولہ تعالٰی: والذین لا یشھدون الزور○

(پارہ ۱۹، الفرقان، آیت: ۷۲)

"اور وہ لوگ جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے ہیں"۔

دیکھئے ان آیات میں اللہ تعالٰی نے نہ صرف جھوٹی گواہی دینے سے منع کیا ہے، بلکہ جھوٹی گواہی کو بت پرستی اور شرک جیسے بھیانک اور ناقابل معافی گناہ کے ساتھ بیان میں یکجا کر کے اس گناہ کی عظمت کو ذہن نشین کرانا چاہا ہے۔

حق کے لئے ووٹ اور شہادت دینے سے کنارہ کشی برتنے کا شرعی حکم

ولا یاب الشھدآء اذا ما دعوا○

(البقرہ، آیت: ۲۸۲)

اور جب گواہ کو حق گواہی کے لئے طلب کیا جائے تو وہ انکار نہ کرے"۔

ومن اظلم ممن کتم شھادۃ عندہ من اللہ○

(البقرہ، آیت: ۱۴۰)

"اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو چھپائے اس گواہی کو جو اس کے پاس ہے اللہ کی طرف سے"۔

ولا تکتموا الشھادۃ ومن یکتمھا فانہ آثم قلبہ○

(البقرہ، آیت: ۲۸۲)

"اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص اسے چھپائے گا تو بے شک اس کا دل گنہگار ہے"۔

دیکھئے حق بیان، گواہی اور ووٹ دینے سے اجتناب کرنا، یا غیر جانب دار رہنا، کتنا عظیم گناہ ہے، کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے براہ راست دل کی گناہگاری سے تعبیر فرمایا۔

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الاٰمانات الی اھلھا○

(النساء، آیت: ۵۸)

"بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے حق داروں کو دو"۔

حقدار اور اہلیت رکھنے والے کے لئے سچی گواہی دینا خدائی امانت کو اس کے مستحق تک پہنچانا ہے، جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، اور نااہل کو ووٹ دینا، درحقیقت امانت میں خیانت کرنا ہے، جو کہ از روئے شریعت گناہ کبیرہ ہے۔

ووٹ بحیثیت سفارش

ووٹ دراصل کسی امیدوار کے لئے اس کے مطلوبہ عہدہ اور منصب کے واسطے ووٹر کی طرف سے اس بات کی سفارش ہے، کہ یہ امیدوار جس کو ووٹر اپنا ووٹ دیتا ہے، بہ نسبت دوسرے امیدواروں کے مطلوبہ عہدے اور منصب کے لئے زیادہ حقدار اور صاحب اہلیت ہے۔

اور سفارش بھی ایک اسلامی فریضہ اور ذمہ داری ہے، اگر اسلامی نقطہ نگاہ سے کسی حقدار اور مستحق کے لئے نیکی اور کار خیر کی نیت سے اور للّٰہیت کے جذبے کے تحت سفارش کی جائے، تو یہ ایک عظیم عبادت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا بڑا ذریعہ ہے، اور اگر کسی نااہل بدکردار اور خائن کے لئے جان بوجھ کر سفارش کی جائے، تو یہ عظیم گناہ اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنتا ہے۔ کیونکہ یہ بھیڑیئے کے دانتوں کو تیز کرنا اور ناگ کے زہر میں اضافہ ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

من یشفع شفاعة حسنة یکن له نصیب منها ومن یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها ○ (پارہ ۵، سورۃ النساء، آیت:۸۵)

"جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا اور جو بری بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے عذاب) میں سے حصہ ملے گا"۔

ووٹ بحیثیت مشورہ

ووٹ کی ایک حیثیت مشورہ کی بھی ہے، یعنی ووٹر الیکشن یا سلیکشن کرانے والی اتھارٹی کو اپنے ووٹ کے ذریعے مشورہ دیتا ہے کہ جسے میں نے ووٹ دیا ہے اس میں مطلوبہ عہدہ اور منصب کی اہلیت کی جملہ شرائط موجود ہیں، لہٰذا میرا مشورہ یہی ہے کہ اسے یہ عہدہ سپرد کیا جائے اور شرعی لحاظ سے مشورہ ایک امانت ہے اور مشورہ دینے والا امانت دار ہوتا ہے، حضور علیہ السلام فرماتے ہیں:

"المستشار موتمن" (متفق علیہ)

جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے۔

یعنی اس نے ایماندارانہ اور دیانتدارانہ مشورہ دینا ہوگا اور اگر اس نے اس میں جانبداری برتی اور خیانت کی تو وہ اللہ اور رسول خدا کے نزدیک خائن ہوگا۔

ووٹ بحیثیت وکالت

کسی عہدے اور منصب کے لئے امیدوار کو ووٹ دینا درحقیقت اسے اس ذمہ داری کے لئے اپنا نمائندہ اور وکیل چننا ہے۔ یعنی ووٹر اگر کسی شخص کو ووٹ دیتا ہے تو ووٹر موکل (وکیل بنانے والا) ہوتا ہے، اور وہ شخص وکیل، نمائندہ یا نائب ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ نہ صرف دین اسلام کی رو سے بلکہ دنیا میں رائج جملہ قوانین کے لحاظ سے بھی وکیل کی جملہ اچھائیاں اور برائیاں آخرکار موکل (وکیل بنانے والے) کے گلے میں پوری کی پوری آپڑتی ہیں۔

مزید وضاحت :

کسی شخصی معاملہ میں سوچیں۔ اگر کوئی شخص ناحق گواہی دے، یا غلط اور ناجائز

سفارش کرے، یا مشورہ دیتے وقت خیانت کرے، یا کسی زانی، شرابی اور خدا اور رسول کے باغی اور نافرمان کو اپنا وکیل اور نائب بنادے، تو یہ شخص اپنی کرتوتوں کی وجہ سے اس معاملہ میں اللہ اور رسول کا باغی، خائن اور گناہگار ہوگا۔

اس کے برعکس اگر وہ حق وانصاف کی گواہی دے، یا جائز اور حق سفارش کرے، یا دیانتدارانہ مشورہ دے، یا کسی مومن متقی اور صالح شخص کو اپنا وکیل اور نائب بنادے۔ تو اس کا یہ عمل فرض، واجب یا کم از کم موجب ثواب ہے۔ تاہم ان دونوں صورتوں میں ثواب اور گناہ کا دائرہ ایک فرد اور اس کے ذاتی استحقاق تک محدود ہوتا ہے۔

لیکن یہی طرز عمل اگر قومی یا صوبائی معاملات میں اختیار کیا جائے، تو نفع یا ضرر متعدی ہونے کی بنا پر اس کا گناہ اور ثواب، حساب وشمار سے خارج ہو جاتا ہے۔

حاصل بحث :

کسی بھی معنی ومفہوم کے لحاظ سے ووٹ کی جتنی بھی حیثیتیں ہیں، ہر اعتبار سے یہ ایک اسلامی فریضہ اور ذمہ داری ہے، جبکہ آج کل مسلمان اسے جمہوریت کا ایک کھیل، پارٹی بازی اور قوم پرستی کی ہار جیت، یا تجارت کا ایک نفع بخش ذریعہ سمجھتے ہیں۔

؎ وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

ووٹر کے لئے شرعی معیار اور شرائط

گذشتہ تفصیلی دلائل سے ثابت ہوا کہ دین اسلام میں کسی شخص کے دعویٰ کی تصدیق اور تائید کے لئے ووٹ دینا اس مدعی کی اہلیت واستحقاق کی گواہی ہے، اور گواہی ایک اسلامی فریضہ اور شرعی امانت ہے۔ اس لئے شریعت اسلامی نے جس طرح دیگر فرائض مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی ادائیگی اور صحت کے لئے چند شرائط عائد کی ہیں۔ بعینہ اسی طرح

کسی کے حق میں ووٹ اور شہادت دینے کی صحت کے لئے بھی کئی شرائط عائد کی ہیں، جن میں سے بعض شرائط کا تعلق ووٹ لینے والے امیدوار کے ساتھ ہے، جن کی تفصیل آئندہ آرہی ہے اور بعض شرائط کا تعلق ووٹ دینے والے یعنی ووٹر سے ہے جو کہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) جب دو امیدوار میدان میں ہوں تو کسی ایک کے حق میں ووٹ دینا درحقیقت دوسرے کے خلاف گواہی دینا ہے، چونکہ مسلمان کے خلاف کوئی غیر مسلم گواہی نہیں دے سکتا، لہٰذا ووٹر کے لئے ضروری ہے کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہو۔ دین اسلام کے قطعی احکامات، ختم نبوت، قرآن کریم کے کامل اور مکمل نظام ہونے پر غیر متزلزل ایمان کے ساتھ ساتھ اس کا یہ بھی ایمان اور قطعی یقین ہو کہ تاقیامت ہر زمانے کے لئے شریعت اسلامی کا نظام زندگی کے ہر شعبے کے لئے ایک بہترین، اور فِٹ نظام ہے، جس کے بغیر انسانوں کی دنیاوی اور اخروی فلاح اور کامیابی ناممکن ہے۔ اگر کسی کلمہ گو کی تحریر و تقریر یا قول وفعل سے ایسی چیز کا یقینی ثبوت ملتا ہو، جسے شریعت نے کفر کی علامت ٹھہرایا ہے یا کوئی ایسا شخص جو اسلامی تعزیرات کو وحشیانہ اور ظالمانہ سزائیں سمجھتا ہو، یا اس کا کہنا ہو کہ اسلامی نظام ایک فرسودہ اور باعث تنزل نظام ہے جو کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے لئے ان فٹ اور غیر موزوں ہے یا کسی قطعی حرام کو حلال، یا حلال کو حرام سمجھتا ہو، تو ایسا عقیدہ رکھنے والا شخص دائرہ اسلام سے یقیناً خارج ہے، اگرچہ وہ کلمہ پڑھتا ہو نماز، روزہ، حج اور زکوۃ، تلاوت و تہجد وغیرہ عبادات کا پابند کیوں نہ ہو (تفصیلی دلائل معلوم کرنے کے خواہشمند حضرات میری کتاب ”جہاد افغانستان“ کے صفحات ۵۵ تا ۵۹ ضرور پڑھیں اور کتاب ہذا صفحہ ...... تا ...... دیکھیں) تو ایسا شخص ووٹ دینے کا اہل نہیں ہوگا۔

(ب) ووٹر بالغ اور عاقل ہو، اس لئے کہ گواہ کے لئے یہ دونوں صفتیں ضروری ہیں۔

(ج) ووٹ دینے والا ”عادل“ یا کم از کم ”مستور الحال“ ہو یعنی ظاہری صورت اور

سیرت کے لحاظ سے صحیح العقیدہ مسلمان ہو تمام اسلامی ارکان وفرائض کی عملی طور پر پابندی کرتا ہو، اور جملہ کبیرہ گناہوں مثلاً زنا کاری، شراب نوشی، حرام خوری، سودی کاروبار، رشوت خوری، قتل، چوری، راہزنی، ظلم وغصب، لواطت اور دیوثی میں مبتلا نہ ہو، اگر ان چیزوں میں ملوث رہ چکا ہو، تو ان سے سچی توبہ کر چکا ہو اور توبہ کے بعد اس میں تقویٰ اور اصلاح عمل واضح طور پر دیکھے جاتے ہوں۔ نیز وہ "حد قذف" کا سزا یافتہ بھی نہ ہو۔

اگر کوئی ووٹر اس معیار پر بظاہر پورا نہ اترتا ہو، تو وہ دین اسلام کی رو سے ووٹ دینے کا اہل نہیں ہے۔

البتہ ووٹر کے خفیہ کردار کی کھوج لگانے اور تزکیہ حاصل کرنے کے پیچھے نہیں پڑنا چاہئے۔

(د) امیدوار جس عہدہ، منصب اور پیشہ کی ذمہ داری کے حصول کے لئے ووٹروں کی گواہی اور سفارش طلب کرنا چاہتا ہو، اس عہدہ اور ذمہ داری کے بارے میں ووٹر کو بنیادی اور ضروری علم ضرور حاصل ہو، تاکہ وہ امیدوار کی اہلیت اور قابلیت کے بارے میں درست اور علی وجہ البصیرت شہادت دے سکے اور فیصلہ کر سکے کہ امیدوار اس ذمہ داری کی اہلیت رکھتا ہے یا نہیں، مثلاً پبلک سروس کمیشن کے ارکان میں، یا ڈاکٹروں، انجینئروں، مختلف پیشوں، اور تعلیم، افتاء اور قضاء کے شعبوں کی انتخابی کمیٹیوں اور سلیکشن بورڈوں کے ارکان میں ہر رکن کے لئے لازمی اور اولین شرط یہی ہے کہ وہ جس شعبے میں کسی امیدوار کے لئے اہلیت و قابلیت کا شہادت نامہ اور سرٹیفکیٹ جاری کرتا ہے، اس میں اسے خود مہارت حاصل ہو یا کم از کم اس شعبے کی ضروریات کا مکمل علم اسے حاصل ہو۔ ظاہر ہے کہ اسلامی ملک کا مقننہ یا انتظامیہ اسلامی قوانین کو مرتب کرتا ہے، اسے نافذ کرتا ہے اور ملک کا نظم ونسق قرآن وسنت کے مطابق چلاتا ہے۔ لہٰذا اسلامی ملک کی اسمبلی یا کابینہ کی ذمہ داری کے لئے کسی امیدوار کی اہلیت و قابلیت کی شہادت بھی وہی شخص دے سکتا ہے، جس کو قرآن وسنت اور

اسلامی نظام حیات کے متعلق کم از کم بنیادی علم اور سمجھ حاصل ہو۔ لہٰذا اسلامی علوم سے جاہل مطلق کا ووٹ اس بارے میں قابل قبول نہ ہوگا۔

(ہ) اسی طرح دنیاوی نظم ونسق اور ملکی وبین الاقوامی سیاسیات اوران کے تقاضوں سے لاشعور ووٹر کے ووٹ کی بھی از روئے عقل ونقل کوئی قیمت نہیں ہے۔

(و) جو ووٹ دولت اور پیسے سے خریدا جائے از روئے شریعت اس ووٹ کی کوئی قدر وقیمت نہیں، اور ایسا کرنا ووٹ لینے والے اور دینے والے دونوں کے لئے حرام اوران کی عدم اہلیت کا ثبوت ہے۔

(ز) ایسے امیدوار کو ووٹ دینا صحیح نہیں، جس کے حق میں گواہی دینا جائز نہ ہو مثلاً باپ، دادا، ماں یا اولاد کو ووٹ دینا یا اپنے آپ کو ووٹ دینا یا اس کو جس کے ساتھ ووٹر کا نفع ونقصان مشترک ہو اسی طرح عصبیت، قوم پرستی یا دشمنی کے جذبے کے تحت ووٹ دینا بھی صحیح نہیں۔ اس لئے کہ ووٹ شہادت ہے، اور ایسی وجوہات کی بنا پر شہادت شرعاً قبول نہیں ہے۔ تفصیل کے لئے بحر الرائق، شامی، عالمگیری، اور شرح المجلہ دیکھیں خلاصہ یہ کہ دین اسلام میں ووٹر گننے کے بجائے تولے جاتے ہیں، اس کے برعکس دین جمہوریت میں ووٹروں کی تعداد کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ اسلامی نقطہ نگاہ سے شاہد اور ووٹر بننے کی صلاحیت سے یکسر محروم کیوں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری نظام کہیں بھی سیاسی پختہ کاری پر منتج نہ ہو سکا۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے۔

؎ گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کاری شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی زاید

الغرض اسلام میں ہر ایرا غیرا ووٹر نہیں بن سکتا۔

دین اسلام میں ممبر اسمبلی کی حیثیت اور اہمیت

موجودہ دور حکمرانی میں پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبروں کی حیثیت اور اہمیت وہی ہے جو کہ قرآن کریم کی اصطلاح میں "اُلو الامر" "ملأ القوم" اور "النقباء" کی ہے، یا سنت رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں "العرفاء" کی ہے، اور یا فقہاء اسلام کی اصطلاح میں "اہل الحل والعقد" کی ہے اور انہی ممبروں کی اسمبلی کو بعض اسلامی ممالک میں "مجلس وکلاء" اور "مجلس نمائندگان" بھی کہا جاتا ہے۔

اولوالامر :

امام لغت القرآن علامہ راغب اصفہانی اولوالامر کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

ان اولو الامر الذین بھم یرتدع الناس اربعة الانبیاء، وحکمھم علی ظاھر العامة والخاصة وعلی بواطنھم، والولاة وحکمھم علی ظاھر الکافة دون باطنھم، والحکماء وحکمھم علی باطن الخاصة دون ظاھرھم، والوعظة وحکمھم علی بواطن العامة دون ظواھرھم. (المفردات، صفحہ ۲۴)

"بے شک اولوالامر جن کا حکم لوگ مانتے ہیں چار قسم کے ہیں۔ (۱) انبیاء علیہم السلام جن کا حکم عوام وخواص کے ظاہر وباطن پر نافذ ہوتا ہے (۲) حکومت کے عہدہ دار جن کا حکم تمام رعیت کے ظاہر ہی پر نافذ ہے نہ کہ باطن پر (۳) حکماء جن کی بات خواص کے باطن ہی پر نافذ ہے نہ کہ ظاہر پر (۴) علماء اسلام کے مقررین جن کا حکم عوام کے باطن پر نافذ ہے اور ان کے ظاہر پر نہیں"۔

دیکھئے علامہ راغب نے اولوالامر کے مفہوم کو خواص تک محدود کر دیا ہے۔

علامہ قرطبیؒ اولوالامر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

هم اولو العقل والرای الذین یدبرون امر الناس.

(تفسیر قرطبی جلد۵، صفحہ ۲۶۰)

"وہ لوگ ہیں جو عقل وفکر کے مالک ہیں، جو کہ لوگوں کے مذہبی سیاسی وانتظامی امور چلاتے ہیں"۔

امام زجاجؒ اس کی توضیح یوں فرماتے ہیں:

اولو الامر من یقوم بشان المسلمین فی امر دینھم وجمیع ما ادی الیہ صلاحھم. (تفسیر خازن جلد۱، صفحہ ۳۹۷سورۃ النساء)

"اولو الامر ہر وہ فرد ہے، جو مسلمانوں کے دینی امور نبھاتا ہے اور ان کے جملہ دنیاوی امور منظم کرتا ہے"۔

قرآن کریم کی سورہ النساء آیت ۸۳ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ جو بھی حل طلب مسائل ہوں ان کو "اولو الامر" کے سامنے پیش کیا کرو، تاکہ وہ قوت استنباط کے ذریعے ان کا حل تلاش کر سکیں اس آیت نے اولو الامر کی یہ صفت اجاگر کردی کہ ان میں دین ودنیا کے حل طلب مسائل کو وقت کی ضرورت کے مطابق حل کرنے کی صلاحیت اور مہارت ہونی چاہیے۔

ملاء القوم یا الملاء :

امام التفسیر علامہ آلوسیؒ اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

"الملاء من القوم وجوھھم واشرافھم وھو اسم للجماعۃ"

(روح المعانی، جلد۲، صفحہ ۱۶۵)

"یعنی قوم کے جانے پہچانے سرداروں اور معززین کی جماعت"۔

علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

الملاء جماعة یجتمعون علی رای فیملون العیون. (المفردات، صفحہ ٤٩٠)

"ملاء قوم کی وہ جماعت ہے، جو کسی قومی معاملہ میں ایک رائے پر متفق ہو جاتے ہیں جس سے قوم کی آنکھیں ٹھنڈک سے بھر جائیں"۔

علامہ ابن منظورؒ تحریر فرماتے ہیں:

الملاء الروساء وقیل اشراف القوم ووجوھھم وروسائھم ومقدموھم الذین یرجع الی اقوالھم. (لسان العرب جلد ۱، صفحہ ۱۵۹)

"ملأ رئیسوں کو کہا جاتا ہے، بعض کہتے ہیں کہ قوم کے معزز اور جانے پہنچانے وہ سردار جو سب سے آگے سمجھے جاتے ہیں اور ان ہی کی بات فیصلہ کن سمجھی جاتی ہے"۔

النقباء :

امام لغت القرآن علامہ راغب اس لفظ کی یوں وضاحت فرماتے ہیں:

والنقیب الباحث عن القوم وعن احوالھم وجمعہ نقباء.

(المفردات، صفحہ ۵۲۳)

"نقیب وہ ہوتا ہے جو قوم اور قومی مسائل کی تفتیش و تحقیق کرتا ہے، اس کی جمع النقباء ہے"۔

علامہ ابن منظورؒ اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں:

والنقیب العریف وھو شاھد القوم وضمینھم وھو کا العریف علی القوم المقدم علیھم الذی یتعرف اخبارھم وینقب عن احوالھم ای یفتش. (لسان العرب جلد ۱، صفحہ ۷۶۹)

"نقیب عریف کو کہا جاتا ہے، جو کہ اپنی قوم کے معاملات کا گواہ اور ضامن ہوتا ہے، اور یہ قوم کا وہ بڑا ہوتا ہے جو کہ قوم کے احوال سے باخبر رہتا ہے، سب سے مقدم ہوتا ہے

قوم کے مسائل سے اپنے آپ کو باخبر رکھتا ہے، اور ان کے احوال کی کرید و تفتیش کرتا ہے"۔

قومِ موسیٰ علیہ السلام (بنی اسرائیل) کے بارہ قبیلوں میں سے اللہ تعالیٰ نے بارہ آدمیوں کو قومی نمائندوں، زعماء اور ذمہ داران قبائل کے طور پر چن لیا تھا۔

ولقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل وبعثنا منھم اثنی عشر نقیبا۝

(پارہ ۶، المائدہ، آیت: ۱۲)

"اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیب (سردار) مقرر کیے"۔

یہی بارہ نفر پوری قوم کے نمائندے اور ذمہ دار سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرح ہجرت سے پہلے "لیلۃ العقبۃ" کے موقع پر مکہ معظمہ میں حضور علیہ السلام کے پاس مدینہ منورہ کے قبائل کے بارہ نمائندوں نے آکر دست مبارک پر بیعت کی اور وفاداری کا عہد کیا اور اس کو حضور علیہ السلام نے پوری قوم کی طرف سے عہد اور ذمہ داری کی حیثیت سے قبول فرمایا اور ان بارہ صحابہ کو نقیب مقرر کیا۔

العرفاء :

یہ عریف کی جمع ہے علامہ راغب اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

العریف السید المعروف. (المفردات صفحہ ۳۳۵)

"عریف قوم کا جانا پہچانا سردار ہوتا ہے"۔

قبیلہ ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں کی رہائی کے متعلق جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمام مسلمان مجاہدین کو اپنی خواہش سے آگاہ کیا تو سب نے رضامندی ظاہر کی۔ مگر حضور علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ کیا معلوم کہ، کس نے شرم کے مارے ہاں کی اور کس نے خوشی سے بات مانی۔ جاؤ ہر ایک قوم اپنے ذمہ دار نمائندے اور وکیل کی وساطت سے مجھے

اپنے فیصلے سے آگاہ کرے۔

حضور علیہ السلام نے ان سے فرمایا:

فارجعوا حتی یرفع الینا عرفائکم امرکم فرجع الناس فکلمهم عرفاوهم ثم رجعوا الی رسول الله ﷺ فاخبروه انهم قد طیبوه.

(بخاری جلد ۲، کتاب المغازی، غزوہ حنین، صفحہ ۶۱۸)

"اب تم چلے جاؤ تاکہ تمہارے قومی نمائندے میرے پاس آکر تمہاری مرضی بتائیں پس وہ چلے گئے اور ہر قوم کے بڑے نے قوم سے بات کی اور پھر حضور علیہ السلام کو آکر بتایا کہ ان سب نے بخوشی قیدیوں کی رہائی کی بات قبول کرلی ہے"۔

قال رسول الله ﷺ ان العرافة حق ولا بد للناس من العرفاء ولکن العرفاء فی النار. (ابوداؤد جلد ۲، صفحہ ۳۳۸)

"قوم کی نمائندگی ضروری ہے، لوگوں کے لئے اس کے بغیر چارہ کار نہیں لیکن (برے) نمائندے جہنم میں ہوں گے"۔

اہل الحل والعقد :

امام تفسیر امام رازیؒ سورہ النساء آیت ۵۹ کے لفظ "اولی الامر" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

المراد بقوله اولی الامر اهل الحل والعقد من الامة.

(تفسیر کبیر جلد ۱۰، صفحہ ۱۴۴)

"اولی الامر سے مراد اہل حل وعقد ہیں، یعنی قومی فیصلوں کے بااختیار نمائندے"۔

علامہ کمال ابن ابی شریف شارح "المسائرہ" للعلامہ ابن الھمام کی شرح "المسامرہ" میں اہل حل وعقد کو یوں متعارف کراتے ہیں۔

ویثبت عقد الامامة ببیعة من تعتبر بیعته من اهل الحل والعقد.

(المسامرہ صفحہ ۲۹۵)

''مسلمانوں کی سربراہی کا عہدہ اسی کے لئے ہوگا جس کو ''اہل حل وعقد'' ووٹ دیدیں''۔

گویا کہ جن لوگوں کی بیعت اور ووٹ سے مسلمانوں کا سربراہ منتخب ہوتا ہے، ان کو فقہاء کی اصطلاح میں ''اہل الحل والعقد'' کہا جاتا ہے۔

حاصل کلام :

اس تفصیل کا مقصد دو باتیں ذہن نشین کرانی ہیں۔

پہلی یہ کہ اگرچہ اسلام ایک شورائی نظام حکومت ہے، مگر مشورہ پوری ملت سے نہیں لیا جاتا، بلکہ مشورہ طلب قومی امور میں قوم کے معتمد بڑوں، سرداروں، علماء، صوفیاء، سیاسی لیڈران، اسمبلی کے ممبران اور نمائندگان کی رائے اور فیصلہ پوری ملت کا فیصلہ سمجھا جاتا ہے، حتیٰ کہ سربراہ ملک اور حکومت کے انتخاب میں مذکورہ افراد کا انتخاب ازروئے اسلام پوری قوم اور ملت کا انتخاب سمجھا جاتا ہے۔ بشرطیکہ یہ افراد صالح اور مذکورہ صفات کے حامل ہوں۔

دوسری یہ کہ ''اولوالامر، ملاء القوم، النقباء، العرفاء، اہل الحل والعقد، ممبران اسمبلی، ارکان شوریٰ، نمائندگان قوم اور وکیلان قوم'' جیسی جملہ اصطلاحات ازروئے شریعت وعرف تقریباً ایک ہی معنی اور مفہوم کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

قوم وملت کی نمائندگی کے منصب کے حصول کا موجودہ جمہوری طریقہ

دین جمہوریت میں نمائندہ اور ممبر کے دین ومذہب، اخلاق، کردار، دیانت، امانت اور اہلیت کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ اس کو منتخب کرنے والوں کے سروں کی تعداد اور کثرت کو دیکھا جاتا ہے۔ مزید برآں انتخاب بھی بیلٹ پیپر کے ذریعہ کیا جاتا ہے، اگرچہ اس بیلٹ پیپر میں کتنی ہی جعلسازی، دھاندلی اور ضمیر فروشی کیوں نہ ہو۔ اس طرح جو بھی کدو کریلا اس منصب پر براجمان ہوتا ہے، وہی حقیقی نمائندہ سمجھا جاتا ہے اور وہی قوم کا بیڑہ غرق کردیتا ہے۔

اس کے برعکس دین اسلام میں ممبر اور نمائندہ کے طریقہ انتخاب کو نہیں بلکہ منتخب شخص کو دیکھا جاتا ہے، خواہ وہ اپنی علمی وعملی خدمات، دیانت، امانت اور قومی خیر خواہی کے کمالات کے سبب خود بخود اس مقام پر فائز ہوا ہو، جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ہوا تھا۔ یا کسی خاندانی، نسبی اور مذہبی فوقیت کے نتیجے میں قومی سردار، یا مذہبی اور روحانی پیشوا قوم کا نمائندہ اور معتمد بن چکا ہو جیسا کہ قبائلی نظام میں ہوتا ہے۔ یا اسے سربراہ حکومت نامزد کردے۔ یا مروجہ انتخابات ہی کے ذریعے سے اس مقام پر پہنچ جائے۔ دین اسلام کو ان طریقوں میں سے کسی طریقہ سے نفرت یا محبت نہیں البتہ منتخب ممبر اور نمائندہ کو کڑی شرائط پر پورا اترنا ہوگا اگر آزاد شدہ غلام میں نمائندگی کی اسلامی شرائط موجود ہیں اور اس کے آقا میں نہیں تو آقا اس منصب کا اہل نہ ہوگا اگرچہ وہ رسمی طور پر اس منصب پر فائز ہو اور اس کے آزاد کردہ غلام کے لئے یہ دروازہ کھلا ہوگا۔

اسمبلی کی رکنیت کے لئے اسلامی معیار

اسلامی تعلیمات اور اصطلاحات کی رو سے اسمبلی یا پارلیمنٹ کو مجلس شوریٰ، اور ممبر کو رکن شوریٰ، کہا جاتا ہے۔ اس لئے آئندہ صفحات میں اسی قرآنی اصطلاح کو استعمال کیا جائے گا۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

وامرهم شورى بينهم ○ (پارہ ۲۵، س ۴۲، آیت: ۳۸)

"مسلمان اپنے معاملات (حکمرانی) باہمی مشورہ سے چلاتے ہیں"۔

وشاورهم في الامر فاذا عزمت فتوكل على الله ○

(پارہ ۴، س ۳، آیت: ۱۵۹)

"مشورہ طلب امور میں اہل شوریٰ سے مشورہ کیا کرو اس کے بعد جب تم کسی کام کا عزم کرو تو اللہ پر توکل کرو"۔

گذشتہ صفحات میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ارکان شوریٰ ہی اولوالامر، الملاء اور النقباء اور اہل حل وعقد ہیں۔ بلکہ اسلامی مملکت کے لئے روح رواں ہیں، اس لئے دین اسلام کی رو سے یہ ایک بھاری فریضہ، ذمہ داری اور امانت ہے۔ اور اس کی اہلیت کے لئے عقلاً اور نقلاً کئی شرائط لازم ہونی چاہئیں۔

شرط اول : ایمان یقین۔

ایمان، عقائد کے سلسلے میں ممبر کے لئے درج ذیل امور ضروری ہیں۔

(الف) دین اسلام کے قطعی اور ضروری احکامات پر غیر متزلزل ایمان۔

(ب) قرآن کریم کے کامل مکمل اور غیر محرف ہونے پر یقین وایمان۔

(ج) اسلامی نظام کے ہر دور اور ہر زمانے کے لئے فٹ (Fit) اور باعث فلاح

ہونے پر یقین وایمان۔

(د) ختم نبوت پر ایمان ویقین۔

(ہ) اس ایمان کے دعویدار کے اقوال وافعال اور تقریر وتحریر میں ایسی چیز کا موجود نہ ہونا جس کو شریعت نے کفر، شرک، ایمان کے منافی اور "مخل بالایمان" قرار دیا ہو (اس کی تفصیل اور دلائل میری کتاب "جہاد افغانستان" میں دیکھیے اور کتاب ھذا کے صفحہ ...... تا صفحہ ...... ملاحظہ کریں)

یاد رہے کہ کسی نظریاتی مملکت اور حکومت کے بنیادی عقیدہ اور نظریہ کی صداقت پر اگر کسی شخص کو ایمان ویقین نہیں ہے، تو ایسے شخص کو اس ملک کی شوریٰ جیسے اعلیٰ ترین ادارے کی رکنیت دینے کی نہ تو شریعت اجازت دے سکتی ہے نہ کوئی عقل سلیم ایسا کرنے کی حامی ہو سکتی ہے، بلکہ ایسا کرنا اس ملک اور حکومت کی جڑ پر کلہاڑی چلانا ہوگا۔

شرط دوم : عادل ومتقی ہونا۔

یعنی رکن شوریٰ کے لئے لازم ہوگا کہ جملہ اسلامی فرائض مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ اور حج وغیرہ اعمال صالحہ کا عملاً پابند ہو، اور جملہ تمام کبیرہ گناہوں حرام کاریوں اور بے حیائیوں سے پرہیز کرتا ہو، یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرماں بردار ہو۔ ظاہر بات ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور رسول خدا کے ساتھ بے وفائی، غداری اور خیانت کرتا ہے وہ مسلمانوں کی سپرد کردہ امانت میں بدرجہ اتم خیانت، غداری اور بے وفائی کا مظاہرہ کرے گا۔

شرط سوم : عالم ہونا۔

عالم ہونے سے میری مراد صرف چند عبادات کا علم رکھنا یا فقط مروجہ اسلامی مدارس

کا سند یافتہ ہونا نہیں ہے، بلکہ میری مراد علم خلافت ارض یا علمِ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے متصف ہونا ہے۔ بالفاظ دیگر "علوم الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں بقدر ضرورت مہارت رکھنا ہے"۔

باب سیزدہم

اقسام العلوم

چونکہ علومِ اسلامی کے مصداق کے سمجھنے میں آج کل عموماً لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں، اس لئے اس بارے میں موقع و محل کے تقاضے کے پیش نظر کچھ تفصیل پیش خدمت ہے۔

علوم، اصولی طور پر تین قسموں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) علوم الملائکہ :

جسے آپ علوم الطاعات یا علوم آخرت کا نام دے سکتے ہیں، ان علوم کا خلاصہ یہ ہے کہ بندہ ہر لحظہ و ہر آن اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور تعمیل حکم کے لئے مستعد و کمربستہ ہو، تا حدیکہ ذاتی ضرورتوں اور خواہشات کو بھلا بیٹھے، اور لمحہ بھر کے لئے حکم عدولی اور نافرمانی کی آلائشوں میں ملوث نہ ہو۔ ان علوم اور اعمال کے نتیجے میں بندہ قرب الٰہی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے، اور اس کی آخرت یقیناً سدھر جاتی ہے، مگر اس کے باوجود محض ان علوم و اعمال کے نتیجہ میں خلافت ارض اور تسخیر کائنات کے منصب کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ فرشتوں نے خلافت ارضی کے لئے اپنی اہلیت یوں بیان کی۔

ونحن نسبح بحمدك ونقدس لكo

(البقرہ، آیت: ۳۰)

"(فرشتوں نے کہا) اور ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تقدیس بیان کرتے ہیں"۔

اور خود اللہ ان کی اس صفت کا تذکرہ ان الفاظ سے فرماتے ہیں:

لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یومرون ○

(پارہ ۲۸، التحریم، آیت: ۶)

"فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ وہی کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے"۔

لیکن ان تمام صفات و کمالات کے باوجود فرشتے خلافتِ ارض کے مستحق نہ ٹھہرے بلکہ خلیفہ ارض کے لئے تابع و منقاد بنے۔ ارشادِ ربانی ہے:

واذ قلنا للملئکۃ اسجدوا لادم ○ (البقرہ، آیت: ۳۴)

"اور جب کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرو (یعنی انقیاد کرو)"

(۲) مادی علوم :

جسے ہم محض دنیاوی اور آخرت بیزاری علوم کا نام دے سکتے ہیں، ان علوم کے نتیجہ میں انسان نرا حیوان اور بندہ نفس بن جاتا ہے۔ انسان کی ساری صلاحیتیں اس دنیا کی چند روزہ عیش و عشرت، راحت و سکون، ترقی اور عروج پر صرف ہوتی رہتی ہیں، نہ خوف خدا، نہ آخرت کا ڈر، نہ ثواب و عقاب کی فکر اور نہ حلال و حرام کی تمیز۔ ان علوم کے نتیجے میں اس دنیا کی چند روزہ زندگی میں تاج و تخت، عیش و عشرت، عروج اور ترقی پر یقیناً انسان سر فراز ہو سکتا ہے، مگر آخرت کی دائمی خوشیوں اور اعزازات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتا ہے، ان علوم کو آپ شیطانی اور دجالی علوم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور ان کی کوشش کرنے والوں کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:

فمن الناس من یقول ربنا آتنا فی الدنیا وماله فی الآخرة من خلاق ○ (پارہ ۲، البقرہ، آیت: ۲۰۰)

"لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں، اے ہمارے رب ہمیں سب کچھ دنیا ہی میں دے دے اور ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے"۔

(۳) علوم الانبیاء علیہم السلام :

جن کے نتیجہ میں انسان دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کو جنت بنا سکتا ہے، دونوں جہانوں میں فلاح اور کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے بقول شاعر۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

قرآن مجید ان علوم کے حاملین کا موقف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

ومنهم من يقول ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار ○ (پارہ ۲، البقرہ، آیت: ۲۰۱)

"اور انسانوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا"۔

لفظ حسنہ میں ایک لطیف نکتہ :

آخرت کی جملہ نعمتوں اور بھلائیوں کے لئے قرآن کریم نے جو جامع لفظ "حسنہ" استعمال کیا ہے، وہی لفظ مومن کامل کے لئے دنیاوی انعامات کے لئے بھی "في الدنيا حسنة" استعمال کیا گیا۔ اور یقینی بات ہے کہ دونوں جگہ "حسنہ" کا مفہوم ایک ہو گا بجز ان چند مستثنیات کے جو دنیا میں مومنین کے لئے ممنوع ٹھہرائی گئی ہیں۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھوں جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے روحانی،

دینی اور مذہبی مسائل حل فرمادیئے ہیں، اور ان کو ہدایت کے مینار اور مراجع خلائق بنادیا ہے، بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دنیاوی، معاشی، اجتماعی اور انفرادی مسائل بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھوں حل فرمادیئے ہیں، جس طرح انبیاء علیہم السلام دینی امور میں امت کے لئے معجزاتی علوم کے توسط سے معجزاتی طور پر ہدایت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے اسی طرح وہ امت کی دنیاوی اور مادی ضروریات کے بارے میں بھی معجزاتی علوم کے توسط سے معجزاتی طور پر ان کے مسائل حل فرمادیتے تھے۔ قرآن اٹھا کر پڑھئے ہر نبی نے جس طرح امت کے دینی مسائل حل کئے ہیں، بالکل اسی طرح انہوں نے امت کے دنیاوی اور مادی مسائل کا حل ڈھونڈھنے میں بھی رہنمائی فرمائی ہے۔

علم الاسماء کی حقیقت

حضرت آدم علیہ السلام کی تکوین کے ساتھ ساتھ ان کو جو امتیازی علوم عطا کئے گئے ان کو قرآن نے علم الاسماء کا خطاب دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وعلم آدم الاسمآء کُلَّھَا ○ (البقرہ، آیت: ۳۱)

”اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے اسماء (نام، خاصیت، حقیقت اور کارکردگی) سکھادیئے“۔

عربی زبان میں ”اسم“ یعنی نام، کا مفہوم نرا، نام ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ مسمّٰی کی ذات کی پہچان، اثر، کارکردگی اور اہم ترین خصوصیات بھی شامل ہوتی ہیں۔ مثلاً انسانوں کے بھرے مجمع میں اگر کوئی معتمد شخص صرف اتنا کہہ دے کہ سانپ ہے یا اتنا کہے کہ گرنیڈ اور بم ہے تو نام سنتے ہی سب لوگوں کے ذہن میں سانپ کی حقیقت، خاصیت اور کارکردگی، یا بم کی تباہ کاریاں سب کچھ تصور میں آجائیں گی۔ اور مجلس و مجمع میں بھگدڑ اور ہنگامہ بپا ہو جائے گا، یہ ہے علم الاسماء کی حقیقت۔

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

الاسم ما یعرف به ذات الشیء. (المفردات صفحہ ۲۴۳)

"اسم وہ نام ہے جس سے مسمی کی ذات کی پہچان حاصل ہو جائے"۔

علامہ قاضی بیضاویؒ اس آیت (وعلم اٰدم الاسمآء) کی تفسیر یوں تحریر فرماتے ہیں:

"الھمه معرفة ذوات الاشیاء وخواصها واسمائها واصول العلوم وقوانین الصناعات وکیفیة آلاتها"۔ (تفسیر بیضاوی صفحہ ۶۱)

"آدم کو اللہ نے چیزوں کی ہستیاں، ان کے خواص، ان کے نام، علم کے اصول، صنعتوں کے قوانین اور صنعتوں میں استعمال ہونے والے آلات کی کیفیات (غرض سب کچھ) الہام کر دیں"۔

علامہ شیخ طنطاوی، الجوہری، المصری، تحریر فرماتے ہیں:

والھمه المعرفة والاختراع وسائر الصناعات. (تفسیر الجواہر جلد ۱، صفحہ ۵۲)

ایک سائنٹیفک بات سمجھ لیجئے، وہ یہ کہ آج کل یہ نظریہ مسلّم ہے کہ فرع کے اندر "جینز" کے ذریعہ اصل کی خصوصیات بھی منتقل ہوتی چلی آتی ہیں، اور جو چیز اصل میں موجود نہ ہو اس کا ظہور فرع میں ممکن نہیں۔

ز مردم سگ ز سگ مردم نہ زائد
ز گندم جو ز گندم نہ زائد

لہٰذا اولاد آدم علیہ السلام کے آخری فرد کی طرف سے جن علوم کا مظاہرہ ہو گا۔ ان کا مظاہرہ اس بات کا ٹھوس ثبوت ہو گا کہ یہ سب علوم حضرت آدم علیہ السلام میں تھے۔ جو اس کی فرع یعنی بیٹے میں منتقل ہوئے ہیں۔

البتہ آدم اور اولاد آدم کے علم میں واضح فرق یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا علم "لدنی" اور "وہبی" تھا، یعنی وہ علم ان کو بارگاہ خداوندی کی جانب سے بغیر کسب و مشقت

کے عطا کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس اولاد آدم کا علم کسبی ہے، جو محنت و مشقت کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔

نوح علیہ السلام اور فن انجینئرنگ

آدم ثانی حضرت نوح علیہ السلام کے ذمے جس طرح اللہ تعالیٰ نے دعوت و تبلیغ، رشد و ہدایت کی ذمہ داری ڈالی تھی، اسی طرح آڑے وقت میں مسلمان ملت کو تاریخی سیلاب اور طوفان سے بچانے اور انہیں تحفظ دلانے کا فریضہ بھی آپ کی نبوت کا حصہ بنایا گیا تھا۔ چنانچہ انہی کو حکم ہوا۔

واصنع الفلك باعيننا ووحينا ۝ (پارہ ۱۲، ھود، آیت: ۳۷)

"اور بناؤ کشتی (سمندری جہاز) ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق"۔

یاد رہے کہ عربی میں "فلک" کا لفظ (مفرد) یعنی ایک کشتی اور (جمع) یعنی کئی کشتیوں دونوں کے لئے آتا ہے، اور اس کے علاوہ یہ لفظ پورے بحری بیڑے کے لئے بھی یکساں استعمال ہوتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام اور سائنسی علوم کی انتہا

سائنس کا مفہوم ہے مشاہدہ سے اشیاء کی حقیقت معلوم کرنا۔ سائنسدان باوجود اس کے کہ وہ ذرے کے جگر کو چیر کر اسے جزء لایتجزیٰ تک بالفعل تقسیم کرنے میں تو کامیاب ہوئے مگر پھر بھی وہ تاہنوز حیات اور زندگی کی حقیقت کا عقدہ حل نہ کر سکے جب کہ ہزاروں سال پہلے ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سربستہ راز کی جستجو کر کے چشم دید اور مشاہداتی یقین اور حد اطمینان تک رسائی میں کامیابی حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

واذ قال ابراهیم رب ارنی کیف تحی الموتی قال او لم تومن قال بلی ولکن لیطمئن قلبی الایہ○ (پارہ ۳، البقرہ، آیت: ۲۶۰)

"اور جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے میرے پروردگار مجھ کو دکھا کہ تو مردے کو کس طرح زندہ کرے گا، فرمایا کیا تو ایمان و یقین نہیں لایا؟ کہا کیوں نہیں لیکن میں مشاہداتی یقین واطمینان حاصل کرنا چاہتا ہوں"۔

اندازہ لگایئے کہ خلیفہ ارض نے اپنے زیر تسخیر عالم کے علم الاشیاء کے حصول کی جستجو کو اس حد تک توسیع دی کہ زندگی کہاں سے اور کس طرح بے جان چیزوں میں آتی ہے۔

؎ قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

موسیٰ علیہ السلام اور قومی مسائل کی بھرمار

قرآن کریم اٹھا کر پڑھئے موسیٰ علیہ السلام اگر ایک طرف دعوت و تبلیغ کے میدان میں ایوان فرعون کے اندر جا کر اس کی فرعونیت اور ربوبیت کو چیلنج کر رہے ہیں، تو اس کے ساتھ ساتھ فرعونی حکومت کے سیاسی عدم توازن اور بے انصافی کی پالیسی پر بھی شدید نکتہ چینی کر کے فرعون کو یوں مخاطب کرتے ہیں "ان عبدت بنی اسرائیل" "تم مجھ پر کیا احسان جتاتے ہو جب کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے، اور ان کے ساتھ بے انصافی کا برتاؤ روا رکھا ہے۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام نے دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کو غلامی سے نجات دلانے کا بار گراں بھی اپنے کندھوں پر اٹھایا۔

دوسری طرف ہر چھوٹی بڑی ضرورت کے بارے میں بھی پوری قوم نے سارا بوجھ موسیٰ علیہ السلام پر ڈال دیا تھا، خواہ وہ خوراک اور زراعت کی ضرورت ہوتی یا آب نوشی اور پانی کی تقسیم کا مسئلہ ہوتا، خواہ دھوپ اور گرمی سے بچاؤ کے لئے انتظامات کرنا پڑتے یا قومی

نمائندوں کے انتخاب کا مسئلہ ہو تا یا اندھیری رات میں قتل کے وقوعہ کی تفتیش اور تحقیق کا مرحلہ پیش آتا، پھر ان سب سے اہم مسئلہ قوم کو ایک تحریر شدہ دستور اور آئین دینا تھا جو کہ قابل قبول اور قابل عمل بھی ہو، غرض یہ کہ زندگی کی جملہ ضروریات کے لئے قوم کا ایک ہی نعرہ تھا کہ "فادع لنا ربك" ہمارے لئے اپنے رب سے فلاں اور فلاں چیز کا مطالبہ کرو اور موسیٰ علیہ السلام نے کسی ایک مطالبہ کو بھی رد کرتے ہوئے یہ نہیں فرمایا کہ میرا کام اور فریضہ تمہیں فقط دینی اور مذہبی مسائل بتانا ہے، تمہارے دنیاوی مسائل کا حل نبوت کی ذمہ داری نہیں، لہٰذا تم جانو اور تمہاری دنیاوی ضروریات جانیں۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام ان کا ہر جائز مطالبہ اور پھر اس کے حل کے لئے جستجو کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع فرماتے اور اس سے مدد اور ہدایت کی دعا کرتے، موسیٰ علیہ السلام کا یہ کردار اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ امت کے دنیاوی، معاشی اور اقتصادی مسائل کا حل بھی نبوت اور تعلیمات نبوت کا ایک جزو لاینفک ہے۔ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کے مطالبات اور انبیاء علیہ السلام کی مساعی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مثلاً

موسیٰ علیہ السلام اور مسئلہ خوراک وزراعت

فادع لنا ربك يخرج لنا مما تنبت الارض من بقلها وقثائها وفومها وعدسها وبصلها ○ (پارہ ۱، البقرہ، آیت: ۶۱)

"سو ہمارے لئے اپنے رب سے دعا مانگ کہ وہ ہمارے لئے زمین کی پیداوار میں سے ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز پیدا کردے"۔

موسیٰ علیہ السلام اور مسئلہ آبنوشی

واذ استسقى موسىٰ لقومه فقلنا اضرب بعصاك الحجر

فانفجرت منه اثنتا عشرة عینا قد علم کل اناس مشربھم○

(پارہ۱، البقرہ، آیت: ۶۰)

"اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنے عصا کو پتھر پر مار سو اس سے بہہ نکلے بارہ چشمے تحقیق پہچان لیا ہر قبیلہ نے اپنا گھاٹ (یعنی اپنا اپنا چشمہ ہر قوم کے لئے جدا جدا نامزد کیا گیا)"۔

موسیٰ علیہ السلام اور قومی نمائندوں کا انتخاب

واختار موسیٰ قومه سبعین رجلا لمیقاتنا○

(پارہ۹، الاعراف، آیت: ۱۵۵)

اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے ستر مرد (نمائندے) ہمارے وعدہ کی جگہ پر لانے کے لئے منتخب کر لئے"۔

موسیٰ علیہ السلام اور قتل کی تفتیش

واذ قال موسیٰ لقومه ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ○

(پارہ۱، البقرہ، آیت: ۶۷)

"اور جب موسیٰ علیہ السلام نے (قوم کے استفسار پر) کہا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو"۔

موسیٰ علیہ السلام اور اسلامی آئین

وکتبنا له فی الالواح من کل شیء موعظة وتفصیلا لکل شیء○

(پارہ۹، الاعراف، آیت: ۱۴۵)

"اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی"۔

قرآن کریم کی ان چند آیات سے واضح ہو جاتا ہے، کہ نبوت اور نبوت کی تعلیمات امت مسلمہ کی دنیا اور آخرت کی رہنمائی اور دونوں جہانوں کی ترقی اور فلاح کے لئے جامع ہیں اور "نبی" دونوں کا جامع عالم اور معلم ہوتا تھا اگرچہ نبی کا علم "لدنی" ہوتا ہے۔

داؤد علیہ السلام اور دفاعی آلات جنگ

داؤد علیہ السلام نے دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ مجاہدین اور اسلامی فوج کے بچاؤ اور دشمن کی مار سے تحفظ دلانے کی غرض سے دفاعی آلات (زرہ) ایجاد کئے، جس کی صنعت اور کاریگری کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تعلیم و تربیت اور مناسب قوت عطا فرمائی اسی زرہ کی ترقی یافتہ شکل پیٹریاٹ میزائل کے طور پر جنگِ عراق میں دیکھنے میں آئی۔

والنا له الحديد. ان اعمل سٰبغٰت وقدر فی السرد واعملوا صالحاo (پارہ ۲۲، السبا، آیت: ۱۱)

"اور ہم نے داؤد علیہ السلام کے لئے لوہا نرم کر دیا تھا کہ کشادہ زرہیں بنا اور اندازے سے ان کی کڑیاں جوڑ اور تم سب نیک کام کرو"۔

سلیمان علیہ السلام اور تسخیرِ ہوا

ولسلیمٰن الریح غدوها شهر و رواحها شهرo

(پارہ ۲۲، السبا، آیت: ۱۲)

"اور ہوا کو سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا تھا، جس کی صبح کی منزل مہینے بھر کی مسافت تھی اور شام کی منزل مہینے بھر کی مسافت تھی"۔

ظاہر بات ہے کہ جب ہوا سلیمان علیہ السلام کے تابع تھی تو یقیناً تسخیر اور اسے کنٹرول میں رکھنے کے علوم آپ کو دیئے گئے جن کے ذریعے سلیمان علیہ السلام ہوا کو اپنے تصرف میں لاتے تھے کیونکہ عمل بغیر علم کے ناممکن ہے۔

سلیمان علیہ السلام اور علم معدنیات

واسلنا له عین القطر ○ (السبا، آیت: ۱۲)

"اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے تانبے کا چشمہ بہادیا"۔

سلیمان علیہ السلام اور فن تعمیر و مصوری و صنعت

یعملون له ما یشآء من محاریب وتماثیل وجفان کالجواب وقدور راسیٰت ○ (السبا، آیت: ۱۳)

"(کاریگر) بناتے تھے سلیمان علیہ السلام کے لئے جو کچھ وہ چاہتے فوجی چھاؤنیاں، جنگی نقشے، تالاب جیسے لگن اور جمی رہنے والی دیگیں"۔

سلیمان علیہ السلام اور عسکری علوم

وحشر لسلیمان جنوده من الجن والانس والطیر فهم یوزعون ○

(پارہ ۱۹، النمل، آیت: ۱۷)

"اور سلیمان علیہ السلام کے لئے جمع کی جاتی تھیں ان کی فوجیں، جنوں، انسانوں اور پرندوں میں سے پھر ان کی جماعتیں بنائی جاتیں"۔

سلیمان علیہ السلام اور علم الالسنہ

وقال یا ایھا الناس علمنا منطق الطیر واوتینا من کل شیء○

(پارہ ۱۹، النمل، آیت: ۱۶)

"اور سلیمان علیہ السلام نے کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے اور ہمیں ہر قسم کے سازوسامان دیے گئے ہیں"۔

فتبسم ضاحکا من قولھا○ (پارہ ۱۹، النمل، آیت: ۱۶تا۱۹)

"پھر سلیمان علیہ السلام چیونٹی کی بات سن کر مسکرا کر ہنس پڑے"۔

سلیمان علیہ السلام اور حیوانات کی دیکھ بھال

وتفقد الطیر فقال ما لی لا اری الھدھدام کان من الغائبین○

(پارہ ۱۹، النمل، آیت: ۲۰)

"اور پرندوں کی حاضری لی تو کہا کیا بات ہے، جو میں ہدہد کو نہیں دیکھتا کیا وہ غیر حاضر ہے"۔

اذ عرض علیہ بالعشی الصفنٰت الجیاد○

(پارہ ۲۳، سورہ ص، آیت: ۳۱)

"جب سلیمان علیہ السلام کے سامنے شام کے وقت تیز رو گھوڑے حاضر کیے گئے"۔

سلیمان علیہ السلام کا برق رفتار رسد و ترسیل کا نظام

قال الذی عندہ علم من الکتاب انا اٰتیک بہ قبل ان یرتد الیک

طرفك فلما راٰه مُستَقِرّاً عنده قال هذا من فضل ربی ○

(پارہ ۱۹، النمل، آیت: ۴۰)

"اس شخص نے کہا جس کے پاس کتاب کا علم تھا، میں اسے (تخت بلقیس کو) تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے لا دیتا ہوں، پھر اسے جب (سلیمان نے) اپنے روبرو رکھا ہوا دیکھا تو کہنے لگا یہ میرے رب کا فضل ہے"۔

سلیمان علیہ السلام، صنعت شیشہ گری اور شیش محل

ملکہ بلقیس کی آمد پر ہنگامی طور پر آپ نے شیشے کا ایک محل بنوایا جس کا فرش دیکھنے میں پانی کا دریا نظر آتا تھا، شاید آپ نے شیشے کے فرش کے نیچے پانی کی موجیں بہادی تھیں۔

قال انه صرح ممرد من قواریر ○ (پارہ ۱۹، النمل، آیت: ۴۴)

"سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو بتایا کہ یہ تو شیشے سے بنا ہوا محل ہے (پانی کی موج نہیں)"۔

ایک ضروری وضاحت

واضح رہے کہ اس عالم میں اللہ تعالیٰ نے اسباب اور مسببات، علل اور معلولات کا ایک مربوط سلسلہ قائم کیا ہوا ہے، اسباب کا کسب تو بے شک بندہ کرتا ہے، مگر اس کا خالق اللہ تعالیٰ ہے قرآن کا طرز بیان کچھ یوں ہے کہ کبھی تو مسببات اور نتائج کی نسبت بندہ کی طرف کرتا ہے اس لئے کہ وہ ان کے اسباب و علل کا سبب ہے، اور بسا اوقات اس کی نسبت اللہ تعالیٰ اپنی طرف کرلیتا ہے، جس کے لئے ضروری نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ بطور خرق عادت بغیر اسباب عادیہ کے وجود میں لایا ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کے کسب کا واسطہ چھوڑ کر خالقِ اسباب کی طرف نسبت کردی اگرچہ اس کا وجود اسباب عادیہ کے تحت

ہوا ہے مثلاً ارشاد ربانی ہے:

ومما اخرجنا لکم○ (پارہ ۳، البقرہ، آیت: ۲۶۰)

"(تم عشر یا نصف عشر دیا کرو) ان تمام چیزوں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکال باہر کیں"۔

دیکھئے زمین دار، زمینی پیداوار کے حصول میں کتنے اسباب بروئے کار لاتا ہے، سائنسی علوم اور جدید زراعتی آلات استعمال کرتا ہے۔ ایک مسلسل جدوجہد کے ساتھ خون پسینہ ایک کرکے پیداوار حاصل کرتا ہے، مگر یہ انسانی اسباب بھی چونکہ بذات خود کوئی حقیقت نہیں رکھتے اس لئے اسے کالعدم قرار دے کر پیداوار کے حصول کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کرتے ہوئے فرمایا۔ "جو کچھ ہم نے تمہارے لئے زمین سے باہر نکالا" جس سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ گویا بطور خرق عادت اور معجزہ، اللہ نے ایسا کیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ بندہ کو اس میں دخل ہے۔

عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے لئے تانبے کے چشمے بہادینے کی جو بات کی ہے، وہ اسباب عادیہ کے تحت ہو جیسے کہ آج کل سائنس دانوں کے لئے جملہ معدنیات کے چشمے بہادینے کا فیض عام جاری ہے، ایسے ہی دیگر کئی ایجادات جن کی ابتدا انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں ہوئی ہو اسباب عادی کے تحت ہوں، نہ کہ بطور معجزہ مگر پھر بھی انبیاء علیہم السلام کو ابتداءً ایسے علوم کی لدنی عطاء کو یقیناً معجزہ ہی کہا جائے گا خصوصاً جب کہ ان کا ظہور بحیثیت تصدیق نبی ہوا ہو۔

لیکن واضح رہے کہ یہ بات میں نے ایک نکتے کے طور پر بیان کی ہے، اور صرف بعض مقامات میں اس کا احتمال ہو سکتا ہے، اکثر معجزات میں ایسے احتمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً قرآن کریم کا اعجاز، ناقۂ صالح علیہ السلام وغیرہ، لاتعداد معجزات کا ظہور فوق الاسباب ہوا ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کے معجزات پر من حیث المعجزہ ایمان لانا ضروری ہے۔

یوسف علیہ السلام اور علم اقتصادیات

قال اجعلنی علی خزآئن الارض انی حفیظ علیم○

(پارہ ۱۳، یوسف، آیت:۵۵)

"یوسف علیہ السلام نے کہا مجھے ملکی خزانوں پر مامور کردو بے شک میں خوب حفاظت کرنے والا اور جاننے والا ہوں"۔

عیسیٰ علیہ السلام اور علم تخلیق وایجاد

انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللّٰہ○ (پارہ ۳، آل عمران، آیت:۴۹)

"میں تمہارے لئے مٹی سے پرندہ کی شکل بنادیتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں، تو وہ اللہ کے حکم سے اڑنے والا ہو جاتا ہے"۔

عیسیٰ علیہ السلام اور علم طب

وابرئی الاکمہ والابرص○ (پارہ ۳، آل عمران، آیت:۴۹)

"اور میں مادرزاد اندھوں اور مرض برص (کوڑھ) کا علاج کرتا ہوں"۔

عیسیٰ علیہ السلام اور مسئلہ خوراک

قال عیسی ابن مریم اللھم ربنا انزل علینا مآئدۃ من السمآء الآیہ○ (پارہ ۷، المائدہ، آیت:۱۱۴)

"مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام نے کہا اے اللہ اے ہمارے رب! ہم پر

بھرا ہوا خوان آسمان سے نازل فرما"۔

تشریح : عیسیٰ علیہ السلام کے امتی حواریوں نے آپ علیہ السلام سے خزانہ غیب میں سے ایک خوان اور کھانے کی درخواست کی کہ آپ بطور معجزہ اور خرق عادت، اللہ تعالیٰ سے طلب کرلیں۔ جس سے ہمیں دوہرا فائدہ ہوگا ایک مادی کہ ہم اس دنیا میں پیٹ بھر کر کھائیں گے اور دوسرا روحانی کہ آپ کی نبوت پر ہمارا ایمان مزید مستحکم ہو کر ہمارے قلبی اطمینان کا باعث بنے گا۔

عیسیٰ علیہ السلام اور علم قیافہ

وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم○

(پارہ ۳، آل عمران، آیت: ۴۹)

"اور میں تمہیں بتا دیتا ہوں جو کچھ تم کھا کر آؤ اور جو اپنے گھروں میں رکھ چھوڑو"۔

اس علم نے، جو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بطور معجزہ دیا تھا آج باقاعدہ ایک فن کی شکل اختیار کرلی ہے، جسے علم قیافہ، علم پیش بینی، علم تخزیص و اندازہ اور علم فراست کہا جاتا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام اور مردوں کو زندہ کرنا

واحی الموتیٰ باذن اللہ○ (پارہ ۳، آل عمران، آیت: ۴۹)

"اور میں اللہ کے حکم سے مردے زندہ کرتا ہوں"۔

احادیث سے ثابت ہے کہ قیامت کے قریب "دجال" مردہ کو زندہ کرے گا۔ آج کل یورپ کے سائنس دان تجربات کر رہے ہیں، بعض اخباری بیانات کے مطابق وہ کتے کو دوبارہ زندہ کرنے میں کچھ کامیابیاں حاصل کرچکے ہیں۔

ایک لطیف نکتہ

یہاں عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ احیاء کا مطلب بے جان چیز کو جاندار بنانا ہی ہے، اس لئے کہ "موت" اور "حیات" کا یہی معنی اور مفہوم متبادر ہے۔ البتہ اس سے پہلے ذکر شدہ معجزہ کہ آپ علیہ السلام "مٹی سے پرندے (اڑنے والی چیز) کی شکل بنادیتے تھے اور پھر اس میں پھونک مارتے تو وہ ہوا میں اڑنے والی چیز بن جاتی"۔

طیر (اڑنا) یا طائر (اڑنے والا) کے متعلق علامہ راغب یوں وضاحت فرماتے ہیں۔

الطائر کل ذی جناح یسبح فی الھواء وغبار مستطار وفرس مطار للسریع. (المفردات۔ صفحہ ۳۱۲)

"طائر اڑنے والا یعنی ہر پروں والا جو ہوا میں تیرتا ہے، اور ہوا میں اڑنے والا غبار یا تیز رفتار گھوڑا"۔

مطلب یہ کہ طیر (اڑنا) طائر (اڑنے والا) کے مفہوم میں کافی وسعت ہے، جس کے ساتھ احیاء موتی یعنی بے جان کا جاندار بنانا ضروری نہیں شاید اس لئے احیاء موتی کے معجزے کا ذکر اس کے بعد دوبارہ کیا گیا اگر اڑنے والی شکل بنانے کے ساتھ بے جان مٹی کے پتلے کا جاندار بننا لازم ہوتا تو ان دو معجزوں میں بظاہر ایک قسم کی تکرار لازم ہوتی ہے۔

حضور علیہ السلام کا عروج اور برق رفتاری

علوم الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دونوں شعبے جن کا تعلق کائنات اور مادیات سے ہے، ایمانیات اور روحانیات سے وابستہ ہیں ان کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت سے ہوئی اور ان کے کمال اور عروج کی انتہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برق رفتار سفر معراج پر ہوئی۔ جس کا تذکرہ قرآن و حدیث میں موجود ہے۔

معجزات انبیاء علیہم السلام کے متعلق ایک ضروری وضاحت

اسلامی تعلیمات اور اصولوں کے پیش نظر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات کے تین بڑے اہم فائدے ہیں۔

(۱) انسانوں کے لئے روحانی اور ایمانی فوائد کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ یعنی معجزہ کے ظہور کے نتیجہ میں مدعی نبوت کی صداقت اور اس کی تعلیمات کی حقانیت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس لئے لوگ اس پر ایمان لا کر فلاح اور نجات کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔

(۲) اسی معجزہ سے انسانوں کے لئے مادی فوائد کے حصول اور ان کی طرف رہنمائی اور ترغیب کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔ جس کی طرف قرآن کریم نے خود قصہ حوارین اور معجزہ "مائدہ" میں واضح اشارہ کر دیا ہے۔

قالوا نریدان ناکل منھا وتطمئن قلوبنا ونعلم ان قد صدقتنا○

(پارہ ۷، المائدہ، آیت: ۱۱۳)

"(حوارین نے کہا اے عیسیٰ علیہ السلام) ہم چاہتے ہیں کہ اس (خوان عیب) میں سے ہم کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہم سے سچ کہا ہے"۔

دیکھئے یہاں قرآن کریم نے مذکورہ بالا دونوں فوائد کی تصریح کر دی ہے۔

(۳) جب اللہ تعالیٰ کسی پیغمبر کے ہاتھوں کوئی معجزہ ظہور میں لاتا ہے، تو گویا یہ انسانیت کے لئے ایک اشارہ ہوتا ہے، کہ اسباب کے تحت ایسا ہونا اور کرنا ممکن ہے (بجز اس معجزہ کے کہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہو کہ ایسا تم ہرگز نہیں کر سکتے مثلاً اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ "کوئی بھی قرآن کریم کی سورتوں جیسی ایک سورت بھی نہیں بنا سکتا")۔

یعنی بطور معجزہ کسی چیز کا ظاہر ہونا اس چیز کے ممکن ہونے کے لئے دلیل ہے۔ اس طرح معجزات انبیاء علیہم السلام نے انسانوں کی ترقی اور عروج کے لئے ایک عظیم شاہراہ کھول دی ہے۔

خلاصۂ کلام :

انبیاء علیہم السلام کے علوم کے دو شعبے ہیں، ایک کا تعلق ہے ایمان، تہذیب نفس، تہذیب اخلاق اور اصلاح معاملات کے ساتھ۔ اور دوسرے کا تعلق ہے خلافت ارض، تسخیر کائنات اور حاکمیت کے ساتھ، انہی جملہ علوم کو علوم آدم اور علوم الانبیاء یا اسلامی علوم کہا جاتا ہے، جن لوگوں اور قوموں نے دونوں علوم یا دوسرے الفاظ میں حقیقی اسلامی علوم اپنائے وہ دونوں جہانوں کے مالک اور دونوں جہانوں میں آقا اور حاکم بنے۔ اس کے برعکس جن قوموں نے ایمان اور اخلاق و عبادات کے علوم چھوڑ کر دنیائے فانی کے تسخیر کے علوم کو قبلۂ مقصود بنایا، وہ بے شک ان علوم کے فطری نتیجے کے طور پر صرف مقام حاکمیت اور آمریت کو اس دنیا میں اپنا سکے مگر قیامت کی دائمی نعمتوں سے محروم ہو گئے۔

اور جن لوگوں نے اپنی زندگی ایمانیات اور اخلاقیات کے علوم اور اعمال کے لئے وقف کر لی، وہ اگرچہ فرشتہ صفت بن کر قیامت کی دائمی نعمتوں کے مستحق بنے مگر اس دنیا میں خلافت اور حاکمیت کی بجائے مامور اور غیر کے محکوم رہے، جس طرح فرشتے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز اور منقاد ہوئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فطرتی قوانین ہیں جن میں تبدیلی ناممکن ہے۔

فطرت اللہ فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ.

اللہ تعالیٰ نے ان فطرتی قوانین (اسباب و مسببات اور علل و معلولات) میں دوست اور دشمن کا امتیاز نہیں کیا۔ بلکہ دونوں کے لئے یہ دروازہ یکساں کھلا رکھا ہے۔

کلا نمد هولآء وهولآء من عطاء ربك وما كان عطاء ربك محظورًا.

ترجمہ: ہر ایک گروہ (مسلمانوں اور کافروں) کے ساتھ میں مدد کرتا ہوں (اس کی محنت کا پھل دیتا ہوں) یہ تیرے رب کی عطاء، اور تیرے رب کی عطاء کسی کے لئے ممنوع نہیں ہے۔

اگر جامع علم رکھنے والے نمائندے دستیاب نہ ہوں

چونکہ امت میں جامع علمیت رکھنے والے ارکان شوریٰ کا وجود تقریباً ناممکن ہے لہٰذا اس کی متبادل اور آسان صورت یہی ہے، کہ مملکت کے ضروری شعبوں کے لئے شوریٰ کے ارکان کی نشستیں متعین کی جائیں اور ہر ایک شعبے کے لئے ایسے ماہرین کی تعداد مخصوص کی جائے جن میں متعلقہ امور اور پیش آمدہ مسائل کے حل کرنے کی قوت استنباط موجود ہو اور ہر ایک شعبے سے متعلقہ مسائل میں صرف اسی شعبے کے منتخب کردہ ارکان کی رائے کو معتبر سمجھا جائے۔ قرآن مجید میں اس کی واضح ہدایت موجود ہے:

واذا جائهم امر من الامن او الخوف اذا عوابه ولو ردوه الى الرسول والى اولو الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم○

(پارہ ۵، النساء، آیت: ۸۳)

"اور جب ان کے پاس کوئی خبر (یا مسئلہ) امن یا بدامنی کی یعنی خوف کی آپہنچتی ہے، تو اسے مشہور کر دیتے ہیں، اور اگر اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب کے سامنے پیش کرتے تو ماہرین اور محققین اس کی تحقیق کر کے اسے حل کر لیتے"۔

رکن شوریٰ کے لئے شرط چہارم:

علمی مہارت کے ساتھ ساتھ وہ صاحب بصیرت بھی ہو یعنی اسے اپنے متعلقہ شعبہ کے مسائل میں (۱) اقوام عالم (۲) عالمی مسلمان امت (۳) اور اندرون ملک رعیت کے

رسم وروش، ضروریات اور عرف وعادت کی سیاسی بصیرت اور سمجھ بوجھ حاصل ہو اس لئے کہ دین اسلام میں وقت کے تقاضے کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لئے کافی لچک ہے۔ منصوصات کے سوا باقی احکامات میں لوگوں کی عرف وعادت اور ضرورت خاصہ وعامہ (جسے فقہاء کی اصطلاح میں "بلوی" اور "عموم بلوی" کہا جاتا ہے) ایک شرعی دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں، عرف کی تبدیلی اور عموم بلوی کے وجود سے شرعی احکامات بدلتے رہتے ہیں۔ فقہاء کا قاعدہ ہے کہ (یتغیر الاحکام بتغیر الازمان)

(تفصیل کے لئے دیکھئے رسائل ابن عابدین جلد ۱، صفحہ ۴۴، شرح المجلہ کا مقدمہ اور مختلف دفعات و قواعد الاشباہ والنظائر للسیوطی اور علامہ ابن قیم جوزی کی اعلام الموقعین)

شرط پنجم :

یہ رکن شوریٰ متعلقہ شعبہ کے لئے مسلمانوں کے خیال میں ثقہ اور قابل اعتماد بھی ہو، اسی شرط کو پورا کرنے کے لئے اسلامی شرائط پر پورا اترنے والے ووٹروں سے بذریعہ انتخاب رائے لی جائے، جس امیدوار کے حق میں ووٹ زیادہ پڑیں وہی مسلمانوں کے لئے ثقہ اور قابل اعتماد ہوگا۔

شرط ششم :

امیدوار نے مسلمانوں کے ووٹ دولت، لالچ، فراڈ، جعل سازی یا دھمکی وبد معاشی سے حاصل نہ کئے ہوں۔

درحقیقت امیدوار کے لئے اصل شرائط تین ہیں، جو کہ لازمی ہیں۔ (۱) ایمان، (۲) عدالت، (۳) علم۔ باقی جتنی بھی شرائط ہیں وہ ان تین شرطوں کی تفصیل اور فروع ہیں۔

باب چہاردہم

کیا موجودہ جمہوری طرز پر عورت کے لئے ووٹ دینا یا رکن شوریٰ بننا جائز ہے

دین جمہوریت جس میں جائز اور ناجائز کے لئے سب سے اعلیٰ تر دلیل عوام کی خواہشات نفسانی ہیں۔ اس دین میں اصل مطلوب اور مقصود ہی یہ ہے کہ ہر جگہ مرد اور عورت دوش بدوش ایک دوسرے کے لئے باعث تسکین ولذت ہوں ایک مرد کسی ملازمت میں افسر ہے، تو لڑکی اسسٹنٹ ہونی چاہیے، اگر وہ پائلٹ ہے تو یہ ایئر ہوسٹس ہو، اگر مرد اسمبلی اور سینٹ کا اسپیکر اور چیئرمین ہے، تو عورت کا ڈپٹی اسپیکر اور ڈپٹی چیئرمین ہونا لازمی ہے۔

دین جمہوریت کے پرستاروں کے پورے دین کا خلاصہ ہی یہ ہے، کہ جنس نسوانی کو متاع بے بہا اور مال غنیمت بنایا جائے یہاں تک کہ انسانی ضروریات کے روزمرہ استعمال کی چیزوں پر اگر عورت کی نیم برہنہ تصویر نہ ہو تو وہ بھی بے مزہ ہیں۔ ٹی وی اور سینما کے پردے سے اگر عورت کو الگ کر دیا جائے تو شاید کوئی اسے سہواً بھی نہ دیکھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ دین جمہوریت کے حاملین کی توجہ مساجد اور اسلامی عبادات پر نہیں ورنہ وہ یہاں بھی اسی مساوات کا ہنگامہ بپا کرتے کہ لڑکیاں بھی صفوں میں مردوں کے دوش بدوش کھڑی ہوں اور امام خطیب کے ساتھ ایک لڑکی اسسٹنٹ کے طور پر ضروری ہے۔

اور حقیقت بھی یہی ہے، کہ انسان اللہ کی بندگی سے آزاد ہو کر بندہ نفس وخواہش بن جائے تو عورت کے ہمدم اور ہم قدم ہوئے بغیر اس کے لئے اس جہان میں ہر محفل اداس، ہر بہار خزاں، ہر کھیل اور تفریح خشک وبے لطف، اور ہر نعمت کدہ غمکدہ بن کر رہ جاتا

ہے۔ اس لئے دین جمہوریت میں الیکشن بغیر نسوانی رنگ رلیوں کے خاک الیکشن، اور اسمبلی کا اجلاس بغیر سُرمگین آنکھوں، لب سرخ اور کاکل مشکین کے خاک اجلاس ہو گا۔ اس دین میں مرد اور عورت کا ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھنا نہ صرف جائز بلکہ فرض ہے۔

مگر جس دین نے انسانوں کو نفس کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ تعالیٰ کی بندگی اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا بہ رضا و رغبت عہد اور حلف ان الفاظ میں پڑھوایا ہے، "اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً عبده ورسوله"۔

اس دین کے قوانین اور تقاضے کچھ اور ہی ہیں، جن کا پاس رکھنا ہر کلمہ گو کے لئے لازم ہو جاتا ہے۔

دین اسلام میں کسی چیز کے جواز اور عدم جواز کا ایک بنیادی اصول

شریعت اسلامی میں کسی چیز کے متعلق جواز یا عدم جواز کا حکم محض اس چیز کی ذات اور حقیقت کو سامنے رکھ کر نہیں لگایا جاتا بلکہ اس چیز سے متعلق جملہ امور، نفع و نقصان کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفید تر اور انفع ہونا یا باعث ضرر و فساد ہونا ہی جواز اور عدم جواز کا مدار گردانا جاتا ہے۔ بسا اوقات کوئی کام اپنی ذات اور حقیقت کے لحاظ سے ناجائز ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ دیگر متعلقہ فوائد اور ثمرات کے سبب نہ صرف جائز ہو جاتا ہے، بلکہ اس کا کرنا شرعاً ضروری اور لازم ہو جاتا ہے، جیسے بدامنی اور فساد پھیلانے والوں کے خلاف جنگ کرنا، یا کسی مرض کے ازالہ کے لئے طبیب اور ڈاکٹر کا عمل جراحی جو کہ ذاتی حیثیت کے اعتبار سے خون خوارگی اور درندگی ہے، مگر متوقع نتائج کے حصول کے لحاظ سے اصلاح اور ہمدردی ہے۔ جہاد، عید الاضحیٰ کی قربانی، حدود اور قصاص بذات خود نہیں بلکہ نتائج کے لحاظ سے انتہائی مستحسن امور ہیں۔ اسی طرح عید کے دن روزہ رکھنا یا سورج، آگ بت وغیرہ چیزوں کے سامنے

خالص ایمانی جذبہ کے تحت اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کرنا، نماز پڑھنا اگرچہ بذات خود نیک کام اور عبادت ہے، مگر اس کے ساتھ پیوست اور متعلق جو برائی ہے، یعنی اول الذکر میں اللہ تعالیٰ کی مہمانی سے اعراض اور انکار اور مؤخر الذکر میں بت پرستوں اور مشرکین سے مشابہت۔ ان متعلقہ برائیوں کے سبب شرعاً ناجائز اور ممنوع ہیں۔ اس قاعدہ اور قانون شرعی کو سمجھنے کے بعد اب اصل مسئلہ اور موضوع کی طرف آیئے۔

عورت کا پولنگ بوتھ پر ووٹ ڈالنا یا شوریٰ کے لئے بطور رکن منتخب ہونا بذات خود تو ایک جائز امر ہے، اس لئے کہ ووٹ شرعی لحاظ سے شہادت ہے، اور شریعت میں عورت حدود وقصاص کے سوا دیگر امور میں شہادت دینے کی اہل ہے البتہ اس فرق کے ساتھ کہ بعض موقعوں پر دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہے، اور بعض موقعوں پر ایک عورت کی شہادت دو مردوں کی شہادت کے خلاء کو پر کرلیتی ہے، جیسے کسی بچے کے بارے میں دایہ کی شہادت کہ یہ فلاں عورت سے پیدا ہوا ہے۔

اگر ووٹ کو مشورہ تصور کیا جائے تو بھی جائز ہے اس لئے کہ عورت کا مشورہ دینا بھی شرعی لحاظ سے جائز ہے، نیز عورت کی "توکیل" بھی جائز ہے خواہ عورت کسی اور کو وکیل بنائے یا وہ خود کسی کی طرف سے وکیل بنے اسی طرح عورت کی سفارش بھی بذات خود جائز ہے۔

عورت کا مشورہ اور اس پر عمل کی مثالیں

جناب حضرت شعیب علیہ السلام کی دو بیٹیوں میں سے ایک نے اپنے والد کو مشورہ دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنے پاس نوکر رکھ لیں کیونکہ وہ بہت امانت دار قوی اور باصلاحیت انسان ہیں۔

قالت احداھما یآ ابت استاجرہ ان خیر من استاجرت القوی

الامین ○ (پارہ ۲۰، القصص، آیت:۲۶)

"شعیب کی دو بیٹیوں میں سے ایک بولی اے ابا جان اسے نوکر رکھ لے بیشک بہتر نوکر جسے تو رکھنا چاہتا تھا وہ یہی ہے، جو زور آور اور امانت دار ہو"۔

چنانچہ شعیب علیہ السلام نے ایسا ہی کیا تفصیل قرآن کریم کی مذکورہ سورت میں پڑھئے۔

حضور علیہ ﷺ کو آپ کی زوجہ نے مشورہ دیا

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب مشرکین کے ساتھ فیصلہ طے ہوا کہ اس سال حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ مکہ مکرمہ میں عمرہ کے لئے نہیں جاسکیں گے بلکہ آئندہ سال جائیں گے، تو احرام سے نکلنے کے لئے حضور علیہ السلام نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مجمع کو فرمایا کہ ہر ایک اٹھے اور اپنی قربانی کا جانور ذبح کر کے سر کے بال کٹوائے اور احرام سے نکل جائے لیکن کوئی بھی ایسا کرنے کے لئے آمادہ نظر نہ آیا۔ بلکہ حضور علیہ السلام نے تین مرتبہ اس بات کو دہرایا اس کے بعد آپ ﷺ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے خیمے میں تشریف لے گئے آپ کی زوجہ ام سلمہؓ نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ خود اپنی قربانی کا اونٹ ذبح کیجئے اور اپنے بال صاف کر کے احرام سے نکل جایئے لوگوں سے کچھ نہ کہئے چنانچہ آپ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا آپ کو دیکھ کر تمام صحابہ اپنی قربانی کے جانوروں کو ذبح کر کے احرام سے نکل آئے۔ دیکھئے یہاں خاوند اور بیوی کے نجی معاملہ میں نہیں بلکہ امت کے اجتماعی مسئلہ میں حضور ﷺ نے عورت کے مشورے پر عمل کیا۔

(بخاری جلد ۱، کتاب الشروط، صفحہ ۳۸۰)

بچے کا دودھ چھڑانے کے متعلق خاوند اور بیوی کا مشورہ

سورۃ البقرہ آیت ۲۳۳ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر خاوند اور بیوی آپس میں رضامندی اور مشورہ سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

عورت کا مفتی ہونا

حضور ﷺ کی وفات کے بعد بہت سے صحابہ کرام کئی اہم مسائل میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فتویٰ اور حکم طلب فرماتے تھے۔

عورت کی شہادت

قرآن کریم، سنت نبوی اور فقہاء کرام نے عورت کی شہادت کی صحت کی تصریح کی ہے۔

خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب میں عورتوں سے مشورہ

جب حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کو اختیار دیا کہ آپ ہم دونوں میں سے جس کو چاہیں خلیفہ منتخب کرلیں، منتخب خلیفہ ہم دونوں اور جملہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہوگا تو حضرت عبدالرحمانؓ تین دن اور تین رات متواتر اہل مشورہ اور دیگر لوگوں سے مشورہ کرتے رہے، اس دوران آپ نے بعض ذی رائے عورتوں کے دروازے پر جاکر پردے کی اوٹ میں ان سے بھی مشورہ لیا۔

یہی وہ دلائل ہیں جن سے عورت کے لئے ووٹ ڈالنے اور مشورہ دینے کا بذات خود

جواز ثابت ہوتا ہے۔ رکن شوریٰ کو بھی ایک حیثیت سے سربراہ کو مشورہ دینا ہوتا ہے یا سربراہ کے انتخاب میں اس نے ووٹ دینا ہوتا ہے، لہٰذا اس لحاظ سے اس کی حیثیت بھی عام دوٹر کی سی ہے تو مذکورہ دلائل کی روشنی میں عورت کے لئے شوریٰ کا رکن بننا بھی بذات خود جائز معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جید علماء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ مگر یاد رہے کہ جتنے بھی جواز کے دلائل ذکر ہوئے ہیں یا اسی قسم کے مزید دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں یہ محض عورت کی ذاتی حیثیت کے اعتبار سے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ اس کے ساتھ کتنی شرعی اور اخلاقی برائیاں اور منکرات پیوست ہیں۔ مثلاً اگر کوئی عورت کسی قاضی کے سامنے شہادت دے رہی ہے، تو اس کی قبولیت کے لئے اوّلین شرط اس عورت کی عدالت اور تقویٰ ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ عدالت میں آتے جاتے وقت یہ عورت شرعی حجاب کی پابندی کرے گی تبرج جاہلیت یعنی بن سنور کر حسن و جمال کا مظاہرہ نہیں کرے گی ورنہ یہ عورت فاسقات کے زمرے میں آکر مردودۃ الشہادت ٹھہرائی جائے گی۔ عبد الرحمان بن عوفؓ نے جن عورتوں سے انتخاب کے سلسلے میں مشورہ طلب کیا تھا اس کے ساتھ یہ تصریح موجود ہے کہ آپ من وراء الحجاب یعنی پردے کی اوٹ میں ان سے ملے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اگرچہ نص قرآنی کی رو سے مومنین کی ماں ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ کسی لونڈی کی وساطت سے یا پردہ کی اوٹ سے فتویٰ دیا کرتی تھیں، باقی دودھ چھڑانے میں خاوند اور بیوی کا آپس میں مشورہ یا صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ کو حضرت امّ سلمہؓ کا مشورہ ان میں شرعی حجاب کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ بالا جملہ ماخذوں میں عورت کی شہادت، فتویٰ اور مشورہ میں کوئی خارجی شرعی برائی اور اخلاقی بے حیائی پیوست نہیں، لہٰذا ایسی گواہی، مشورہ، فتویٰ اور توکیل جائز ہوگی جیسے عید کے دنوں کے سوا دوسرے دنوں میں روزہ رکھنا، یا طلوع اور غروب یعنی ممنوع اوقات کے علاوہ نماز پڑھنا جائز ہے۔ مگر جہاں عورت کے ووٹ ڈالنے یا شوریٰ کی

رکنیت کے حصول کے ساتھ ان گنت منکرات، بے حیائیوں اور معاصی کا ارتکاب پیوست ہو گا وہاں عورت کے لئے ووٹ ڈالنا اور شوریٰ کی رکنیت حاصل کرنا ناجائز اور حرام ہو گا۔

مروجہ ووٹ یا رکنیت شوریٰ حاصل کرنے کے ساتھ منکرات

جیسا کہ آج کل کسی سے مخفی نہیں ہے کہ مروجہ الیکشن غنڈہ گردی، دھینگا مشتی، نعرہ بازی، ایک دوسرے کی تذلیل، پولیس کا لاٹھی چارج، فائرنگ، قتل و قتال، ڈھول، ریکارڈنگ، گانا بجانا، رقص و سرور، لڑکیوں کا تالیاں بجانا، منصوبہ بندی کے تحت زرق برق لباس پہن کر حسن کی نمائش کے ساتھ ووٹروں کو کھینچ کر لانے کے لئے پرکشش اور ترغیب کا جنسی سامان مہیا کرنا وغیرہ تمام منکرات روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں۔ جب کہ بے حیائی کا یہ عالم ہے کہ روزانہ اخبارات میں بڑی سرخیوں کے ساتھ یہ خبریں چھپتی ہیں کہ فلاں بڑی شخصیت کی بیوی، بہن یا بیٹی کو زبردستی اغوا کیا گیا، اور کئی مردوں نے اس سے اجتماعی بدکاری کی اور فلاں شہر کے بلدیاتی انتخابات میں امیدوار عورت کو اغوا کر کے اس کی آبروریزی کی گئی۔ یہ جملہ واقعات انتخابات کے دنوں میں عملاً پیش آتے رہتے ہیں۔

ایسے حالات میں عورت کے لئے ووٹ دینے یا ووٹ لینے کے لئے اپنے گھر سے باہر نکلنا از روئے شریعت حرام اور ناجائز ہے۔ اس میں کسی بھی طرح دین کی مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ نہ تو اس فساد کی اصلاح اس بات سے ہو سکتی ہے کہ مردوں کو نصیحت کی جائے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھ کر قرآنی تعلیمات پر عمل کریں۔ وہ تو یہی کہہ سکتے ہیں۔ بقول شاعر

کبھی مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ کر نیچی نظر اپنی
کوئی ان سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہو کر

اور نہ ہی اس کا علاج یہ ہو سکتا ہے کہ عورتوں کے لئے الگ پولنگ اسٹیشن ہوں اور

عورتیں برقع پہن کر ووٹ دینے کے لئے جایا کریں۔ خواہ ووٹ ڈالنے کے لئے احاطے الگ الگ کیوں نہ ہوں کیونکہ ہر گھر، ہر محلے اور ہر قریہ کے ووٹر، مرد وزن ایک گلی کوچے، ایک سڑک اور بازار ہی سے آئیں گے، جائیں گے تو صرف ووٹ کی پرچی ڈالتے وقت علیحدگی سے کیا حاصل جب کہ ذہنی شوق تو ایک دوسرے کو بہت قریب ہی لاتا ہے۔

؎ شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے درکار نیست
سیل بے رہبر بدریا میرساند خویش را

رہی برقع پوشی تو اس سے اگر علاج ممکن ہوتا تو روزمرہ اخبارات میں برقع پوش لڑکیوں کی شکایات اور حیا سوز واقعات دیکھنے میں نہ آتے۔ علامہ جامی فرماتے ہیں۔

؎ نکو رو تاب مستوری ندارد
چوں در بندی سر از روزن بردارد

اور یہ علاج کہ سرکاری پاسبانوں کے ذریعے ان عوامل کا سد باب کیا جائے تو میرے خیال میں یہ بات بلی کے ذریعے چوہوں کی چوکیداری کرانا ہوگی۔ ہم روزمرہ اخبارات میں زنا بالجبر، قتل وغارت گری کے جو واقعات پڑھتے ہیں، اس میں ہر جگہ سرکاری حفاظتی عملہ شریک جرم بتایا جاتا ہے۔

؎ چو کفر از کعبہ خیزد کجا ماند مسلمانی

مجلس شوریٰ (اسمبلی اور سینٹ) کے اجلاسوں میں پارٹیوں کے منتخب نمائندے جن عورتوں کو منتخب کرا کر لاتے ہیں، ان کا اگر قارئین نے اجلاسوں کے دوران مشاہدہ کیا ہو (ان شاہدوں میں بندہ خود شامل ہے) تو دیکھا ہوگا کہ ان عورتوں میں بیشتر ننگے سر، میک اپ کئے ہوئے آتی ہیں، جب بھی کوئی مسلمان رکن شوریٰ یا عالم دین، عورت کے بارے میں قرآن کریم کی کسی ایسی آیت کے حوالہ سے بات کرے جس میں اللہ تعالیٰ نے عورت کو تحفظ اور تقدس دلانے کی بات کی ہو یا عورت کے فطری اور طبعی تقاضے کے پیش نظر امتیازی احکامات

صادر کئے ہوں یا فواحشات اور بے حیائیوں کے سدباب کے لئے سخت احکامات نازل فرمائے ہوں۔ مثلاً

۱۔ زنا کے متعلق کوڑے لگانے یا سنگسار کرنے کا حکم۔

۲۔ یا شرعی حجاب اور پردے کے احکامات۔

۳۔ یا عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی سے آدھا قرار دینے کی آیات۔

۴۔ یا میراث میں عورت کے لئے آدھے حصے کے متعلق آیات قرآنی۔

۵۔ یا قحبہ خانوں اور عورتوں کے ناچ اور رقص و سرور پر شریعت کی پابندیوں کے احکامات۔

۶۔ یا اندرون ملک اور بیرون ملک تماشائی مردوں کے سامنے لڑکیوں کے کھیل کود پر اسلام کی عائد کردہ پابندیوں کی بات۔

۷۔ یا مرد اور عورت کی مخلوط تعلیم، ملازمتوں، اور خدمت گذاری کے مواقع کے سدباب کی بات۔

غرض جو کوئی بھی خدا اور رسول کے مذکورہ احکامات کی بات کرے یا کوئی باغیرت مسلمان رکن شوریٰ غیرت اور حمیت کی بات کرے تو یہ خواتین ممبران آگ بگولہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور چیخ چیخ کر بولنے لگتی ہیں، اور غصے سے ادھر ادھر دیکھتے وقت سر کو جھٹکا دیکر زلف پریشان سے رقص کی سی کیفیت کا ماحول پیدا کر لیتی ہیں۔ اور پھر برسنے لگتی ہیں کہ یہ ملاؤں کے دقیانوسی اور ظالمانہ قوانین ہیں، یہ مرد و زن کے مساوات کے خلاف غیر منصفانہ قوانین ہیں، یہ وحشیانہ اور ظالمانہ قوانین ہیں، ہم پاکستان میں ملاازم برداشت نہیں کرتے۔ ان ملاؤں کو تو عورتوں کے پیچھے پڑنے، ان کے خلاف فتویٰ دینے کے سوا اور کچھ نہ تو آتا ہے اور نہ ہی ان کا کوئی اور کام ہے۔ گویا کہ یہ احکامات سرے سے اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات ہیں ہی نہیں بلکہ یہ احکامات ملاؤں کی تنگ نظری کے نتیجے میں ان کے خود ساختہ

احکامات ہیں۔ (العیاذ باللہ)

اور پھر یہی عورتیں اخبارات اور یورپی ذرائع ابلاغ کی وساطت سے پوری دنیا میں قرآن وحدیث کے خلاف ملا ازم کے بہانے، توہین آمیز اور نفرت انگیز شور برپا کردیتی ہیں۔ ملک کے اندر اللہ اور رسول ﷺ کی قرآنی پابندیوں سے باغی عورتوں کے جلوسوں اور مظاہروں کا اہتمام کرتی ہیں، کہ ملاؤں نے عورت کے حقوق غصب کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جن میں سرِ مو برابر بھی مبالغہ آرائی نہیں۔ تو کیا ان سب کچھ کے باوجود کوئی باغیرت مسلمان عورت کے لئے رکنیت شوریٰ کے جواز کا فتویٰ دے سکتا ہے؟

الحاصل ان تمام برائیوں اور بے حیائیوں کا واحد علاج وہی ہے، جو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم جیسی ابدی کتاب میں نازل فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولىٰ○

(پارہ ۲۲، سورۃ احزاب، آیت: ۳۳)

"اور اپنے گھروں میں قرار اور وقار کے ساتھ رہو اور جاہلیت قدیمہ کی طرح بن سنور کر گھروں سے باہر نہ جاؤ"۔

نیز نبی کریم ﷺ کا اعلان ہے۔

المراة عورة فاذا خرجت استشرفها الشيطان. (جامع ترمذی، ابواب النکاح)

"عورت پوشیدہ چیز ہے پس جب بھی وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی تاک میں لگ جاتا ہے"۔

نیز فرمایا۔

ليس على النساء غزو، ولا جمعة ولا تشييع جنازة. (مجمع الزوائد جلد ۲، صفحہ ۱۷۰)

"عورتوں پر نہ تو جہاد کے لئے نکلنا فرض ہے، اور نہ نماز جمعہ فرض ہے اور نہ جنازہ

کے پیچھے جانا جائز ہے"۔

پس اگرچہ عورت کے لئے ووٹ ڈالنا یا کسی مجلس شوریٰ (اسمبلی اور سینٹ وغیرہ) کے لئے منتخب ہو جانا ایک جائز امر ہے، مگر موجودہ جمہوری نظام کے تحت مروجہ انتخابات میں مذکورہ حیا سوز اور کافرانہ قباحتوں کے ہوتے ہوئے ووٹ ڈالنا یا رکن شوریٰ منتخب ہونا عقل سلیم اور نقل صحیح کی روشنی میں ناجائز اور قبیح ہے، اور جب کبھی ایسا الیکشن اور ایسی شوریٰ ہو جو کہ مذکورہ جملہ قباحتوں سے پاک ہو تو وہ جمہوری نہ ہونے کی وجہ سے میری بحث کے دائرے سے باہر ہے۔

رہا یہ سوال کہ چونکہ عورت کا ضرورت کے لئے شرعی قوانین کا پاس رکھتے ہوئے گھر سے نکلنا جائز ہے، اور ووٹ ڈالنا یا رکن شوریٰ بننا بھی ضرورت ہے، لہٰذا اس کے لئے گھر سے نکلنا جائز ہونا چاہئے۔ تو یاد رہے کہ دین اسلام میں یہ سرے سے شرعی ضرورت ہے ہی نہیں۔ رہی دین جمہوریت کی بات تو اس میں قباحت اور ناجائز ہونے کا معیار عوام کی خواہشات ہیں، لہٰذا اس میں تو رنگینیاں ضروری اور لازم ہیں۔

اور اگر عورتوں کی طرف سے یہ کہا جائے کہ جب عورتوں کی نمائندگی اسمبلی اور شوریٰ میں نہ ہوگی تو ان کے حقوق ضائع ہو جائیں گے۔ تو خلاف حقیقت ہوتے ہوئے بھی اگر اس سوال کو درست تسلیم کیا جائے تو پھر بازاروں، تجارتی منڈیوں، مال و دولت کمانے کے مراکز، جامع مسجدوں، عیدگاہوں، غرض دین اور دنیا کے حصول کے اجتماعات میں عورتوں کو برابر کا شریک ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ جیسے مردوں کو دولت کے ڈھیر اور ثواب کمانے کی ضرورت ہے، اسی طرح یہ فطری خواہش عورتوں کی بھی ہے۔

اور اگر مذکورہ بالا اعتراض کا یہ جواب دیا جائے کہ چونکہ عورت کی جملہ دنیاوی ضروریات کو شریعت نے مرد کے ذمہ ڈال دیا ہے اس لئے عورت کو دکان وغیرہ چلانے یا دنیوی کاروبار میں شرکت کرنے کی ضرورت نہیں نیز جامع مسجد جا کر مذہبی مسائل سیکھنے کی

ذمہ داری بھی مردوں کے ذمہ ڈالی گئی ہے (وامر اهلك بالصلوٰة) کہ وہ ”نماز وغیرہ عبادات اور مسائل سیکھ کر اپنی گھر والیوں کو اس کا حکم دو“ اس سے صاف ظاہر ہے کہ گھر والیوں کے حقوق وفرائض (امر بالمعروف نهی عن المنکر) اللہ تعالیٰ نے گھر کے سرپرست کے ذمے ڈال دیئے ہیں۔ لہٰذا شوریٰ اور اسمبلی میں ان کی غیر موجودگی سے عورت کی حق تلفی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو (فہوالمقصود) ہم تو یہی کہتے ہیں کہ شریعت اسلامی نے عورتوں کے جملہ حقوق کا تحفظ کیا ہے۔ اگر سرمو حق تلفی بھی ہو تو اسلامی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہی اسے فوراً مفت انصاف ملے گا۔

مثلاً امیر المومنین عمر فاروق ؓ نے ایک فرمان جاری کیا کہ عورتوں کے مہر میں ایک محدود حد سے تجاوز نہ کیا جائے جسے ایک عورت نے چیلنج کیا کہ یہ حکم قرآن کی فلاں آیت کے خلاف ہے عمر فاروق ؓ نے فوراً اپنا حکم واپس لے لیا۔

پھر بھی اگر عورتوں کے کسی مسئلے پر اسمبلی یا شوریٰ میں بحث کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا جائے تو عورتیں، مرد ممبران کی وساطت سے جو شوہر، بیٹا، باپ، بھائی اور ذی رحم محرم ہوں، اپنے مسائل کو اسمبلی میں لے جائیں۔ خواتین، اخبارات، رسائل اور پمفلٹوں کے ذریعے اور اپنی انجمنوں کی وساطت سے یقیناً ہر کسی کو آگاہ کر سکتی ہیں۔ اس لئے ان بہانہ تراشیوں میں نہ تو کوئی حقیقت ہے اور نہ کوئی مقصد۔ بجز اس کے کہ خوش نما الفاظ سے عورتوں کو ورغلا کر باہر لایا جائے۔ اور پھر انہیں زینت محفل بنا کر ان کے نسوانی تقدس کو پامال کیا جائے۔

اسلام میں اقلیتوں کا جداگانہ انتخاب

دین اسلام نے ذمیوں کو (یعنی ان اقلیتی کافروں کو جو اسلامی مملکت کے اندر رہتے ہیں) وہ جملہ حقوق دیئے ہیں، جو مسلمانوں کو حاصل ہیں، اس پر مزید یہ کہ ان کو مذہبی رسوم

اور خورد و نوش کی اجازت دی ہے۔ نیز آپس کے معاملات کا ان کے دین کے مطابق فیصلہ کرنا بھی ان کے لئے جائز قرار دیا ہے۔ ایسے ہی انہیں اپنے نمائندے منتخب کرنے اور ان کے انتظامی امور کے لئے ان میں سے کسی ایک کو کوئی ذمہ داری سونپنا بھی جائز ہے، نیز بعض انتظامی امور میں ان سے مشورہ بھی لیا جاسکتا ہے۔

البتہ کوئی کلیدی اور اہم منصب ان کے حوالے کرنا جائز نہیں ہے۔ انہیں مملکت کے اہم مسائل میں رازدار بنانا بھی جائز نہیں، اور نہ ہی مذہبی امور یا سربراہ کے انتخاب میں ان کو حق رائے دہی دینا جائز ہے۔ نیز اسلام کے خلاف تقریر یا تحریر، یا اپنے کفر کا پرچار اور دعوت کفر دے کر کسی مسلمان کو مرتد بنانے کی بھی ان کو اجازت نہیں ہے۔

دین اسلام میں مشورہ کی اہمیت

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لا نفضوا من حولك فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم في الامر فاذا عزمت فتوكل على الله ان الله يحب المتوكلين○

(پارہ ۴، آل عمران، آیت:۱۵۹)

"پس اللہ کی رحمت کے سبب تو ان کے لئے نرم ہو گیا اور اگر تو تند خو اور سخت دل ہوتا تو البتہ یہ تیرے ارد گرد سے بھاگ جاتے پس انہیں معاف کردے اور ان کے واسطے بخشش مانگ اور کام میں ان سے مشورہ لیا کرو پھر جب تو کام کا ارادہ کر چکا تو اللہ پر توکل کر بے شک اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔

دیکھئے یہاں اللہ تعالیٰ حضور ﷺ جیسے صاحب عقل سلیم اور مجسمہ فراست کو بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشورہ کرنے کا حکم دے رہے ہیں اس لئے نہیں کہ

آپ ﷺ کی نسبت کوئی شخص زیادہ صائب الرائے تھا یا آپ ﷺ کے انفرادی فیصلے پر کسی صحابی کی طرف سے کسی تنقید یا اس کی سرتابی کا احتمال تھا، بلکہ صحابہ کی دلجوئی کے لئے تھا۔ جیسا کہ آیت کا سیاق خود بتا رہا ہے۔ اور یا امت کی تعلیم اور ہدایت کے لئے تھا جیسا کہ مفسرین نے ذکر کیا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوٰۃ وامرھم شوریٰ بینھم٥

(پارہ ۲۵، الشوریٰ، آیت: ۳۸)

”اور وہ لوگ جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ان کا کام باہمی مشورہ سے ہوتا ہے“۔

اس آیت کریمہ میں بھی مومنین کے اوصاف میں ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کے آپس میں مشورہ طلب امور مشورہ سے طے کئے جاتے ہیں۔

لغت کے اعتبار سے ”امر“ آرڈر، حکم، حکومت اور اہم واقعہ کے معنی میں آتا ہے۔ اور امر کی جمع امور ہے یہاں اس کے معنی حکومت اور اہم واقعات کے ہونگے۔

دین اسلام میں شوریٰ کے ذریعے معاملات طے کرنے کے مواقع

جب کسی واقع یا معاملہ کے جواز یا عدم جواز پر قرآن وسنت یعنی شریعت اسلامی کے معتبر دلائل میں سے کوئی دلیل موجود ہو، تو اس امر میں نہ صرف مجلس شوریٰ بلکہ پوری امت کو کسی تبدیلی، ترمیم اور کمی بیشی کا کوئی اختیار نہیں ہے، اس حیثیت سے اسلامی نظام ایک ایسی عظیم ہستی کی آمریت ہے، جو متکبر ہے، کبر و برتری کے اس مقام پر فائز ہے، جہاں وہ اپنی حکمرانی میں کسی کو شرکت اور دخل دینے کی اجازت نہیں دیتا۔ چونکہ یہ عظیم ذات اس علو اور کبریائی کے ساتھ ساتھ ماضی، حال اور مستقبل کے معدومات اور موجودات کے ذرے ذرے پر علیم اور خبیر ہے اور انسان پر شفیق اور رحیم ہے اس لئے ظلوم وجهول انسان کی

رائے عقل، سوچ اور جمہوری و عوامی فیصلے اس کے آمرانہ فیصلوں کے سامنے سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ البتہ جن امور کے متعلق واضح شرعی دلائل صراحت کے ساتھ موجود نہ ہوں اور ان کے نتائج اور افادیت یا مضرت ذو جہتین ہوں تو خواہ وہ امور دین و مذہب کے متعلق ہوں یا دنیا اور انتظام حیات کے بارے میں ہوں، ان مسائل کے متعلق دین اسلام کا حکم ہے کہ مشورہ سے فیصلے کیا کرو۔

مشورہ کی غرض و غایت

کسی معاملے میں مشورہ کرنے کے مقاصد دو ہی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس معاملے کے دینی، مذہبی اور دنیاوی، انتظامی جملہ پہلو سامنے آجائیں اور ان کے بارے میں ممکنہ دلائل پیش کئے جا سکیں، پھر ان پہلوؤں میں سے وہ راستہ اختیار کیا جائے جو مفید تر اور تقاضائے حال کے مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ، مصالح پر مبنی اقرب الی الحق اور قرآن و سنت کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتا ہو۔

دوسرا یہ کہ اراکین شوریٰ کو اعتماد میں لیا جائے۔ تاکہ امت اجتماعی امور میں تشتت و انتشار سے محفوظ رہے۔

مشورہ کا طریقہ

ہر ایک معاملے میں دو پہلو اہم ہوتے ہیں، ایک دنیاوی پہلو جس کی متعدد انواع ہو سکتی ہیں، یعنی دنیاوی امور میں یہ معاملہ کس شعبے سے متعلق ہے، مثلاً صحت و بیماری سے متعلق ہے یا سائنسی و ٹیکنالوجی سے وابستہ ہے، اقتصادیات کا معاملہ ہے یا فوجی و عسکری معاملہ ہے، غرض جس شعبے سے متعلق ہو اس معاملہ میں اس شعبے کے ماہر اراکین شوریٰ کی رائے کو قابل اعتناء سمجھنا چاہیے۔

دوسرا پہلو دین اور مذہب کا ہے، چونکہ دین اسلام صرف مسجد کے احاطہ اور چند مخصوص عبادات تک محدود نہیں ہے، بلکہ زندگی کے جملہ شعبوں میں خواہ وہ اقتصادیات کا شعبہ ہو یا تنازعات کا، یا سیاسیات اور حکمرانی کا معاملہ ہو۔ اسلام ان کے متعلق اصولی ہدایات اور احکامات جاری کرتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ مجلس شوریٰ کے ماہرین جس شعبے کے متعلق کوئی فیصلہ اور قانون سازی کر رہے ہوں اس میں دین اسلام اور شریعت اسلامی کے ماہر اراکین شوریٰ کی رائے کو ترجیح دی جائے، تاکہ دین اسلام اور شریعت کے خلاف قوانین بنانے کا سدباب ہو سکے۔

دین اسلام میں مجلس شوریٰ کے فیصلوں کا طریقہ

دین جمہوریت میں مجلس شوریٰ (اسمبلی) کے اراکین کی اکثریت جس بات کے حق میں رائے دے وہی حق بات سمجھی جاتی ہے اور وہی قانون ہوتا ہے، خواہ وہ نری حماقت اور کھلی بے دینی اور بے حیائی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر دین اسلام میں فیصلے دلیل کی قوت اور صحت کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں، اور دلیل کی قوت اور صحت کے لئے معیار قرآن و سنت سے اسلامی اصول و قواعد کے مطابق استنباط اور استخراج ہے، جس کو فقہ اسلامی میں اجتہاد کہا جاتا ہے اس اجتہاد کے نتیجہ میں جو فیصلہ اقرب الی الحق ہو گا وہی معتبر ہو گا خواہ اس کے حق میں رائے دینے والے بہت اقلیت میں ہوں اور مخالفت کرنے والے بھاری اکثریت میں ہوں۔

البتہ اگر قوت دلیل میں دونوں جانب یکسانیت ہو تو اکثریت کے فیصلے کو ترجیح دی جائے گی۔ واضح رہے کہ یہاں اسلامی احکامات کے لئے قوت دلیل اور صحت دلیل کے متعلق ہر رکن شوریٰ کو رائے دینے کا حق نہ ہو گا، اور نہ ہر رکن کی رائے کا اعتبار ہو گا بلکہ تعلیمات اسلامی قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے مستند ماہرین کی رائے کا اعتبار ہو گا۔

ایک اہم انتباہ

جس آخری شق کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اگر دو مختلف رائے (استنباط اور اجتہاد کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے دلائل قوت اور صحت کے لحاظ سے) مساوی ہوں تو اس صورت میں اکثریت کی رائے کو ترجیح دی جائے گی۔

اس سے یار لوگوں نے یہ نعرہ باطل بلند کر دیا، کہ دین اسلام عین دین جمہوریت ہے اس لئے کہ دین اسلام میں فیصلے اراکین شوریٰ کی اکثریتی رائے کے مطابق طے کئے جاتے ہیں اور دین جمہوریت میں بھی فیصلے اکثریت کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں۔

عقل انگشت بدندان کہ اینچہ بو البوسیت

حالانکہ دین اسلام اور قرآن و سنت کا عظیم ذخیرہ احکام، صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ایسے اٹل اور ابدی اوامر و نواہی پر مبنی ہے، جس میں کسی قسم کی تغیر و تبدیلی، کمی و بیشی کی اجازت حضور ﷺ جیسی عقلِ کل اور افضل ترین ذات کو بھی ذاتی حیثیت سے نہیں ہے۔ "پس بدیگران چہ ماند" اس لحاظ سے اکثریت پرستوں کو چاہئے تھا کہ وہ دین اسلام کو اللہ تعالیٰ کی آمریت کا دین کہتے نہ کہ جمہوریت کا۔

دین اسلام میں آخری فیصلہ امیر مجلس کو کرنا ہوتا ہے

مجلس شوریٰ میں جب ان امور اور فیصلوں کے بارے میں بحث ہو، جن میں دین اسلام نے ماہرین کو اجتہاد و قوت دلائل کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی اجازت دی ہے، اور شوریٰ کی بحث اور تحقیق کے نتیجے میں اراکین کی طرف سے متضاد اور مختلف آراء اور دلائل سامنے آجائیں تو سربراہ حکومت (وزیر اعظم) یا سربراہ مملکت (صدر) کو کسی ایک رائے پر فیصلہ (رائے دینے والوں کے سروں کی گنتی کی اساس اکثریت پر) نہیں دینا چاہئے، بلکہ رائے

دینے والوں کی قوت دلیل اور صحت دلیل کی بنیاد پر دینا چاہیے۔

اور اگر مجلس شوریٰ کے ایک اجلاس میں سربراہ کے سامنے زیر بحث مسئلے کے مفید تر اور حق بجانب پہلو کی پوری اطمینان بخش صورت سامنے نہ آئے، تو اس پر مجلس شوریٰ دوبارہ اور سہ بارہ بحث کرے گی، نیز شوریٰ سے باہر متعلقہ مسئلے کے ماہرین کی رائے لیکر مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔ تاوقتیکہ مسئلہ واضح نہ ہو جائے فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔

خیر القرون کے زمانہ میں شوریٰ کے چند مثالی فیصلے

مشورہ کے متعلق مذکورہ چند اصولی باتوں کے ثبوت کے لئے حضور ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانے کی چند "مجالس شوریٰ" اور ان کے "فیصلوں" کے چند نمونے پیش خدمت ہیں۔

شوریٰ برائے اذان

بخاری و مسلم وغیرہ کتب احادیث میں (باب الاذان) کے عنوان کے تحت بروایت ابن عمرؓ ذکر ہے۔

کہ "جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو نماز باجماعت ادا کرنے کے لئے وقت کا اندازہ لگایا کرتے اور وقت متعین کر لیتے تھے، مگر ان کا کوئی منادی (مؤذن) نہ تھا پس ایک دن اس مسئلہ پر مشورہ ہوا بعض نے کہا نصاریٰ کی طرح ناقوس بجایا کرو بعض نے مشورہ دیا کہ یہود کی طرح قرن (بگل) بجایا کرو حضرت عمرؓ نے کہا کیوں نہ کوئی آدمی مقرر کیا جائے جو نماز کے لئے بلایا کرے پس حضور ﷺ نے بلال سے فرمایا، بلال! کھڑے ہو جاؤ اور نماز کی منادی کر دو۔

بعض دوسری کتب احادیث مثلاً ابوداؤد، ترمذی، دارمی اور دار قطنی کی روایت سے

معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلی مجلس شوریٰ میں اذان کی صحیح شکل اور کلمات متعین نہیں ہوئے تھے صرف (الصلوٰۃ جامعۃ) یا "حی علی الصلوٰۃ" جیسے الفاظ کہے جاتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن زیدؓ کا خواب

آپ کہتے ہیں کہ میں نے رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک شخص "ناقوس" بیچ رہا ہے میں نے اس سے ناقوس لینے کی درخواست کی تو وہ کہنے لگا اس کا کیا کرو گے؟ میں نے بتایا "اس سے لوگوں کو نماز کے لئے بلائیں گے" اس نے کہا کیوں نہ میں تجھے اس سے بہتر چیز بتلا دوں؟ میں نے کہا بتلا دو تو اس نے اذان اور اقامت کے جملہ کلمات ابتداء سے آخیر تک مجھے بتا دیئے۔ صبح ہوئی تو میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں اپنا خواب بیان کیا آپ ﷺ نے فرمایا یہ حق خواب ہے، تم بلال کے ساتھ کھڑے ہو کر اسے یہ کلمات بتلاؤ اور وہ اذان دیں کیونکہ وہ تجھ سے زیادہ بلند آواز کا مالک ہے۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔

"اتنے میں حضرت عمرؓ جلدی میں چادر گھسیٹتے ہوئے آپہنچے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں نے خواب میں بعینہٖ یہی کچھ دیکھا ہے، یہ سن کر حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا"۔

اس مشاورت سے حسب ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ حضور ﷺ نے خالص دینی امر میں صحابہؓ سے مشورہ کیا جب کہ بذریعہ وحی کوئی واضح دلیل موجود نہ تھی۔

۲۔ جب حضور ﷺ کو مختلف مشوروں میں سے کوئی مشورہ از روئے دلیل اقرب الی الحق معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے اسی پر فیصلہ صادر فرما دیا قطع نظر اس کے کہ یہ رائے دینے والے اکثریت میں تھے یا اقلیت میں۔ یہاں کوئی یہ نہ سمجھے کہ حضور ﷺ نے عبداللہ بن زیدؓ کے خواب کو جو "حق خواب" قرار دیا یہ وحی کی اساس پر دیا ہوگا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو

عمر فاروقؓ کے خواب بتانے پر اللہ کا شکر کیوں ادا فرماتے۔

خلیفہ اول ابو بکر صدیقؓ کی اولین دو مجالس شوریٰ

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب حضور ﷺ وصال فرما گئے تو نفاق پھیل گیا، عرب قبائل مرتد ہونے لگے، کچھ قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔

ادھر لشکر اسامہؓ کی روانگی کا مسئلہ بھی سامنے تھا جس کو خود حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں ترتیب دیا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر حضرت ابو بکرؓ نے پہلے جیش اسامہ کی روانگی کے متعلق مشورہ کیا، ان نازک ترین حالات کے پیش نظر شوریٰ نے لشکر کی فوری روانگی کے خلاف رائے دی۔ لیکن خلیفۂ اوّل نے اپنا دوٹوک فیصلہ جن الفاظ میں سنایا اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں ابو بکرؓ کی جان ہے، اگر مجھے یہ یقین ہو کہ (لشکر کی روانگی کے بعد) درندے آکر مجھے اٹھا لے جائیں گے، تو بھی میں اسامہ کا لشکر ضرور بھیجوں گا جیسا کہ حضور ﷺ نے حکم دیا تھا، اور اگر ان آبادیوں میں میرے سوا کوئی شخص بھی باقی نہ رہے تو بھی میں یہ لشکر ضرور روانہ کروں گا"۔

چنانچہ لشکر بھیجا گیا جو چالیس دن کے بعد ظفریاب ہو کر واپس آ گیا۔

فائدہ: واضح رہے کہ حضرت اسامہؓ کے لشکر کو بھیجنے کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ آیا لشکر بھیجا جائے یا اس حکم کو سرے سے منسوخ کیا جائے، اس پہلو میں اہل شوریٰ سب متفق تھے کہ لشکر بھیجنے کا پروگرام ہر گز منسوخ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس پروگرام کے حق میں شرعی دلیل یہ تھی کہ حضور ﷺ نے خود یہ پروگرام مرتب فرمایا تھا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ آیا لشکر کا بھیجنا حالات کی نزاکت کے پیش نظر مزید ملتوی کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ حضور ﷺ کی وفات کے حادثہ کے پیش نظر پہلے ہی ملتوی ہو چکا تھا۔

مشورہ دینے والوں نے اس پہلو پر نظر رکھتے ہوئے فوج بھیجنے کو ملتوی کرنا چاہا اس لئے کہ منافقین کی جانب سے برملا بغاوت کا اظہار ہو چکا تھا، جس کے نتیجہ میں بیرونی خطرات اور حملوں کا قوی امکان تھا اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ فوج بھیجنے کے نتیجے میں مرکز عسکری لحاظ سے کمزور ہو کر رہ جائے۔

مگر خلیفہ کی نگاہ میں اس خطرے کا مداوا فوج بھیجنے میں تھا، کہ عین ایسے موقعہ پر بیرونی طاقت بلکہ اس وقت کی سپر پاور کے مقابلے کے لئے جب مرکز اسلامی (مدینہ منورہ) سے فوج روانہ کی جائے گی تو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے ذہن میں یہ بات یقیناً بیٹھ جائے گی کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد بھی اسلامی عسکری قوت اور مسلمانوں کے عزم واستقلال میں بال برابر فرق نہیں آیا ہے۔

اگر حضور ﷺ کا بنایا ہوا یہ پروگرام ملتوی کیا گیا تو دشمنان اسلام یہی تصور کریں گے، کہ نئی حکومت نے پرانی پالیسی تبدیل کر دی ہے، اور یہی سب سے بڑی شکست ہوگی۔ چونکہ خلیفۂ اوّل کا یہ استدلال اس دلیل کے مقابلے میں زیادہ قوی اور حق بجانب تھا جو دلیل اہل شوریٰ نے لشکر کشی کے التواء کے حق میں پیش کی تھی۔ اس لئے خلیفۂ اوّل نے قوت دلیل کی اساس پر شوریٰ کی اکثریت کا فیصلہ رد کر دیا۔

دوسری مشاورت

دوسرا اہم مسئلہ جو کہ خلیفہ کے ابتدائی دور خلافت میں پیش آیا وہ بعض قبائل کا زکوٰۃ دینے سے انکار کا مسئلہ تھا۔ منکرین میں سے بعض نے تو آیت قرآنی کی غلط تاویل کی آڑ لی اور کہا کہ ہم زکوٰۃ دینے سے انکاری نہیں ہیں، مگر ایسے شخص کو دیں گے جس کی دعاؤں سے ہمیں دلی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہو۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے البدایہ والنہایہ عنوان خلافت ابو بکرؓ)

اس مسئلہ کے حل کے لئے مجلس شوریٰ طلب کی گئی، اور خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکرؓ

نے مجلس شوریٰ کو پیش آمدہ حالات سے آگاہ کرنے کے لئے جو نقشہ کھینچا وہ یوں تھا۔

”آپ کو معلوم ہے کہ عربوں نے زکوۃ ادا کرنی چھوڑ دی ہے، اور دین سے مرتد ہو گئے ہیں، اور عجم نے تمہارے لئے نہاوند تیار کر رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمان جس شخص کی وجہ سے ہمیشہ فتح یاب ہوتے تھے وہ تو گذر چکا۔ اب موقع ہے کہ مسلمانوں کو مٹا دیا جائے۔ آپ مجھے مشورہ دیں کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہئے کیونکہ میں بھی تمہی میں سے ایک شخص ہوں اور مجھ پر تمہاری نسبت اس مصیبت کا بوجھ زیادہ ہے“۔

اس تقریر سے مجمع پر سکتہ طاری ہو گیا، پھر طویل خاموشی کو توڑتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

”اے خلیفہ رسول ﷺ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ اس وقت عربوں کے نماز ادا کرنے ہی کو غنیمت سمجھیں اور زکوۃ کے انکار پر مواخذہ نہ کریں یہ لوگ ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوئے ہیں، آہستہ آہستہ یہ تمام اسلامی فرائض و احکام کو تسلیم کر کے سچے مسلمان بن جائیں گے، جب اللہ تعالیٰ اسلام کو قوت دیدے گا تو ہم ان کے مقابلہ پر قادر ہو جائیں گے باقی اس وقت تو مہاجرین و انصار میں تمام عرب و عجم کے مقابلہ کی سکت نہیں“۔

حضرت عمرؓ کی رائے سننے کے بعد حضرت ابو بکرؓ حضرت عثمانؓ کی طرف متوجہ ہوئے انہوں نے بھی حرف بحرف حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی، پھر حضرت علیؓ نے بھی حضرت عمرؓ کی تائید کی ان کے بعد تمام انصار و مہاجرین بھی اسی رائے کی تائید میں یک زبان ہو گئے۔

یہ سن کر حضرت ابو بکرؓ منبر پر چڑھے اور فرمایا! ترجمہ۔

”خدا کی قسم! میں برابر امر الٰہی پر قائم رہوں گا اور خدا کی راہ میں جہاد کرتا

رہوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرمادے اور ہم میں سے جو قتل ہو وہ شہید ہو کر جنت میں جائے، اور جو زندہ رہے وہ خدا کی زمین میں اس کا خلیفہ اور اس کے بندوں کا وارث ہو کر رہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا"۔ "اللہ نے نیک عمل کرنے والے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا" خدا کی قسم! اگر یہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ کو زکوۃ دیتے تھے اس میں سے اگر ایک رسی بھی روکیں گے تو میں ان سے برابر جہاد کرتا رہوں گا یہاں تک کہ میری روح خدا تعالیٰ سے جا ملے خواہ ان لوگوں کی مدد کے لئے تمام درخت، پتھر اور جن وانس میرے مقابلہ کے لئے جمع ہو جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوۃ میں کوئی فرق نہیں فرمایا ہے بلکہ دونوں کو ایک ہی سلسلہ میں ذکر کیا ہے"۔

ابو بکرؓ کی تقریر ختم ہوتے ہی حضرت عمرؓ اللہ اکبر پکار اٹھے اور فرمایا "جس کام کے لئے اللہ تعالیٰ نے ابو بکرؓ کا سینہ کھول دیا میرا بھی اس پر شرح صدر ہو گیا"۔

ایک روایت میں یہاں تک الفاظ آئے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے تقریر کے دوران حضرت عمرؓ سے کہا "تمہیں کیا ہو گیا تم تو کفر کی حالت میں بہت جری اور دلیر تھے، اب اسلام میں آکر کمزوری دکھاتے ہو"۔ (کنز العمال جلد ۳، صفحہ ۱۴۲، بحوالہ خلافت و جمہوریت صفحہ ۱۴۰، علامہ عبدالرحمان کیلانی)

اسی واقعہ کو امام بخاریؒ نے اختصار کے ساتھ یوں نقل فرمایا ہے۔

ان ابوهريرة قال: لما توفى النبى ﷺ واستخلف ابوبكر و كفر من كفر من العرب قال عمر: يا ابوبكر! كيف تقاتل الناس وقد قال رسول الله ﷺ "امرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله فمن قال لا اله الا الله عصم منى

ما له ونفسه الا بحقه وحسابه على الله".

قال ابوبکر! والله لا قاتلن من فرق بين الصلوٰة والزکوٰة فان الزکوٰة حق المال والله لو منعونی عنا قا کانوا يودونها الى رسول الله ﷺ لا قاتلهم على منعها".

قال عمر! "فو الله ما هو الا ان رايت ان قد شرح الله صدر ابوبکر للقتال فعرفت انه الحق". (بخاری شریف کتاب استتابة المرتدين)

"حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا: جب حضور ﷺ کا انتقال ہو گیا اور حضرت ابو بکرؓ خلیفہ بن گئے اور عرب کے کچھ لوگ کافر ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا: آپ ان لوگوں سے کیسے لڑیں گے جب کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا۔ "مجھے لوگوں سے اس وقت تک لڑنے کا حکم ہے جب تک وہ لا الہ الا اللہ نہ کہیں پھر جس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا اس نے اپنا مال اور اپنی جان مجھ سے بچا لئے الا یہ کہ اسے اپنے کئے کا بدلہ ملے اور جو اس کے پوشیدہ امور ہیں ان کا حساب اللہ پر ہے"۔

حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "خدا کی قسم! میں اس شخص سے ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا، اس لئے کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے (جیسے نماز بدن کا حق ہے) خدا کی قسم! اگر یہ لوگ مجھے ایک بکری کا بچہ بھی نہ دیں گے جو حضور ﷺ کو دیا کرتے تھے تو میں اس کی عدم ادائیگی پر بھی ان سے ضرور لڑوں گا"۔

حضرت عمرؓ نے کہا: خدا کی قسم! اس کے بعد میں سمجھ گیا کہ ابو بکرؓ کے دل میں جو لڑائی کا ارادہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈالا ہے اور میں نے (ابو بکرؓ کی دلیل کے بعد) جان لیا کہ حضرت ابو بکرؓ کی رائے حق ہے"۔

قصہ مختصر :

زکوٰۃ نہ دینے والوں کے خلاف جہاد شروع ہوا اور آخر کار وہ مغلوب ہو کر اسلام کے جملہ احکامات تسلیم کر کے راہ راست پر آگئے اور حضور ﷺ کی زندگی میں جو اسلامی احکام نافذ تھے وہ سب جوں کے توں بحال ہو گئے۔

فائدہ : اس اہم ترین مجلس شوریٰ میں قطعی اکثریت تو حضرت عمرؓ کے ساتھ تھی مگر قوت دلیل اور صحت دلیل حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ تھی اور اسی پر امیر مجلس (ایوان کے لیڈر) نے فیصلہ صادر کر دیا۔

مسئلہ طاعون اور خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں، کہ "حضرت عمرؓ شام کی طرف نکلے اور جب مقام سرغ پر پہنچے تو اسلامی حکام، فوجی سردار اور عبیدہؓ بن جراح (جو اس وقت شام کے گورنر تھے) یہاں آکر ملے اور خبر دی کہ آج کل شام میں وبا (طاعون) پھیلی ہوئی ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں، مجھے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "مہاجرین اوّلین کو بلاؤ" میں نے انہیں بلایا اور شام میں وبا پھیلنے کی اطلاع دی اور اس کے متعلق ان سے مشورہ طلب کیا ان کا آپس میں اختلاف ہوا، بعض آگے جانے کے حق میں تھے، ان کی دلیل یہ تھی کہ ظاہری اسباب کے خلاف تقدیر پر توکل کیا جائے اور بعض نہ جانے کے حق میں تھے، ان کی دلیل ظاہری اسباب اور تدبیر کو اختیار کرنے کی تھی۔

حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ اب تم میرے پاس سے چلے جاؤ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ پھر مجھ سے فرمایا کہ "اب انصار کو بلا لاؤ" میں ان کو بلا لایا۔ پھر ان سے مشورہ طلب کیا گیا انہوں نے بھی مہاجرین کی طرح مختلف مشورے دیئے۔ آپؓ نے ان سے بھی یہی کہا کہ "اب چلے جاؤ"۔

پھر حضرت عمرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ "اب قریشِ مہاجرین کے بزرگوں کو جمع کرو جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے ہجرت کی تھی" میں ان کو بلا لایا ان میں سے دو آدمیوں نے بھی اختلاف نہ کیا اور کہنے لگے: ہم یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ "آپ لوگوں کو اس وبا میں نہ جھونکیں" پھر حضرت عمرؓ نے اعلان کر دیا کہ "میں علی الصبح واپس مدینہ چلا جاؤں گا اور لوگ بھی واپس لوٹ جائیں گے"۔

یہ اعلان سن کر ابو عبیدہؓ بن الجراح حضرت عمرؓ سے کہنے لگے: "کیا آپ تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہیں"۔

حضرت عمرؓ کہنے لگے "کاش یہ بات ابو عبیدہؓ کے سوا کوئی اور کہتا" (کیونکہ حضرت عمرؓ ان کے خلاف بات کرنا پسند نہ کرتے تھے) عمرؓ نے کہا "ہاں! ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں (پھر فرمایا) بھلا دیکھو تو! اگر آپ اپنے اونٹ کسی وادی میں چرانے کیلئے لے جائیں، جس کی ایک جانب خراب اور قحط زدہ ہو اور دوسری جانب سبزہ زار ہو تو کیا یہ صحیح نہیں کہ آپ اپنے اونٹوں کو خراب حصہ میں چرائیں، تو وہ بھی اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوگا اور اگر سبزہ زار میں چرائیں گے تو وہ بھی اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوگا؟

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اتنے میں عبدالرحمانؓ بن عوف آگئے جو اپنے کسی کام کی وجہ سے غیر حاضر تھے کہنے لگے "مجھے اس کا شرعی حکم معلوم ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے" کہ "جب سنو کہ کسی شہر میں طاعون ہے تو وہاں مت جاؤ اور اگر ایسی جگہ طاعون پھیل جائے جہاں تم پہلے سے موجود ہو تو وہاں سے مت بھاگو" حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اللہ کا شکر ادا کیا اور واپس لوٹے۔ (مسلم شریف، کتاب السلام باب الطاعون)

فائدے:

۱۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک مسئلے کے بارے میں مختلف اہل الرائے کی

الگ الگ مجالس شوریٰ بلائی جا سکتی ہے۔

۲۔ فیصلہ امیر مجلس (سربراہ شوریٰ) کو قوت دلیل اور صحت دلیل کی بنیاد پر کرنا ہوگا نہ کہ سروں کو گن کر کثرت کی بنیاد پر۔

۳۔ دلیل کی صحت اور قوت کے لئے امیر صرف اپنی سوچ کو معیار قرار نہ دے۔ بلکہ اہل رائے کے دلائل کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے۔ عمر فاروقؓ نے مختلف مجالس شوریٰ کی رائے سن کر فیصلہ کیا تھا۔

۴۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ حضرت عمرؓ نے تیسری مجلس والوں میں اتفاق پا کر اکثریت کی اساس پر فیصلہ کیا اگر ایسا ہوتا تو پھر پہلی دو مجالس شوریٰ کی آراء ضرور گنی جاتیں جب کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ اصل سوال یہ تھا کہ واپس ہونا تقدیر سے فرار ہے یا نہیں؟ عمرؓ کی رائے تھی کہ واپس ہو جانے میں تقدیر کے خلاف کوئی بات نہیں ہے اور اسی لئے عبیدہؓ بن الجراح کے سامنے اونٹ چرانے کی مثال بیان کر کے انہیں بات سمجھا دی۔

عراق کی مفتوحہ زمینوں کے متعلق حضرت عمرؓ کی مجلس مشاورت

(چونکہ یہ مسئلہ مالیات سے تعلق رکھتا ہے لہذا درج ذیل اقتباسات امام ابو یوسفؒ کی "کتاب الخراج" کے متعلقہ عنوانوں میں درج شدہ احادیث اور روایات سے ماخوذ ہیں۔)

جب عراق اور شام کو مسلمانوں نے فتح کر لیا اور ان پر قبضہ کر لیا تو فوجی جرنیلوں نے اصرار کیا۔

۱۔ کہ مفتوحہ زمینیں فوجیوں کو بطور غنیمت جاگیر دی جائیں اور باشندوں کو ان کی غلامی میں دیا جائے۔

حضرت عمرؓ نے عراق کی فتح کے بعد حضرت سعدؓ بن وقاص کو وہاں کی مردم شماری

کے لئے بھیجا، کل باشندوں اور اہل فوج کی تعداد کا موازنہ کیا گیا تو ایک ایک فوجی کے حصے میں تین تین آدمی آتے تھے۔

۲۔ اس وقت حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ زمین باشندوں کے قبضے میں ہی رہنے دی جائے۔ اکابر صحابہؓ میں سے حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف اہل فوج کے ہم خیال تھے، اور اموال غنیمت کے علاوہ زمینوں اور قیدیوں کو بھی فوج میں تقسیم کرنے پر مصر تھے۔

۳۔ اور حضرت بلالؓ تو اس بارے میں اتنا کچھ کہہ چکے تھے کہ حضرت عمرؓ نے دق ہو کر فرمایا۔

"اللھم اکفنی بلالا"

"اے خدا مجھ کو بلال سے نجات دے"۔

حضرت عمرؓ کا موقف یہ تھا کہ:

۱۔ اگر یہ مفتوحہ علاقے شخصی ملکیتوں میں دے دیے جائیں تو آئندہ دفاع اور مملکت کا نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے عظیم تر اخراجات کس مد سے پورے کئے جائیں گے؟

۲۔ آئندہ آنے والے مسلمانوں کی ضروریات کن پر ڈالی جائیں گی۔

۳۔ ان زمینوں کی تقسیم کے نتیجہ میں فوج کے اندر جاگیرداری، آرام پرستی کا رجحان پڑ جائے گا۔ جہاد اور جفاکشی کی طبعی ساخت میں فتور آجائے گا اس لئے وہ چاہتے تھے کہ زمینوں اور قیدیوں کے سوا تمام اموال مجاہدین میں تقسیم کر دینے چاہئیں۔ البتہ زمینیں بیت المال کی ملکیت قرار دے کر ان کافروں کو دی جائیں اور ان پر مقررہ حساب سے لگان (خراج) لگا دیا جائے۔ عمر فاروقؓ کے پیش نظر یہ امر تھا، کہ بظاہر آئندہ اتنی زرخیز اور زیادہ زمینوں کا مسلمانوں کے ہاتھ لگنا غیر متوقع تھا۔

حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کی دلیل یہ تھی کہ جن کی تلواروں نے ملک کو فتح کیا ہے وہی ان زمینوں کے حقدار ہیں۔ آئندہ نسلوں کو کیونکر مفت میں ان زمینوں میں سے

حصہ دیا جائے؟ لیکن عمر فاروقؓ کی نگاہ مستقبل پر تھی۔ آپ کو اپنی رائے کی اصابت پر یقین تھا مگر آپ کو اپنی رائے کی تائید میں تاہنوز کوئی دلیل ہاتھ نہیں آئی تھی۔ البتہ مستقبل کی فکر چھوڑ کر حال کو دیکھتے ہوئے عمرؓ بھی مجاہدین کی بات کو درست تسلیم کرتے تھے۔ جیسے بخاری شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

قال عمرؓ: لو لا آخر المسلمین ما افتتحت قریۃ الا قسمتھا بین اھلھا کما قسم النبی ﷺ خیبر۔ (بخاری کتاب الجھاد والسیر باب الغنیمۃ لمن شھد الوقعۃ)

"عمرؓ نے کہا: اگر مجھے پچھلے مسلمانوں کا خیال نہ ہوتا تو میں جو بستی فتح کرتا اسے فتح کرنے والوں میں تقسیم کر دیتا جیسے کہ آنحضرت ﷺ نے خیبر کو تقسیم فرمادیا تھا"۔

چونکہ دونوں طرف دلائل موجود تھے لہٰذا حضرت عمرؓ نے فیصلہ کے لئے مجلس مشاورت طلب کی یہ مجلس دس ہزار افراد پر مشتمل تھی، پانچ ہزار افراد قدماء، مہاجرین میں سے اور پانچ ہزار انصار (قبیلہ اوس و خزرج) میں سے تھے۔

حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا۔ تاہم کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور کئی دن تک یہ بحث چلتی رہی۔

ایک دن حضرت عمرؓ کو اچانک ایک آیت قرآنی یاد آئی جو اس مسئلہ کے حل کے لئے فیصلہ کن تھی قرآن کریم کی متعلقہ آیات کا مضمون طویل ہے البتہ مفتوحہ زمینوں کے مستحقین کے بارے میں ابتدائی آیات درج ذیل ہیں:

۱۔ ما افآء اللہ علی رسولہ من اھل القری فللہ وللرسول۔ الآیہ

۲۔ للفقرآء المھاجرین۔ الآیہ

۳۔ والذین تبوء الدار۔ الآیہ

۴۔ والذین جآء و امن بعدھم۔ الآیہ

(پارہ ۲۸، سورہ حشر، آیات: ۷ تا ۱۰)

۱۔ جو مال اللہ نے اپنے پیغمبر کو دیہات والوں سے دلوایا وہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے۔

۲۔ اور ان مفلس مہاجرین کے لئے (تا آخر آیت)

۳۔ اور انصار کے لئے جنہوں نے پناہ دی (تا آخر)

۴۔ اور ان مسلمانوں کے لئے بھی ہے جو ان کے پیچھے آئیں گے۔

حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر مال زکوٰۃ و صدقات، غنیمت اور فئ کے متعلق جملہ آیات قرآنی ترتیب وار پڑھیں اور آخر میں سورہ حشر کی آیت "والذین جآء وامن بعدھم" پڑھ کر زوردار تقریر فرمائی اور کہا اسی آخری آیت (والذین جآء وامن بعدھم) نے مسئلہ حل کر دیا ہے۔

عن مالك بن اوس قال قرء عمرؓ ثم قال هذه (الآية الاخيرة) استوعبت المسلمين عامة فلئن عشمت فلياتين الرعی وهو بسرو حمير نصيبه منها لم يعرق فيها جبينه رواه فی شرح السنة. (مشكوة باب الفئی)

"حضرت مالکؓ بن اوس سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے مذکورہ آخری آیت پڑھی پھر فرمایا اس آیت نے تمام مسلمانوں کو حقدار بنا دیا ہے، پس اگر میں زندہ رہا تو مقام بسر و حمیر کے اس چرواہے کو بھی اس میں سے حصہ ملے گا جس کی پیشانی پر پسینہ نہیں آیا یعنی بلا محنت جہاد وہ حق دار ہو گا"۔

حضرت عمرؓ کے اس استدلال کے بعد سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ بلاشبہ آپ کی رائے صحیح ہے۔ اور پھر حضرت عمرؓ نے ایسا ہی کیا۔ اس واقعے سے حسب ذیل باتیں واضح طور پر ثابت ہوتی ہیں۔

۱۔ امیر المسلمین نے محض مجلس شوریٰ کی اکثریت کی رائے کو فیصلہ کرنے کے لئے دلیل اور بنیاد کی حیثیت نہیں دی۔ اور صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کے رویے پر اعتراض یا اس

بات پر اصرار نہیں کیا کہ مال غنیمت کے سلسلے میں شرعی دلیل کی تلاش میں تاخیر اور لیت و لعل کو چھوڑیے۔ اس طرح گویا حاضرین کے پورے مجمع نے یہ گواہی دی کہ نری اکثریت شرعی دلیل نہیں۔

۲۔ امیر محض اپنی ذاتی رائے کے بل بوتے پر مجلس شوریٰ کی رائے کو ویٹو نہیں کر سکتا، اگر ایسا ہوتا تو حضرت عمرؓ ابتدائی مجلس مشاورت میں مجلس شوریٰ کی رائے مسترد کر کے اپنی رائے ان پر ٹھونس دیتے۔

۳۔ امیر کو قوت دلیل اور صحت دلیل پر فیصلہ دینا ہوگا۔ یہاں حضرت عمرؓ کی دلیل کی صحت پر پورے مجمع کی تصدیق اس بات کی واضح دلیل ہے۔

ویسے تو دور نبوی ﷺ اور خلفاء راشدینؓ کی حکومتوں میں مجلس شوریٰ کے متعدد اجلاس اور فیصلے ہوئے ہیں، مثلاً جنگ بدر کے متعلق شوریٰ، جنگ احد، جنگ خندق اور جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں شوریٰ، واقعہ افک کے متعلق شوریٰ، قبیلہ ہوازن کے قیدیوں کے بارے میں، صلح حدیبیہ کے متعلق شوریٰ، مگر میں مذکورہ بالا چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں اس لئے کہ سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔

اسلام میں شوریٰ کے فیصلے کے متعلق اتنی بات قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ:

۱۔ شوریٰ بذات خود دلیل نہیں بلکہ طلب حق کے لئے فکری جدوجہد ہے۔

۲۔ حق واضح ہونے کے بعد اسی پر فیصلہ کیا جائے گا خواہ وہ حق اقلیت کے ساتھ ہو یا اکثریت کے ساتھ۔

۳۔ امیر کسی بھی رائے کو محض ذاتی رائے کی بنیاد پر نہ تو رد کر سکتا ہے اور نہ اس پر فیصلہ کر سکتا ہے۔

۴۔ آخری فیصلہ امیر کرے گا مگر قوت دلیل اور صحت دلیل کی اساس پر۔

۵۔ اسلام میں نری اکثریت کسی فیصلے کے جواز کی دلیل ہرگز نہیں ہے۔

۶۔ اگر دونوں جانب دلائل کی قوت اور وجوہ ترجیح مساوی ہوں تو فرحتِ قلوب کے لئے اکثریت کی رائے پر فیصلہ دینا چاہئے۔ مگر اس لئے نہیں کہ اکثریت ایک مستقل دلیل ہے بلکہ فرحتِ قلوب کی حیثیت سے۔ جیسے کہ بعض مواقع پر قرعہ اندازی کی جاتی ہے۔

۷۔ بعض اوقات مجلس شوریٰ اسلئے طلب کی جاتی ہے، کہ سب کا اعتماد حاصل کیا جاسکے جیسے جنگ بدر کے متعلق حضور ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ انصار کو اعتماد میں لینے کے لئے ان کی رائے طلب کی تھی۔

۸۔ مشورہ اہل رائے اور اہم افراد سے لیا جاتا ہے۔

باب پانزدہم

مسلمانوں کے سربراہ کے منصبی فرائض

جیسا کہ گذشتہ ذکر شدہ مباحث میں یہ بات ٹھوس دلائل کی بنیاد پر ثابت ہو چکی ہے، کہ اسلام میں سربراہی اور اقتدار نہ تو حقوق کے زمرے میں آتا ہے اور نہ ذاتی ملکیت، میراث اور خود مختاری کے زمرے میں۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی امانت، رسول ﷺ کی نیابت اور مسلمانوں کی وکالت جیسی عظیم ذمہ داری ہے۔

لہٰذا جس طرح کوئی امین، امانت میں ذاتی اور خود مختارانہ تصرفات نہیں کر سکتا، بلکہ وہ اس محدود اور متعین دائرہ کے اندر تصرفات کا مجاز ہوتا ہے، جس کی اجازت امانت دینے والے نے دی ہوتی ہے۔

بالکل اسی طرح کوئی بھی نائب اور خلیفہ اس دائرہ کار میں بال برابر کمی وبیشی کا مجاز نہیں، جو کہ منوب عنہ (نائب بنانے والے) نے اس کے لئے متعین کر رکھا ہے۔

نیز کوئی بھی وکیل بحیثیت وکیل، موکل (وکیل بنانے والے) کے سپرد کردہ اختیارات سے ذرا بھی تجاوز کرنے کا مجاز نہیں، اور جس نے مذکورہ ذمہ داریوں میں مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر کے آزادانہ روش اپنائی وہ خائن ہے، اور اپنے کیے کی پاداش کا مستحق ہوگا۔ جس پر خدائی اور بین الاقوامی انسانی قوانین متفق ہیں۔

پس از روئے نقل وعقل ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے سربراہ کا فریضہ ہے کہ جو حقوق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے قرآن وسنت کی شکل میں خالق اور مخلوق کے لئے متعین کئے ہیں، وہ حقوق جس طرح خیر القرون کے خلفاء راشدینؓ کے ذمے لازم تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کے آخری زمانے کے سربراہوں پر بھی لازم ہوں گے، اگرچہ تغیر ازمنہ

کے نتیجے میں اعلیٰ واکمل اور ادنیٰ وناقص کے درجات کا فرق کیوں نہ ہو۔

مسلمانوں کے سربراہ (خلیفہ) کے فرائض منصبی کا خلاصہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

خالص اور مکمل نظام اسلام کو عملاً نافذ کرنا :

اس سلسلہ میں فرائض کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے مسلمان اسکالروں کی تالیفات کی طرف رجوع کیا جائے۔

مثلاً "الامامة والسیاسة لابن قتیبة" الطروق الحکمیة واعلام الموقعین لابن قیم" تحریر الاحکام فی تدبیر اهل الاسلام للامام بدر الدین ابن جماعة" "السیاسة الشرعیة لابن تیمیه" الاحکام السلطانیه للامام ابو الحسن ماوردی صفحه ۱۵، ۱۶" "الاحکام السلطانیه لابی یعلی صفحه ۲۷"

مسلمانوں کے سربراہ کے رعیت پر حقوق

علامہ بدر الدین ابن جماعہؒ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے سربراہ (خلیفہ) کے رعیت پر دس قسم کے حقوق ہیں۔

۱۔

۲۔ ہر جائز کام میں اس کی مدد کرنا۔

۳۔ ہر جائز کام میں بہ دل وجان اس کی فرمانبرداری کرنا۔

۴۔ تعمیری تنقید کے طور پر اس کی غلطیوں پر اس کو متنبہ کرنا۔

۵۔ اس کے احترام کی نگہداشت کرنا۔

۶۔ اسے سازشیوں کی سازشوں سے مطلع کرنا۔

۷۔ اسے حکام اور عمال کی کرتوتوں سے آگاہ کرنا۔

۸۔ مملکت کی فلاح و بہبود میں اس کے ہاتھ مضبوط کرنا۔

۹۔ لوگوں کو اس کی مدد، نصرت اور ہمدردی پر راغب کرنا۔

۱۰۔ زبان، مال اور عمل کے ساتھ اس کا دفاع کرنا۔

(تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام)

گویا یہ وہی حقوق ہیں، جس کی طرف (اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم) میں قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔

کسی منصب کے لئے مدت اور معیار کا تقرر

اصولی طور پر یہاں دو باتیں ذہن نشین رہیں۔ (۱) حقوق مشترکہ (۲) اجتماعی ذمہ داریاں، حقوق میں اسلام کی تعلیمات ہر حقدار کو حق دلانے کا سبق دیتی ہیں۔ اگر بیک وقت ایسا ممکن نہ ہو تو باری باری ہر حقدار کے لئے حصول حق کا موقع فراہم کرنا ضروری ہے۔ جس کے لئے اس حق کی مناسبت سے وقت کا تعین گھنٹوں سے لیکر سالوں تک تھوڑا بہت ہو سکتا ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق ؓ نے سفر بیت المقدس میں اپنے غلام اور نوکر کے ساتھ سواری کے حق میں یہی برتاؤ کیا کہ کبھی نوکر سوار ہو جاتا اور کبھی خلیفہ سوار ہو جاتا۔

اور جہاں تک اجتماعی ذمہ داریاں ہیں، اس باب میں اسلام کی نگاہ میں مدت کے تعین کی کوئی اہمیت نہیں، بلکہ اس سلسلے میں اسلام منصب پر فائز شخص کی شرائط اہلیت اور استعداد کارکردگی کو کسوٹی قرار دیتا ہے۔ اگر صدر یا وزیر اعظم کی طرح کا کوئی منصب دار شرائط اہلیت کھو بیٹھتا ہے، تو وہ بہت قلیل مدت کے اندر معزول کیا جا سکتا ہے، اور اگر وہ اسلام کے دیئے ہوئے معیار پر برقرار ہے تو بہت طویل مدت تک وہ اس عہدہ پر بدستور قائم رہ سکتا ہے۔

مثلاً خلفاء راشدینؓ کے دور میں ہر ایک خلیفہ مسلمانوں کی سربراہی کے عہدہ پر تاحیات فائز رہا ہے، اور کسی بھی صحابی سے ثابت نہیں، کہ اس نے مدت کے عدم تعین پر

اعتراض کیا ہو یا مدت کے تقرر کی بات کی ہو اس طرح یہ صحابہ کرامؓ کا اجماعی فیصلہ ہوا کہ تاحیات سربراہ رہنا جائز ہے۔

البتہ اگر سربراہ حکومت امانت میں خیانت کرے اور نیابتی حکمرانی کی جگہ خود مختارانہ، نفس پرستی اور فسق وفجور کی راہ پر چل کر غیر اسلامی حکمرانی کی روش اپنائے تو وہ چند دنوں کے اندر اندر معزول کئے جانے کا مستحق بن جاتا ہے بشرطیکہ اس کے ہٹانے سے امت میں کشت خون اور مزید فتنہ برپا نہ ہوتا ہو، اور اس کے جانے کے بعد اس سے بدتر انسان اس کی جگہ نہ لے لیتا ہو، اگر ان دو خطرات میں سے کوئی ایک بھی پیش آنے کا غالب گمان ہو تو پھر ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

مشہور حنفی مذہب کے فقیہ اور مفسر علامہ امام جصاصؒ اپنی مشہور کتاب ''احکام القرآن'' میں لکھتے ہیں۔

ومن الناس من يظن ان مذهب ابی حنيفةؒ تجويز امامة الفاسق وخلافته وانه يفرق بينه وبين الحاكم فلا يجيز حكمه وذكر ذالك عن بعض المتكلمين وهو المسمى زرقانی وقد كذب فی ذالك وقال بالباطل وليس هو ايضا ممن تقبل حكايته ولا فرق عند ابی حنيفة بين القاضی وبين الخليفة فی ان شرط كل واحد منهما العدالة وان الفاسق لا يكون خليفة ولا يكون حاكما الخ. (احکام القرآن جلد ۱، صفحہ ۷۰)

''بعض لوگوں کا زعم ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فاسق کی سربراہی اور خلافت جائز ہے اور وہ قاضی اور سربراہ کے حکم میں فرق کرتے ہیں، اور فاسق کی قضاء کو ناجائز قرار دیتے ہیں امام ابو حنیفہؒ کی طرف مذکورہ بات کی نسبت بعض متکلمین کی طرف سے کی جاتی ہے، جس کا نام زرقانی ہے حالانکہ اس نے ابو حنیفہؒ کی جانب نسبت میں جھوٹ اور باطل کا ارتکاب کیا ہے۔ بلکہ اس شخص کی حکایت (نقل مذہب) قابل قبول نہیں ابو حنیفہؒ کے مذہب میں

قاضی اور خلیفہ کے حکم میں کوئی فرق نہیں بلکہ دونوں کے لئے عدالت شرط ہے، اور فاسق نہ تو سربراہ بن سکتا ہے اور نہ قاضی"۔

اس سلسلے میں صریح نصوص وارد ہیں۔ کہ شریعت کے مخالف احکام میں خلیفہ یا سربراہ وغیرہ کی اطاعت نہ کی جائے چونکہ امارت اور اس کی اطاعت تقریباً لازم وملزوم ہیں۔ جب اطاعت نہ رہی تو امارت کہاں رہی۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

لا طاعة للمخلوق فی معصية الخالق.

"خدا کی نافرمانی کرتے ہوئے مخلوق کی اطاعت جائز نہیں"۔

نیز اللہ تعالیٰ کے درج ذیل قول کا بھی یہی مطلب بیان کیا گیا ہے۔

لا ينال عهدی الظالمين. (تفصیل کے لئے "احکام القرآن للجصاص جلد ۱، صفحہ ۶۹ تا ۷۰، دیکھئے)

علامہ ابن الھمامؒ لکھتے ہیں، کہ اگر سربراہ عادل تھا مگر غیر اسلامی احکامات جاری کر کے "فاسق" بنا تو وہ معزولی اور ہٹائے جانے کا مستحق ہو گیا بشرطیکہ اس کے ہٹانے سے فتنہ وفساد برپا نہ ہوتا ہو۔ (المسامرہ صفحہ: ۲۹۱)

علامہ جصاص نے تو یہاں تک لکھا ہے۔

وكان من قوله وجوب الامر بالمعروف والنهی عن المنكر فرض بالقول فان لم يوتمر له فبالسيف علی ما روی عن النبی عليه السلام الی ان قال. فمن كان هذا مذهبه فی الامر بالمعروف والنهی عن المنكر كيف يری امامة الفاسق. الخ. (احکام القرآن جلد ۱، صفحہ ۷۰، ۷۱)

"امام ابو حنیفہؒ اس بات کے قائل ہیں کہ زبان سے بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا فرض ہے، اگر کوئی نہ مانے تو تلوار اٹھائی جائے جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے (آگے لکھتے ہیں) پس جس شخص کا مذہب امر بالمعروف، نہی عن المنکر میں یہ ہو تو وہ کیونکر فاسق کی سربراہی جائز قرار دے سکتا ہے"۔

آج بین الاقوامی طور پر یہ بات مسلم اور مروّج ہے کہ جتنے عہدے اور مناصب ماہرانہ اور پیشہ ورانہ ذمہ داری کی حیثیت کے ہیں، مثلاً فوجی، عدالتی، تعلیمی، ٹیکنالوجی اور انتظامی عہدے۔ سب کے لئے طویل ترین میعاد مقرر کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ساٹھ سال کی عمر تک عہدے دار کو اپنے منصب پر کام کا موقعہ دیا جاتا ہے، جس کے بعد عموماً کارکردگی کی صلاحیت میں فتور آجاتا ہے۔ اور کسی طرف سے یہ آواز نہیں اٹھائی جاتی کہ یہ بے انصافی ہے یا پیچھے آنے والوں کی حق تلفی ہے۔

مگر دین جمہوریت میں سربراہی، وزارت اور ممبرشپ، حقوق کے زمرے میں شمار کی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ اسے حاصل کر لیتے ہیں، باقی ماندہ حضرات اس کے انتظار میں رہتے ہیں۔ کہ دیکھیں ہمیں کب یہ غنیمت ہاتھ لگے گی۔ اس طرح اہل اقتدار اور اہل انتظار کے درمیان کھینچاتانی لگی رہتی ہے، اس حرص وہوس کو کچھ لگام دینے کے لئے ارباب جمہوریت نے چار سالہ یا پانچ سالہ مدت لازم قرار دی ہے، اس مدت میں اہل اقتدار خواہ کتنی بھی بے راہ روی اور خودسری کا مظاہرہ کریں مگر انہیں قبل از وقت ہٹانا جمہوری اصولوں کے منافی سمجھا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اس بحث کی ابتدا میں اشارہ کیا ہے، کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اقتدار کے لئے مدت کی تقرری یا عدم تقرری کا مسئلہ اصل اور مقصود نہیں اگر کسی مدت کے تعین پر امت متفق ہو اور اس میں مسلمانوں اور ملک کا مفاد اور ترقی مضمر ہو تو ایسا کرنے کی گنجائش ہے، مگر ایسا راستہ صرف اس لئے اپنانا کہ اس میں دین جمہوریت کی اطاعت اور پیروی کا فریضہ ادا ہو تعلیمات نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے سراسر منافی اور احساس کمتری کا نتیجہ ہو گا۔ اور

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ

والی بات ہو گی جو کسی مرد مومن کے شایان شان ہرگز نہیں۔

باب شانزدہم

سیاست کی تعریف اور اقسام

آئندہ صفحات میں آنے والی بحث اور تحقیق کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے، کہ سیاست اور سیاسی پارٹیوں کی تعریف اور ان کی اقسام کے متعلق ضروری باتیں ذہن نشین ہو جائیں۔

لفظ سیاست کی لغوی تحقیق :

ساس، یسوس، سیاسۃ۔ ساس فعل ماضی، یسوس، فعل مضارع ہے سیاسۃ مصدر ہے۔ یقال سوس فلان امر القوم ای ملك علیهم. کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو قوم کی سیاست سپرد کی گئی یعنی اسے قوم کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ (المنجد)

السیاسة استصلاح الخلق بارشادهم الی الطریق المنجی فی العاجل والآجل السیاسة المدنیه تدبیر المعاش مع العموم علی سنن العدل والاستقامة. (المنجد صفحہ: ۳۷۳)

"لوگوں کی اصلاح کی خاطر ان کی ایسی راہ کی طرف رہنمائی کرنا جو ان کے لئے دنیا اور آخرت میں باعث نجات ہو۔ سیاست کہلاتا ہے سیاست مدنی کا مطلب ہے، انسان کی معاش اور دیگر جملہ مسائل کا عادلانہ اور مستقیمانہ نظم و نسق کا انتظام"۔

سیاست کا لفظ "اجوف واوی" ہے قال یقول کے وزن پر۔ اس کا مصدر قول کے وزن پر سوس بھی آتا ہے اور اسم فاعل "سائس" (سیاست کرنے والا) آتا ہے۔

تعریف السیاسۃ :

علامہ ابن عابدین شامیؒ رد المختار جلد ۳، صفحہ ۱۶۲ کتاب الحدود مطلب فی الکلام علی السیاسۃ میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔

فالسیاسة استصلاح الخلق بارشادهم الی الطریق المنجی فی الدنیا والآخرة فهی من الانبیاء علی الخاصة والعامة فی ظاهرهم وباطنهم الخ (الی ان قال) قلت وهذا تعریف للسیاسة العامة الصادقة علی جمیع ما شرعه الله تعالیٰ لعباده من الاحکام الشرعیة الخ. (شامی جلد ۳، صفحہ ۱۶۲)

سیاست یہ ہے کہ لوگوں کی اصلاح کی خاطر ایسی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے جو انہیں دنیا اور آخرت کی نجات اور فلاح سے ہمکنار کرے پس انبیاء علیہم السلام کی سیاست خاص وعام کے ظاہر اور باطن پر نافذ ہوتی ہے۔ تا آخر (آگے لکھتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ یہ تعریف اس عام سیاست کی ہے، جو کہ ان جملہ شرعی نظاموں اور احکامات پر صادق آتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے نازل فرمائے ہیں"۔

علامہ ابن خلدون اس کی یوں تعریف فرماتے ہیں:

فالسیاسة والملك هی كفالة للخلق وخلافة الله فی العباد لتنفیذ احكامه فیهم. (مقدمہ ابن خلدون طبع بیروت صفحہ ۱۱۳)

"پس سیاست اور حکومت مخلوق کی کفالت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں پر نیابتاً حکمرانی کرنا ہے تاکہ ان پر احکامات خداوندی نافذ کرے۔

علامہ راغب اصفہانیؒ نے سیاست کی تعریف میں تین اہم امور کو نمایاں کیا ہے۔

۱۔ عمارۃ الارض :

زمین کو آباد کرنا یعنی اسے تخریب اور فساد سے پاک کرنا۔

۲۔ تنفیذ احکام اللہ :

زمین میں بندوں پر احکام خداوندی نافذ کرنا جو کہ درحقیقت زمین کی آبادی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

۳۔ مکارم الشریعۃ :

اخلاق حمیدہ کو اپنانا اور پھیلانا۔

(الذریعہ الی مکارم الشریعہ باب ۸، صفحہ ۱۸ بحوالہ اسلامی سیاست صفحہ ۱۶)

سیاست کی دو اقسام ہیں

اسلامی تعلیمات کی رو سے سیاست کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں، ایک کو رحمانی اور دینی سیاست یا اسلامی سیاست کا نام دیا جاسکتا ہے، اور اس کے لئے جدوجہد کرنے والے اسلام کے پیروکاروں کو "حزب اللہ" (خدائی جماعت) کہا جاسکتا ہے، اس سیاست کے نتیجے میں بننے والی حکومت کو خلافت اللہ (خدا تعالیٰ کی نیابت) کہا جاسکتا ہے۔

اور دوسری قسم کو شیطانی، مادی اور لادینی سیاست کا نام دیا جاسکتا ہے، اور اس کے لیڈروں اور پیروکاروں کے گروہ کو "حزب الشیطان" شیطان کی پارٹی کہا جاسکتا ہے۔

وھی نوعان سیاسة ظالمة فالشریعة تحرمها وسیاسة عادلة تخرج الحق من الظالم وتدفع کثیر من المظالم وتردع اهل الفساد وتوصل الی المقاصد الشرعیة فالشریعة توجب المصیر الیها. الخ (شامی جلد ۳، صفحہ ۱۶۲)

"سیاست کی دو اقسام ہیں سیاست ظالمہ" پس شریعت اسلامی اس کو حرام ٹھہراتی ہے، اور سیاست عادلہ، جو کہ ظالم سے مظلوم کا حق وصول کرتی ہے، ظلم و فساد کی بیخ کنی کر کے شرعی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے، اسلامی شریعت ایسی سیاست کو مسلمانوں پر فرض اور

واجب کرتی ہے"۔

یادر ہے کہ سیاست عادلہ سے مراد وہی سیاست ہے، جس کی تعریف اور وضاحت آپ پچھلے صفحوں میں اسلامی اسکالروں اور فقہاء اسلام کے اقتباسات میں پڑھ چکے ہیں، اس کے برعکس سیاست ظالمہ سے مراد کافرانہ، مشرکانہ اور غیر اسلامی سیاست ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ صاحب البحر لکھتے ہیں:

والسیاسة نوعان عادلة تخرج الحق من الظالم الفاجر فهی من الشریعة علمها من علمها وجهلها من جهلها وقد صنف الناس فی السیاسة الشرعیة کتبا متعددة والنوع الآخر سیاسة ظالمة فالشریعة تحرمها الخ.

(بحر الرائق جلد ۵، باب قطع الطریق، صفحہ ۷۰)

"سیاست کی دو اقسام ہیں ایک عادلہ، جو مظلوم کا حق ظالم و فاجر سے وصول کرتی ہے۔ یہ سیاست شریعت کا حصہ ہے، اس بات کو عالم نے جانا اور جاہل اس سے جاہل رہا اور شرعی سیاست پر لوگوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ جب کہ دوسری قسم سیاست ظالمہ ہے، جس کو شریعت اسلامی حرام قرار دیتی ہے"۔

قاضی القدس شریف علامہ علیؒ الطرابلسی الحنفی لکھتے ہیں۔

والسیاسة نوعان ظالمة فالشریعة تحرمها وسیاسة عادلة تخرج الحق من الظالم وتدفع کثیرا من المظالم وتردع اهل الفساد ویتوصل بها الی المقاصد الشرعیة للعباد فالشریعة یجب المصیر الیها والاعتماد فی اظهار الحق علیها الخ (الی ان قال) لان فی انکار السیاسة الشرعیة ردا للنصوص الشرعیة وتغلیطا للخلفاء الراشدین وطائفة سلکت فی هذا الباب مسلک الافراط فتعدوا حدود الله واخرجوا عن قانون الشرع الی انواع من المظالم والبدع السیاسیة وتوهموا ان السیاسة الشرعیة قاصرة عن سیاسة الحق ومصلحة الامر وهو جهل

وغلط فاحش فقد قال عز من قائل "اليوم اكملت لكم دينكم" فدخل في هذا جميع مصالح العباد الدينية والدنيوية على وجه الكمال وقال عليه السلام تركت فيكم امرين ما ان تمسكتم به لن تضلوا كتاب الله وسنتي.

(معین الاحکام القضاء بالسیاسۃ الشرعیۃ صفحہ ۲۰۷)

"سیاست کی دو اقسام ہیں ایک ظالمانہ جسے شریعت حرام قرار دیتی ہے، اور ایک عادلانہ جو کہ ظالموں سے مظلوموں کے حقوق وصول کرتی ہے، ظلم و فساد کا قلع قمع کرتی ہے جس کے ذریعے مسلمانوں کو شرعی مقاصد کے حصول تک رسائی ہوتی ہے، پس شریعت مسلمانوں پر ایسی سیاست کو اپنانا فرض کرتی ہے، اور اسی سیاست کو دین اسلام کے غلبہ کے لئے قابل اعتماد ٹھہراتی ہے (آگے لکھتے ہیں) اسی شرعی سیاست سے انکار کے نتیجہ میں کئی شرعی نصوص کی تردید اور خلفاء راشدین کے کردار کو غلط کہنا لازم آتا ہے۔ (نعوذ باللہ) بعض لوگ شرعی سیاست کے بارے میں گمراہ ہو چکے ہیں، شرعی حدود سے تجاوز کر گئے ہیں۔ قانون شریعت سے خارج ہو کر سیاسی بدعتوں اور ظلموں میں پھنس گئے ہیں، یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ اسلامی سیاست امت مسلمہ کے حقیقی مفادات کے حصول سے قاصر ہے، حالانکہ ایسا گمان جہالت اور صریح غلطی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا" تو اس میں مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی جملہ مفادات کی تکمیل آگئی نیز حضور ﷺ نے فرمایا کہ "میں نے تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ جب تک تم انہیں پکڑے رہو گے ہرگز بے راہ نہ ہو گے (وہ ہیں) اللہ کی کتاب اور میری سنت"۔

واضح رہے کہ "سیاست" عربی لفظ ہے، جس کا مفہوم آج کل کے مروجہ انگریزی لفظ پولیٹکس (Politics) سے وسیع تر ہے۔ مثلاً اصلاح النفس کو سیاست النفس، اصلاح البیت کو سیاست البیت، چوپایوں کی اصلاح کو سیاست الدواب کہا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر پولیٹکس جو کہ ایک یونانی کلمہ ہے (پولس) سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہیں شہری حکومت۔

عصر حاضر کے مشہور ماہر سیاسیات "بلنچلی" لکھتے ہیں:

"سیاست وہ علم ہے جس کا موضوع سلطنت اور حکومت ہے"۔

ایڈورڈ جیمز لکھتا ہے:

"حکومتی فرائض کا اجراء اور لوگوں کے اجتماعی نظم وضبط کے تحفظ کو سیاست کہا جاتا ہے"۔

گویا کہ مروجہ (Politics) اور عربی کا لفظ "السیاسة المدنی" قریب المعنی ہیں، دونوں کو مترادف اس لئے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ عربی کے لفظ السیاسة میں اصلاح اخلاق اور تہذیب النفس جن کا حقیقی تعلق اخروی زندگی سے ہے، اہم عناصر ہیں جیسا کہ "السیاسة العادلة" کی تعریف میں ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ مگر لفظ (Politics) کا اخلاق سے کوئی سروکار نہیں، اس لئے کہ دین جمہوریت میں اخلاق کی نہ تو کوئی حقیقت ہے اور نہ ہی کوئی معیار، بلکہ اخلاق کی اچھائی اور برائی جواز اور عدم جواز عوام کی خواہشات نفس کا تابع ہے۔ جس کا فار مولا بدلتا رہتا ہے۔

"سیاست اسلامی" سنتِ انبیاء علیہم السلام ہے

اسلامی سیاست اور مروّجہ سیاست میں بُعد اور فرق پر بخاری شریف اور مسلم شریف کی ایک حدیث نص صریح ہے۔

قال ابو حازمؒ قاعدت ابوهريرة رضى الله عنه خمس سنين فسمعته يحدث عن النبى عليه الصلوٰة والسلام قال كانت بنى اسرائيل تسوسهم الانبياء كلما هلك نبى خلفه نبى وانه لانبى بعدى وسيكون خلفاء فيكثرون قالوا فما تامرنا يا رسول الله قال فوا ببيعة الاول فالاول اعطوا حقهم فان الله سائلهم عما استرعاهم. (بخاری کتاب الانبیاء باب ماذکر عن بنی اسرائیل جلد ۲ صفحہ ۴۹۱ و مسلم شریف کتاب الامارہ

باب وجوب الوفاء ببیعۃ الخلیفۃ)

"حضرت ابو حازم اشجعیؒ کہتے ہیں کہ میں پانچ سال تک حضرت ابوہریرہؓ کا ہم مجلس رہا۔ میں نے ان کو حضور ﷺ کی یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا کہ حضور ﷺ نے کہا کہ بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء علیہم السلام کیا کرتے تھے، جب ایک نبی فوت ہو جاتا اس کی جگہ دوسرا نبی آجاتا تھا، اور چونکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اس لئے میرے بعد خلفاء ہوں گے (نیابتی سیاست) اور یہ بہت ہوں گے صحابہؓ نے کہا تو آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں، فرمایا جو اوّل ہوں ان کی بیعت پر قائم رہو اور ان کے حقوق کی پاسداری کرو بے شک اللہ تعالیٰ ان سے ان کی رعیت کے بارے میں بازپرس کرنے والا ہے"۔

ریاست اور حکومت کی اقسام

علامہ ابونصر فارابیؒ سیاست اور ریاست کی تقسیم یوں کرتے ہیں۔

(۱) "الریاسة الفاضلة" "بہترین حکومت" وہ ہے جس میں رعیت کو حقیقی سعادت، نیک بختی اور فلاح سے ہمکنار کیا جائے حقیقی سعادت کی تفصیلات کے لئے یہاں گنجائش نہیں شائقین "حجۃ اللہ البالغہ" کی طرف رجوع کریں۔ البتہ اس کا خلاصہ یہ ہے۔
"ایمان اور اختیار، ارادہ کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنا"۔

(۲) الریاسة الجاهلیة "جاہلی ریاست اور حکومت" یعنی وہ حکومت جو خیالی سعادت اور وہمی نیک بختی و مجازی فلاح کو قبلۂ مقصود بنا لے یعنی محض دنیاوی جاہ و جلال، ترقی و عروج اور راحت و آسائش کو کامیابی سمجھ لے اور سعادت حقیقی کی اہمیت کھو بیٹھے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

"ایمان بالغیب کی جگہ ایمان بالتجربہ والمشاہدہ کے تحت زندگی کے ہر شعبے میں

خواہشات نفس وہوا کی پیروی کرنا"۔

چونکہ ریاست کے اندر روح رواں "سیاست" ہی ہوتی ہے۔ اس لئے ریاست کی مذکورہ تقسیم بعینہٖ "سیاست" کی بھی تقسیم ہے، یعنی "السیاسة الفاضلة" اور "السیاسة الجاھلیة" بہتر سیاست اور جاہلیت کی سیاست۔

چنانچہ فارابیؒ لکھتے ہیں۔

ریاسة تمکن الافعال والسنن والملکات الارادیة التی شانھا ان ینال بھا ما ھو فی الحقیقة سعادة وھی الریاسة الفاضلة والمدن والامم المنقادة لھذہ الریاسة ھی المدن والامم الفاضلة وریاسة تمکن فی المدن الافعال والشیم التی تنال بھا ما ھی مظنونة انھا سعادات من غیر ان تکون کذالك وھی الریاسة الجاھلیة۔ (احصاء العلوم العلم المدنی الفصل الخامس)

"وہ حکومت جو لوگوں میں ایسے ارادی افعال، رسوم اور اخلاق جاری کرتی ہے۔ جس کے نتیجے میں صلاح دارین پایا جاسکتا ہے، تو یہی بہترین حکومت ہے، اور جو شہر اور شہری ایسی حکومت کے زیر فرمان ہوں وہ شہر اور لوگ سب سے بہتر شہر اور لوگ ہیں۔ اور ایک وہ حکومت ہے جو مملکت میں ایسے افعال اور اخلاق کو فروغ دے رہی ہو جس کے نتیجہ میں محض اس دنیا کی ظاہری ترقی اور فلاح پائی جاتی ہو جو کہ در حقیقت ترقی اور فلاح نہیں ایسی ریاست اور حکومت جاہلیت کی حکومت ہوتی ہے"۔

سیاست کی اس طویل تحقیق سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ سیاست کی دو اقسام ہیں، ایک شرعی اسلامی اور عادلانہ سیاست اور دوسری غیر شرعی، غیر اسلامی اور ظالمانہ سیاست۔ اور چونکہ منافقانہ سیاست بھی در حقیقت غیر شرعی اور غیر عادلانہ ہے، لہٰذا وہ ظالمانہ سیاست کا حصہ ہے علیحدہ طور پر تیسری قسم نہیں ہے۔

۲۔ چونکہ سیاست، حکومت کی روح رواں ہوتی ہے اس لئے جملہ حکومتوں کا انحصار مذکورہ دو ہی قسموں پر ہے۔ تیسری کوئی قسم نہیں ہو سکتی۔

۳۔ مسلمانوں پر فرض اور لازم ہے کہ عادلانہ اور شرعی سیاست اپنائے رکھیں۔

۴۔ عادلانہ اور شرعی سیاست جملہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت دائمہ اور جاریہ ہے۔

۵۔ عادلانہ اور شرعی سیاست کے علاوہ دیگر جملہ اقسام سیاست ظالمانہ سیاست ہیں، جن کا اپنانا مسلمان کے لئے حرام ہے۔

۶۔ عادلانہ اور شرعی سیاست کے مقابلہ میں حزب اختلاف اور اپوزیشن کا کردار اپنانا مسلمان کے لئے حرام اور ناجائز ہے۔

۷۔ ظالمانہ سیاست کے مقابلہ میں تمام مسلمانوں پر حزب اختلاف اور اپوزیشن کا کردار ادا کرنا فرض اور لازم ہے۔

۸۔ بلا امتیاز مطلقاً سیاست کو برا بھلا کہنا، اس سے نفرت کرنا، یا اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا اسلامی فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی اور جہالت کا ارتکاب ہے۔

سیاست کے متعلق گذشتہ بحث و تحقیق اگلے چند مسائل کے لئے تمہید تھی، اب اصل مسئلے کی طرف آتے ہیں۔

کیا دین اسلام میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی گنجائش ہے؟

یہ ایک اہم اور نازک مسئلہ ہے، اس لئے جدید اور قدیم علماء کے مابین اس کے بارے میں الجھاؤ ہے، بعض نے اسلام میں جمہوریت جیسی اختلافی پارٹیوں کے وجود کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ ضروری بتایا ہے، اور بعض نے اسلام میں کسی بھی قسم کی اختلافی پارٹی کے وجود کو ممنوع قرار دیا ہے، دونوں جانب قابل توجہ دلائل بھی ہیں، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں دونوں جانب غلو اور افراط و تفریط ہے، اور کہیں بھی کسی کی بات بنتی نظر نہیں آتی۔ لہٰذا

اس عقدہ کے صحیح حل کے لئے بطور تمہید ایک مقدمہ سمجھ لیجئے۔

اسلام کا وہ پہلو جس میں اختلاف کی گنجائش نہیں

دنیا میں جتنی چیزیں ہیں خواہ وہ دین سے متعلق ہوں یا دنیا سے ان میں عموماً دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک وہ پہلو جو اس چیز کے قوام، حقیقت اور مقصود سے تعلق رکھتا ہے، یعنی کسی چیز کے وہ اجزاء اور عناصر جن کی موجودگی سے وہ چیز اور اس کا مقصود بعینہٖ وہی رہتا ہے جو مطلوب ہے، اور اگر ان اجزاء یا ایلیمنٹس (Elements) میں کمی و بیشی آجائے تو وہ مطلوبہ چیز اور اس کی مقصودیت بعینہٖ وہی نہیں رہتی جو مطلوب ہے۔

دوسرا پہلو وہ ہے، جس کا اصل چیز کے وجود اور مقصود مطلوبہ سے اس قسم کا تعلق تو نہیں، البتہ اس کا اصل چیز کے وجود اور مقصود کے حسن و نکھار اور خوبصورتی سے خاص تعلق ہے، جس کے تغیر یا تبدیلی سے اصل چیز اور اس کے مطلوبہ مقصود میں کوئی فرق نہیں آتا۔ البتہ اگر کوئی فرق پڑتا ہے تو اس کے اضافی امر "حسن و نکھار" میں پڑتا ہے۔

مادیات میں اس کی مثال "انسان" لیجئے، جس کا اصل وجود دو چیزوں سے وابستہ ہے، "حیوان" اور "ناطق" اور اس کے خوبتر ہونے کے پہلو کے ساتھ بے شمار چیزوں کی وابستگی ہوتی ہے، تاہم ان اضافی امور سے انسان کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ چھوٹے بچے کا قتل ہونا، نوجوان اور بوڑھے کا قتل ہونا، اسی طرح بادشاہ، اور رعایا، عالم اور جاہل کے قتل ہونے میں شرعاً اور قانوناً سزا کی مقدار میں کوئی فرق نہیں، اس لئے کہ اصل انسانیت میں سب یکساں ہیں۔

دینی لحاظ سے اس کی مثال قرآن کریم لیجئے۔ قرآن کریم نام ہے الفاظ اور معنی دونوں کا (مالک) لفظ لیجئے، اس کے لفظ کا مادہ ہے م، ل، ک اور معنی ہیں خود مختار متصرف۔ یہ وہ پہلو ہے جس کا تعلق قرآن کریم کے "قرآن" ہونے سے ہے یہ دونوں "لفظ" اور

"معانی" جب اصلی شکل میں ہوں گے تو قرآن ہوگا اور اگر اس میں تبدیلی کردی گئی خواہ لفظ کے مادہ میں مثلاً (مالک) کی جگہ (سالک) یا معنیٰ میں مثلاً سورہ فاتحہ کے لفظ (انعمتَ) کی جگہ (انعمتُ) (نعوذ باللہ) تو یہ لفظ قرآن میں سے نہ ہوا۔

اور دوسرا پہلو قرآن کریم کے الفاظ کا وہ ہے، جس کا تعلق الفاظ کی ادائیگی کے لب ولہجہ، خوش آوازی اور تحسین سے ہے، جسے قرات اور تجوید کہا جاتا ہے، یہ گویا وہ پہلو ہے جس کا تعلق قرآن کے نفس وجود اور مقصود سے نہیں بلکہ اس کے خوبتر ہونے سے ہے۔ اس میں کمی بیشی سے قرآن کے قرآن ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ اسی حدیث کی روشنی میں قرآن کی قرأت میں سات قرأتیں (قرأت سبعہ) یا قرأت میں مسلمانوں کے سات مذاہب (مذاہب سبعہ) وجود میں آئے تو اس کا تعلق درحقیقت قرآن کے خوبتر ہونے سے ہے، نفس قرآن سے ہرگز نہیں، نفس قرآن میں پوری امت کا اجماع ہے، کہ ایک حرف کی کمی بیشی کی گنجائش قطعاً نہیں ہے، کسی ایک لفظ کے مادہ یا معنیٰ میں قصداً کمی اور بیشی سے مسلمان مسلمان نہیں رہتا۔

قصہ کوتاہ :

تقریباً تمام چیزوں میں مذکورہ دو پہلو موجود ہیں اور دونوں کے درمیان واضح فرق اور امتیاز بھی موجود ہے، جس نے اس فرق کو سمجھا وہ دین اور دنیا کے مسائل میں گویا دن کے اجالے میں صراط مستقیم پاگیا، اور جس نے اس فرق کو مد نظر نہ رکھا وہ اندھیری رات میں راہ راست سے بھٹک کر الجھ گیا۔

اس تمہید کے بعد اصل سوال کی طرف آیئے۔ دین اسلام کے جملہ مسائل اور احکامات میں بھی مذکورہ دو پہلو موجود ہیں، ایک ان کی بنیادی حقیقت، اصلیت اور مقصودیت

مطلوبہ ہے۔ اس پہلو کے اعتبار سے دین اسلام کے جملہ مسائل اور احکامات میں کسی حزب اختلاف کی قطعاً نہ تو گنجائش تھی اور نہ ہے۔ اور نہ ہو گی۔

مثلاً دین اسلام کے قطعی اعتقادات، نظریات، ارکان و فرائض، حلال و حرام میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کوئی ادنیٰ سی مثال بھی نہیں ملتی کہ کسی نے خدا کی ذات، اس کی توحید، اس کے کمال، اس کی حاکمیت اور اس کی معبودیت کا انکار کیا ہو، یا اس کی معبودیت میں کسی غیر کی شرکت کو تسلیم کیا ہو اور اسے اس کے باوجود مسلمان سمجھا گیا ہو یہی کیفیت اسلام کے دوسرے بنیادی عقائد کی ہے۔

اسی طرح چودہ سو سالہ تاریخ اسلام میں امت کا نہ تو روزانہ پانچ نمازوں کی فرضیت میں اختلاف ہے، نہ تعداد میں، نہ اوقات میں اور نہ ان کی رکعتوں میں۔

یہی حال رمضان کے روزوں کی فرضیت کا ہے، نہ مہینے کے تعیین میں اور نہ دنوں کی تعداد میں کسی اختلاف کی گنجائش ہے۔ نیز حج اور زکوٰۃ کی فرضیت، وقت، تعداد، اور بنیادی ڈھانچے میں بھی کسی اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔

نیز حلال اور حرام میں پوری امت مسلمہ کے اندر کوئی اختلاف نہیں پوری امت اس پر متفق ہے، کہ ماں، بہن، بیٹی وغیرہ ذی محرم سے نکاح جائز نہیں زنا، لواطت، وغیرہ حرام ہیں۔ نیز خنزیر کا گوشت، شراب، سود، مال غیر، قتل ناحق وغیرہ حرام ہیں۔

اسی طرح امت مسلمہ اس پر بھی متفق ہے کہ مسلمان کی زندگی کے تمام پہلوؤں میں حاکمیت، شریعت اور قانون و تصفیہ معاملات کا مآخذ اور سرچشمہ صرف اور صرف قرآن اور سنت ہیں (ان الحکم الا للہ) اور اس پر بھی اجماع ہے کہ یہی نظام حیات تاقیامت ابدی ہے اور ہر زمانہ کے لئے موزوں ہے، اور انسانیت کی فلاح کے لئے اس سے بہتر کوئی اور نظام حیات نہیں ہے۔

یہ ایک اجمالی نقشہ ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، اس کا تفصیلی دائرہ بہت

وسیع ہے۔ دین اسلام کے اس پہلو میں کہیں بھی کسی مذہب حق کے امام، محدث، فقیہ یا قابل ذکر عالم دین اور اسلامی اسکالرز نے نہ تو اختلاف کیا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔ بلکہ ایسے اختلاف کرنے والے کو اسلام اپنے دامن میں پناہ دینے کا روادار نہیں ہے۔

لہٰذا اسلام کی رو سے کسی فرد یا جماعت کو دین اسلام کے مذکورہ بنیادی نوعیت کے مسائل (ضروریات دین) میں اختلاف کرنے اور اپوزیشن کا کردار اپنانے کی قطعاً اجازت نہیں ہے، یہاں تک کہ مذکورہ ضروریات دین کے مسائل میں نہ تو اہل شوریٰ کی مشاورت کی گنجائش ہے اور نہ ہی ان منصوصات کے خلاف پوری امت کی اکثریت کے فیصلے کا اعتبار ہے۔

دین اسلام کا وہ پہلو جس میں نیک نیتی کی بنیاد پر اختلاف کی گنجائش موجود ہے

دین اسلام کے مسائل اور احکامات کا دوسرا پہلو وہ ہے، جس کا تعلق نفس مسائل اور احکامات کی ذات، حقیقت، اور مقصودیت سے نہیں بلکہ ان کی اضافی صفت اولویت اور خوبتر ہونے سے ہے۔ اس قسم کے مسائل اور احکامات کو فقہاء کی اصطلاح میں فروعی مسائل کہا جاتا ہے یا اجتہادی مسائل کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ پہلو اور اس قسم کے مسائل عموماً دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔

(الف) وہ افعال اور اقوال جن کے کرنے کی حضور علیہ السلام نے بذات خود امت کو متعدد شکلوں اور صورتوں میں قولاً یا فعلاً تعلیم دی ہو، اور اس میں ناسخ اور منسوخ کی واضح صورت موجود نہ ہو، یہ گویا کہ شارع علیہ السلام کی جانب سے امت کو واضح اشارہ ہے کہ ان متعدد طریقوں میں سے احکامات کی بجا آوری کے لئے لوگوں کی رسم وعادات، زمان اور مکان کے اختلاف کے پیش نظر جو طریقہ بھی اولیٰ اور بہتر سمجھا جائے اسی طریقے سے تعمیل

حکم کیا جاسکتا ہے جس سے نفس حکم اور مقصودیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

(ب) وہ مسائل جن کے متعلق شارع نے قرآن وسنت میں تفصیلی ہدایات جاری نہ کی ہوں بلکہ اصول اور قواعد کلیہ کا بیان کیا ہو۔ یہ بھی گویا کہ شریعت کی جانب سے امت مسلمہ کے ماہرینِ شریعت کو ایک خاموش حکم دیا گیا ہے کہ ایسے مسائل میں خوب تر کی تلاش کے لئے تقاضائے حال کے مطابق اصول کے دائرے میں اپنی قوت استنباط سے ان مسائل کو حل کریں، اس قسم کے مسائل میں چونکہ انسان (مجتہد) کے ذہن کو دخل ہوتا ہے، اور انسانوں کی ذہنی استعداد میں بذات خود اختلاف، فرق اور اس پر ماحول، زمان اور مکان، لوگوں کی عادات اور مقتضائے حال کا اثر انداز ہونا ایک فطری اور مسلم بات ہے۔

لہٰذا اس قسم کے مسائل میں خوب تر کی جستجو کے نتیجہ میں مجتہدین کا اختلاف نہ صرف معقول اور فطری امر ہے، بلکہ یہی وہ مسائل ہیں جن میں تغیر ازمنہ کے سبب تغیر آسکتا ہے اور یہی وہ مقام ہے، جہاں متقدمین اور متاخرین کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ اور یہی وہ اختلاف ہے جسے رحمت کہا گیا ہے۔

مثلاً نماز کی فرضیت، رکعات، اوقات جیسے بنیادی اجزاء ترکیبی میں جملہ مذاہب حقہ کے آئمہ متفق ہیں، نیز اس پر بھی متفق ہیں کہ نماز کے اندر دل کا خشوع اور خضوع مطلوب ہے۔ اور یہ کہ نماز میں قیام چونکہ دراصل دربار خداوندی میں قیام اور کھڑا ہونا ہے، لہٰذا انتہائی ادب کے ساتھ کھڑا ہونا چاہئے۔

اب رہی یہ بات کہ آیا قیام کے دوران ہاتھ چھوڑنے چاہئیں یا باندھنے چاہئیں اور باندھنے کی صورت میں سینے پر رکھنے چاہئیں یا زیر ناف باندھنے چاہئیں۔

کس صورت میں ادب اور عاجزی بہتر ہو گی؟ حضور ﷺ کی نماز میں تینوں صورتیں پائی جاتی ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ نے زیر ناف ہاتھ باندھنے کو بہتر قرار دیا ہے۔

امام شافعیؒ نے سینہ پر ہاتھ باندھنا بہتر قرار دیا ہے۔

اور امام مالکؒ نے ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہونے میں زیادہ ادب بتایا ہے۔

اسی طرح ائمہ مذاہب میں جتنے مسائل پر اختلاف پایا جاتا ہے، اگر ان کی گہرائی میں کوئی صاحب بصیرت جھانکنے کی کوشش کرے تو ان میں اسی اضافی امر خوبتر ہونے کے لئے برائے نام اختلاف کے سوا نفس مسئلہ اور اس کی حقیقت اور مقصودیت میں کوئی اختلاف نہیں پایا جائے گا۔ (الا ماشاء اللہ)

لہٰذا دین اسلام میں مسلمانوں کے اندر اس نوعیت کا اختلاف، پارٹیوں کے منشور اور کارکردگی کے طریق کار وغیرہ میں قابل برداشت ہو سکتا ہے، خواہ ان پارٹیوں کو سیاسی پارٹیوں کا نام دیا جائے یا مذہبی جماعتوں کا کیونکہ یہ درحقیقت اختلاف نہیں ہے۔

مفکر اسلام علامہ مفتی محمودؒ کی گراں قدر بات

ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں ماڈرن مسلمان طبقہ کے اس اشکال کے جواب میں کہ "ہم کس فرقے کا اسلام نافذ کریں" مفتی محمودؒ نے فرمایا تھا کہ "مذاہب اربعہ کے اندر جب کسی بات کی ادنیٰ اباحت ہو اور تم اسی کی اساس پر قانون بنا دو تو بھی ہمارے لئے قابل قبول ہوگا" مفتی صاحب کا یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا تھا، ظاہر بین اور سطحی نگاہ والے پتہ نہیں اس بات کو کیا سمجھے، مگر مفتی محمودؒ کی حقیقت بین نگاہ میں اس امر میں کچھ اخفاء نہ تھا کہ یہ ظاہری فروعی اختلاف تو دین اسلام کے حقیقی اور اساسی پہلو میں سرے سے اختلاف ہی نہیں ہے، یہ تو محض اولویت اور خوبتر کی جستجو کا اختلاف ہے۔

ایک ضمنی سوال اور اس کا جواب

سوال: اگر مختلف مذاہب اور مسلکوں کے پیروکاروں (حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی یا

بریلوی، دیوبندی اور وہابی وغیرہ) کے درمیان حقیقی اختلاف نہیں، توان کے درمیان فرقہ واریت نے موجودہ متعصبانہ شکل کیوں اختیار کرلی ہے، اور اب تو فتویٰ بازی اور بیان بازی سے بھی بات آگے بڑھ چکی ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنی صلاحیتیں کفر کے خلاف صرف کرنے کی بجائے اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف صرف کرنی شروع کردی ہیں؟

جواب: یہ واقعی ایک افسوسناک حقیقت ہے، مگر اس کا تعلق دین اسلام سے نہیں (جو کہ میرا موضوع بحث ہے) بلکہ اس کا تعلق مسلمانوں کے کردار سے ہے، جو کہ میرے موضوع سے متعلق نہیں البتہ مختصراً اتنا عرض کردوں کہ مسلمانوں کی اس ناگفتہ بہ کیفیت کے تین اسباب ہیں۔

۱۔ علماء کی ناعاقبت اندیشی اور بھولپن یا جوش کے وقت ہوش سے کام نہ لینا۔ کیونکہ دین اسلام کا دائرہ بہت وسیع ہے، جس کے اندر مذہب کا دائرہ ہے اور مذہب کے دائرے کے اندر مسلک کا دائرہ ہے، اگر کوئی مسلمان آپ کے مسلک سے متفق نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ مذہب سے خارج ہوگیا، اور اگر وہ آپ کے مذہب سے متفق نہیں تو بھی اس کا نتیجہ یہ ہرگز نہیں کہ اسے دین اسلام سے خارج سمجھا جائے بلکہ جو کوئی بھی دائرہ اسلام کے اندر ہو اسے کفر کے مقابلہ میں اسلام کا سپاہی اور اپنا ہمکار سمجھیں۔

اگر امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کے صف اوّل کے مخالفین امام بخاری، امام شافعی وغیرہ اماموں کے اعتراضات کو ناحق سمجھ کر ان کے جوابات دیتے ہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان سے نفرت کرنے لگیں، اور ان کی طرف حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ بلکہ ہم ان حضرات کو دل وجان کی گہرائیوں سے اتنا ہی عزیز اور قابل احترام سمجھتے ہیں جتنا اپنے امام ابو حنیفہؒ کو۔ پس چاہئے کہ ہم اپنے مذہب کے مخالفین کو غلطی پر سمجھتے ہوئے بھی ان کی قدر واحترام کا پاس رکھیں۔

۲۔ عام مسلمانوں کی دین اسلام کے حقیقی علوم اور دین کی حقیقت سے ناواقفیت اور

غفلت ہے، جس کے نتیجے میں وہ محدود ذہن رکھنے والے بیان بازوں کی جذباتی تقریروں سے متاثر ہو کر مختلف سمتوں میں ہانکے جارہے ہیں، بلکہ انہی عوام کے جذباتی نعروں (واہ واہ اور زندہ باد) سے مقرر موصوف آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔

۳۔ مسلمانوں کے درمیان اس خلیج اور فاصلوں کو وسیع تر کرنے میں یورپ کا بھرپور کردار ہے، جو وہ اپنے ایجنٹوں کی وساطت سے ادا کر رہا ہے، محض اس خطرہ کے پیش نظر کہ کہیں مسلمانوں کی مخالفت کا رخ ان کے حقیقی دشمن (یورپ) کی طرف نہ ہو جائے۔

تاہم مسلمانوں کے ایسے متعصبانہ اختلافات کے لئے دین اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

دین اسلام مسلمانوں کو توحید کا سبق دیتا ہے، تفریق کا نہیں

اللہ تعالیٰ جس طرح کہ اپنی ذات اور صفات میں واحد و یکتا ہے، مسلمانوں کو بھی اسی توحید کا سبق دیتا ہے اور امت مسلمہ میں وحدت و توحید چاہتا ہے۔

۱. انا خلقنا کم من ذکر وانثی ○ (الحجرات۔ آیت: ۱۳)

"بے شک ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا"۔

(ف) مخلوق کو متعدد مردوں اور عورتوں سے تخلیق نہ کرنے میں اخوت اور وحدت کا واضح سبق پوشیدہ ہے۔

۲. انما المومنون اخوة ○ (الحجرات۔ آیت: ۱۰)

"بے شک مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں"۔

۳. واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا ○

(آل عمران۔ آیت: ۱۰۳)

"اور سب مل کر خدا کی رسی (دین اسلام) کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور

متفرق نہ ہونا"۔

٤. ولاتکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا. (آل عمران۔ آیت: ۱۰۵)

"اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو متفرق اور مختلف ہو گئے واضح ہدایات ملنے کے باوجود"۔

٥. ان الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعا لست منھم فی شیءٍ○

(الانعام۔ آیت:۱۵۹)

"جن لوگوں نے دین کو ٹکڑے کر دیا اور کئی جماعتیں بن گئے آپ کا (اے پیغمبر) ان سے کوئی تعلق نہیں"۔

٦. ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم○ (انفال۔ آیت:۴۶)

"اور آپس میں (پارٹی بازی اور حزب اختلاف واقتدار کا) جھگڑا نہ کرنا پھر تو تم کمزور اور بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا رعب جاتا رہے گا"۔

اور اگر کہیں اختلاف رائے کی نوبت آ بھی جائے تو بھی آپے سے باہر نہ ہونا۔

٧. ادفع بالتی ھی احسن فاذ الذی بینك و بینه عداوة كانه ولی حمیم○ (حم السجدہ۔ آیت:۳۴)

"برائی کا دفاع اچھائی سے کرو پھر اچانک وہ شخص جس کے ساتھ تیری دشمنی تھی ایسا ہو گا گویا کہ وہ مخلص دوست ہے"۔

٨. فبما رحمة من الله لنت لھم ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولك○ (آل عمران۔ آیت: ۱۵۹)

"اے پیغمبر یہ اللہ کی رحمت ہی ہے، جو آپ ان لوگوں کے لئے نرم خو واقع ہوئے ہیں، اور اگر آپ سخت کلام اور سنگ دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے گرد سے بھاگ جاتے"۔

حتیٰ کہ قرآن کریم غیروں کے ساتھ بھی اپنوں جیسی دلآویز انداز میں گفتگو کرنے کی ہدایت کرتا ہے، اور بہت پیارے انداز سے پارٹی بازی کی نفی فرمارہا ہے۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

وانا اوایاکم لعلی ھدی او فی ضلال مبین ○ (السبا۔ آیت: ۲۴)

"اور بے شک ہم یا تم ہدایت پر ہیں یا صریح گمراہی میں"۔

(یعنی اسلام میں دو متوازی پارٹیوں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی گنجائش نہیں)"۔

وحدت امت کے بارے میں چند ارشادات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بھی پڑھ لیجئے۔

قال علیه السلام: السمع والطاعة على مرء المسلم فيما احب وكره مالم يومر بمعصية واذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة. متفق عليه.

(بخاری کتاب الاحکام)

"ہر ایک مسلمان پر (اہل اقتدار کی بات) سننا اور ماننا لازم ہے، تاوقتیکہ وہ گناہ کا حکم نہیں دیتا اور جب وہ گناہ کا حکم دے تو پھر نہ وہ ان کی بات سنے اور نہ مانے"۔ (متفق علیہ)

قال علیه السلام: ان امر علیکم عبد مجدع يقودكم بكتاب الله فاسمعوا له واطيعوا. (مسلم کتاب الامارۃ)

"اگر تم پر نک کٹا غلام بھی امیر بنادیا جائے، تو جب تک وہ تمہاری قیادت اسلامی احکامات کے مطابق کرتا رہے اس کی بات سنو اور حکم مانو"۔

قال علیه السلام: من خرج من الطاعة وفارق الجماعة ثم مات مات ميتة جاهلية. (مسلم کتاب الامارۃ)

"جو کوئی امیر کی اطاعت سے نکلا اور جماعت سے الگ ہوا پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی

موت مرا"۔

قال علیہ السلام: من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل واحد یرید ان یشق عصاکم او یفرق جماعتکم فاقتلوہ۔ (مسلم کتاب الامارۃ والقضاء)

"اگر تمہارے معاملات (امور حکومت) کسی ایک شخص پر اکٹھے ہوں پھر اگر کوئی شخص اٹھ کر تمہاری (اجتماعی) قوت کو توڑے، یا تمہاری جماعت (وحدت) میں تفرقہ ڈالے تو اسے قتل کر دو"۔

قرآن کریم اور احادیث رسول ﷺ کے ان احکامات کی طرح بے شمار اور شدید احکامات کے ہوتے ہوئے کوئی بھی ایمان دار کسی شرعی اور حقیقی اسلامی حکمران اور حزب اقتدار کے مقابلہ میں اپوزیشن پارٹی یا حزب اختلاف کے وجود و جواز کا تصور تک نہیں کر سکتا۔

تفریق اور فرقہ واریت دین جمہوریت کی پیداوار ہے

کتاب ہذا کے ابتدائی حصہ میں اس بات پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے، کہ دین جمہوریت کے لئے حزب اختلاف کا وجود شرط ہے۔ اسی لئے دین جمہوریت میں حزب اختلاف یا کثیر الجماعتی نظام کے تباہ کن نتائج، ملک اور حکومت کی کمزوری، وحدت ملی کا پارہ پارہ ہونا ایسی باتیں ہیں، جن کے لئے کسی سند اور حوالہ پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خاص کر برصغیر ہندوپاک کی اقوام تو نصف صدی سے پارٹی بازی کی اس متعصبانہ سیاست کے نتیجے میں وہ مظالم سہ رہی ہیں کہ الامان۔

پاکستان بھی اسی جمہوریت کے منحوس سائے سے دو ٹکڑے ہوا آج پھر ملک بھر میں اور بالخصوص صوبہ سندھ میں اسی حزب اختلاف اور حزب اقتدار کی کشمکش کے باعث ہر طرف کشت و خون، چوری ڈکیتی، عصمت دری، تخریب کاری، اور سیاسی بک بکاؤ کا بازار گرم ہے یہ صرف اس لئے کہ حزب اختلاف دنیا کو دکھا سکے کہ حزب اقتدار کی حکومت نااہل اور

غیر مستحکم ہے۔ حتیٰ کہ آج دور اندیش لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ باقی ماندہ پاکستان کا کیا بنے گا؟

جمہوریت پرستوں کی جانب سے ایک اہم اشکال

جمہوریت پرست یہاں ایک اشکال فخریہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ اگر حزب اقتدار کے مقابلے میں حزب اختلاف نہ ہو تو ملکی ترقی رک جائے گی اور حکمران آمریت اور ملوکیت کی راہ پر گامزن ہو جائیں گے۔ بظاہر تو اس اعتراض میں بڑا وزن دکھائی دیتا ہے، مگر در حقیقت یہ بھی جمہوریت پرستوں کی وہی فریب کاری ہے، جو وہ ہمیشہ سے عوام کو گمراہ کرنے کے لئے کیا کرتے ہیں۔ اگر جمہوریت میں حزب اختلاف کا کردار یہ ہوتا کہ حزب اقتدار کی غلط روش اور برائیوں پر تنقید کرنا اور ان کی اچھائیوں میں ان کی مدد اور تائید کرنا تو پھر حزب اختلاف کا ہونا بجا ہوتا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔

اور حزب اختلاف کا واحد مقصد یہی ہے، کہ حزب اقتدار سے کسی بھی طرح اقتدار چھین کر خود اس پر براجمان ہو جائے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے حزب اختلاف والے حزب اقتدار کی اچھائیوں کی تعریف کی بجائے ہر اچھائی کو مسخ کر کے عوام کے سامنے برائی کی شکل میں پیش کرنا اپنا جمہوری فریضہ سمجھتے ہیں۔

چنانچہ جس دعویٰ کی بنیاد پر یہ لوگ مذکورہ اشکال پیش کرتے ہیں، وہ خود بے بنیاد ہے۔ نیز پاکستان کی تقریباً پچاس سالہ تاریخِ جمہوریت نے روز روشن کی طرح ثابت کر دیا ہے کہ حزب اختلاف اور حزب اقتدار کی دھینگا مشتی نے پاکستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے، اس کی جغرافیائی اور اسلامی اخوت میں اضافہ کرنے کی بجائے اس کی بنیادیں اکھاڑ کر رکھ دی ہیں۔

رہی یہ بات کہ اگر حزب اختلاف نہ ہو تو حزب اقتدار آمریت کی راہ اختیار کرلے گی

تو یہ بھی جمہوری حکومت کا ہی ایک تاریک پہلو ہے۔ اس لئے کہ جمہوریت میں حزب اقتدار کا تعلق اکثریتی پارٹی سے ہوتا ہے، اور نت نئے قوانین بنانے کی واحد اتھارٹی وہ خود ہوتی ہے لہٰذا ان کے متعلق آمریت کی راہ پر گامزن ہونے کا اندیشہ قابل تسلیم ہے۔

مگر ہمارا موضوع دین اسلام اور قرآن و سنت کے مطابق شرعی حکمران اور اہل اقتدار کے بارے میں ہے، جن کی حکمرانی نیابتاً اور خلافتاً ہوتی ہے، خود مختارانہ اور مستقل نہیں ہوتی بلکہ شرعی حکومت اور حقیقی مسلمان حکمرانوں کے سر پر ہر وقت قرآن اور سنت پر مبنی دائمی اور محفوظ منشور کی تلوار لٹکتی رہتی ہے، اگر وہ سر مو اللہ تعالیٰ کی آمریت کی صراط مستقیم سے ہٹ کر اپنی آمریت مسلط کرنا چاہے تو شریعت کی تلوار اس کی گردن پر آن پڑتی ہے۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے جملہ کلمہ گو مسلمان مردوں اور عورتوں کو بلا امتیاز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (اچھائی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا) کا حکم دے کر انہیں اپنے نائبین اور قائم مقام بنادیا ہے۔ اس طرح دین اسلام میں اہل اقتدار کے لئے نہ صرف قرآن و سنت کا دائمی منشور ہے، بلکہ پوری امت حزب اختلاف ہے، بشرطیکہ وہ دین اسلام کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بغاوت کی روش نہ اپنائے۔ تو کیا اس کے باوجود کسی آمریت کا سوال اور شائبہ پیدا ہو سکتا ہے؟ جمہوریت پرستوں اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے والی عوام الناس کا مذکورہ اشکال محض ان کی دین اسلام کے حقیقی علوم سے بے خبری اور حقیقی اسلام سے بیگانگی پر مبنی ہے۔

حاصل کلام :

یہ کہ قرآن کی اصطلاح میں حقیقی اسلام پر مبنی اسلامی نظام میں اس کی انتظامیہ، حکمران اور محکوم مسلمان حزب اللہ کہلاتے ہیں، اور ان کی حزب اختلاف قرآن کی اصطلاح میں "حزب الشیطان" کہلاتی ہے۔

البتہ مسلمان حکمران قوانین الٰہی سے ہٹ کر غیر اللہ کے طاغوتی قوانین اپنائے تو اس حالت میں وہ حکمران اور اس کے ہمنوا "حزب الشیطان" کے مقام پر آجاتے ہیں، پھر ایسے وقت میں پوری امت مسلمہ "حزب اللہ" اس کے مقابلہ کے لئے اٹھ کر انہیں اقتدار سے ہٹائیں گے اور حزب اختلاف کا کردار نہ صرف تقریروں، تحریروں، جلوسوں اور مظاہروں سے ادا کریں گے بلکہ سول نافرمانی جیسے انتہائی اقدام سے بھی دریغ نہیں کریں گے "لا سمع ولا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق" کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ کسی بھی انسان کی ایسی بات سنے یا مانے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو۔ (حدیث شریف)

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر ○ (آل عمران۔ آیت:۱۰۹)

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے بھیجی گئی ہو اچھے کاموں کا حکم کرو گی اور برائیوں سے منع کرو گی"۔

حضور علیہ السلام اس حکم کی تفسیر یوں فرماتے ہیں:

من رای منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه و ذالك اضعف الايمان. (مسلم شریف، بحوالہ مشکوۃ باب الامر بالمعروف)

"تم میں سے جس نے برائی دیکھی تو اسے طاقت کے ذریعہ ختم کرے اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان کے ذریعہ ختم کرے اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو دل میں اسے ختم کرنے کا عزم رکھے اور یہ ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے"۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام کے مذکورہ فرمودات کی عملی تفسیر دیکھنے کے خواہشمند حضرات، خلفاء راشدینؓ کے دور حکومت کی طرف پلٹ کر دیکھیں تو یقیناً ان کی تشفی ہو جائے گی۔

خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکرؓ کا خطبہ

حضرت ابو بکرؓ جب مسلمانوں کے سر براہ منتخب ہوئے تو آپؓ نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

فاطیعونی ما اطعت اللہ فاذا عصیت فلا طاعۃ لی علیکم (الی ان قال) فاذا رایتمونی قد استقمت فاتبعونی وان زغت فقومونی الخ. (الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ جلد ا، صفحہ ۱۶)

”سو میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ کی اطاعت کرتا رہوں اور جوں ہی میں اللہ کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر (لازم) نہیں (تا آنکہ فرمایا) جب تم مجھے دیکھو کہ (اسلام کی) صراط مستقیم پر ہوں، تو میرا حکم مانو اور جب میں بھٹک جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو“۔

خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ پر سر عام تنقید

ایک دن عمر فاروقؓ خطبہ دے رہے تھے، تو خطبے کے دوران لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ”اسمعوا و اطیعوا“ میری بات سنو اور حکم مانو اس پر ایک شخص اٹھ کر کھڑا ہوا اور امیر المومنین کو دو بدو بھرے مجمع میں کہنے لگا ”لا نسمع ولا نطیع“ ہم آپ کی بات نہ سنیں گے اور نہ مانیں گے۔ اس لئے کہ بیت المال سے جو چادریں تقسیم ہوئیں ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک چادر ملی۔ ایک چادر سے قمیص نہیں بن سکتی تھی اور آپ نے انہی چادروں کی قمیص پہن رکھی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے لئے ایک سے زیادہ چادریں لے لی ہیں۔ تمام مجمع پر سکتہ طاری ہو گیا مگر امیر المومنین نے معترض کا اعتراض کھلے دل سے سننے کے بعد اپنے بیٹے ”عبد اللہ بن عمر“ سے فرمایا کہ اس شخص کو جواب دو چنانچہ اس نے کھڑے ہو کر معترض سے کہا۔ کہ میں نے اپنے حصے کی چادر امیر المومنین کو دی تھی اس طرح انہوں نے

قیص بنالی۔ یہ سننے کے بعد معترض نے کہا "اب ہم آپ کی بات سنتے ہیں، اور حکم مانتے ہیں"۔

حضرت عمرؓ کے فرمان کو ایک عورت نے چیلنج کر دیا

عمر فاروقؓ نے ایک موقع پر فرمان جاری کیا کہ عورتوں کا حق مہر چار سو درہم سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

ایک عورت نے اس فرمان کو چیلنج کرتے ہوئے دلیل دی کہ آپ یہ پابندی کیسے لگا سکتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

وان آتیتم احداھن قنطاراo

"اگر تم نے ان عورتوں میں سے کسی ایک کو ڈھیر سا مال (بطور مہر) دیا ہو"۔

یہ دلیل سن کر حضرت عمرؓ بے ساختہ پکار اٹھے۔ پروردگار مجھے معاف فرما۔ ہر شخص عمرؓ سے زیادہ فقیہ ہے۔ اور پھر بر سر منبر اپنا فرمان واپس لے لیا۔

یہ ہے امت مسلمہ اور دین اسلام کے اساسی منشور کا وہ کردار جس کو دین جمہوریت کے پرستار "حزب اختلاف" کے توسط سے ادا کرنا چاہتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے "جیو اور جینے دو" کا مطالبہ اور قرآن کا جواب

آج کل دین جمہوریت کے پرستار حزب اختلاف کے وجود اور جواز کے لئے "جیو اور جینے دو" کو ایک ایسی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، کہ گویا کسی مدعیٰ کے ثبوت اور

حقانیت کے لئے اس پر مزید کسی دلیل کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ اور واقعی بظاہر یہ ایک انتہائی دلآویز اور معصومانہ دلیل ہے۔

مگر دراصل پوری طاغوتیت اس ظاہری معصومیت ہی میں چھپی ہوئی ہے، اس کلیہ اور قانون کا مفہوم یہی تو ہے، کہ حق کے ساتھ باطل کو، عدل وانصاف کے ساتھ ظلم وبربریت کو، امن کے ساتھ بدامنی کو، حفاظت عصمت کے ساتھ عصمت فروشی کو اور خدا پرستی کی بغل میں بت پرستی کو بھی جینے دو۔ شاید کسی شاعر نے اسی کلیہ اور اصول کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے:

؎ موحدوں کو رہے اختیار بت شکنی
برہمنوں کے لئے اذن آذری بھی رہے

حضور علیہ السلام کے زمانہ طیبہ میں اسلامی نظام اور مشرکین مکہ مکرمہ کے جاہلیت کے نظام یا بالفاظ دیگر خالق کے قوانین اور مخلوق کے قوانین کے درمیان مقابلہ زوروں پر تھا۔ اسلامی نظام حیات کے داعی پیغمبر خدا علیہ السلام تھے اور جاہلیت کے نظام حیات کا لیڈر ابو جہل لعین تھا۔ کوئی ایک فریق بھی دوسرے کے لئے نرم برتاؤ کا روادار نہ تھا۔ اس جھگڑے اور آج کل کی جدید اصطلاح کے مطابق "خانہ جنگی" کو ختم کرنے کے لئے بعض مصلحت بین اور قوم پرست مشرکین لیڈروں نے مصالحت کا جو فارمولا پیش کیا وہ بھی یہی تھا کہ "جیو اور جینے دو" پر عمل کیا جائے۔ یعنی حضور علیہ السلام کے پیش کردہ دین توحید اور ابو جہل کے دین شرک دونوں کو پہلو بہ پہلو ایک ساتھ خانہ خدا اور شہر مکہ میں پھلنے پھولنے دیا جائے۔ قرآن کریم کے طرز بیان سے اندازہ ہوتا ہے، کہ مشرکین اس تجویز اور فیصلے کو تسلیم کرنے پر آمادہ تھے۔

مگر قرآن کریم نے اس تجویز کو ٹھوس عقلی دلیل سے رد فرمایا اور کہا کہ یہ دونوں نظام حیات اندھیرے اور اجالے کی طرح ایک دوسرے کے لئے ضد ہیں۔ کیونکہ ان دونوں نظاموں میں سے ایک قطعی طور پر حق اور ہدایت ہے، اور دوسرا باطل اور ضلالت ہے لہٰذا

اس میں "جیو اور جینے دو" کے اصول کے ذریعے تصفیہ نہ تو قابل قبول ہے اور نہ معقول ہے۔
چنانچہ ارشاد ہوا۔

وانا او ایاکم لعلی ھدی او فی ضلال مبین ○ (السبأ۔ آیت: ۲۴)

"اور بے شک ہم یا تم ہدایت پر ہیں یا صریح گمراہی میں"۔

رئیس المفسرین شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں یوں لکھتے ہیں:

"اس میں ان کا جواب ہے جو بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ میاں! دونوں فرقے ہمیشہ سے چلے آئے ہیں کیا ضرور ہے جھگڑنا"۔

(ترجمہ شیخ الہند محمود الحسنؒ فوائد شیخ الاسلام عثمانیؒ)

جمہوریت پرستوں کے ایک منہ میں دو زبانیں

جمہوریت پرستوں کی زبان پر دو باتیں ہیں، جو ان کے اٹھنے، بیٹھنے، تحریروں اور تقریروں اور اخباری بیانات سے عیاں ہوتی ہیں۔

ایک تو یہ کہ جمہوریت پرست، اپنی رواداری، جیو اور جینے دو اور انسان دوستی جیسی خیالی خوبیوں کی تعریف اور مدح سرائی میں اتنا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں کہ سننے والا گمان کر لیتا ہے، کہ بس یہی خوبیوں کا گلدستہ ہے اور انسانیت کے جملہ مسائل اور مصائب کے حل میں اگر دیر ہے، تو دین جمہوریت کی آمد اور کثیر الجماعتی نظام کے نفاذ کی ہے۔

اور دوسری یہ کہ وہ دین اسلام کی بالواسطہ مذمت اور اسلامی نظام کے نفاذ سے فرار کے لئے خدا پرستوں کی فرقہ واریت، تنگ نظری اور بنیاد پرستی کا واویلا اور پروپیگنڈہ اس زور و شور سے کرتے ہیں، کہ سننے والے کو یقین ہو جاتا ہے کہ دین اسلام نافذ ہوتے ہی آسمان گر پڑے گا، زمین شق ہو جائے گی اور لوگوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔

ے چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

حالانکہ دنیا دیکھ رہی ہے، کہ آج دین جمہوریت کی فرقہ واریت (حزب اقتدار وحزب اختلاف، اکثریت واقلیت اور کثیر الجماعتی نظام) نے دنیا کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے، امن وامان، چین وسکون، شرافت وعافیت اور عدل وانصاف کے لئے لوگ ترس رہے ہیں، دین جمہوریت کی مذکورہ فرقہ واریت اور حریت عامہ (بے قید آزادی) کے نتیجہ میں ہر طرف دن دھاڑے سیاسی قتل وغارت گری، اغوا، ڈکیتی، تخریب کاری اور آبروریزی کا بازار گرم ہے۔ نہ فضائی راستے محفوظ ہیں، نہ بحری اور نہ بری، نہ گھروں کے اندر پردہ نشین عورتوں کی عصمت محفوظ ہے اور نہ معصوم بچوں کی جان، نہ تاجروں کا مال محفوظ ہے اور نہ بوڑھوں کی جمع پونجی، غرض بازاروں، دکانوں، ہوٹلوں، تفریح گاہوں، گھروں، حتیٰ کہ عبادت خانوں میں بھی اجتماعی قتل، تخریب کاری، دھماکوں اور آتش زنی کے واقعات روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں۔ بے یقینی کا دور دورہ ہے، ہر انسان کو یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ آئندہ لمحات میں میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

یہ سب کچھ انسانوں کے خودساختہ دین جمہوریت ہی کے ثمرات ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون ○ (الروم۔ آیت:۴۱)

"خشکی اور تری میں لوگوں کے کئے کے سبب فساد پھیل گیا ہے، تاکہ انہیں اللہ تعالیٰ ان کے بعض کئے دھرے کا مزہ چکھائے شاید وہ باز آجائیں"۔

مگر اس سب کچھ کے باوجود جمہوریت کی یہ فرقہ واریت "جیو اور جینے دو" کے تحت نہ صرف جائز ہے بلکہ جمہوریت کے پنپنے کے لئے بہت ضروری ہے۔

دوسری طرف اگر کہیں کسی کو کچھ امن وسکون نصیب ہے یا حیا، تقویٰ اور خوف خدا باقی ہے، تو وہ علماء کرام، مشائخ عظام کی دعوت و تبلیغ، منبر ومحراب، مدرسہ وخانقاہ کا

مرہون منت ہے۔ چنانچہ نماز باجماعت کے اجتماع سے لیکر حج بیت اللہ شریف تک تمام عظیم مذہبی اجتماعات، مظاہروں اور جلوسوں کا (جو دین اسلام کی سیاست کے لازمی اجزاء ہیں) بغور مطالعہ کریں تو ہر طرف محبت، یگانگت، مساوات اور اخوت کا ایک عطر بیز ماحول نظر آتا ہے۔ الا یہ کہ کہیں ان محافل میں جمہوری سیاست کی آمیزش ہو گئی ہو تو اور بات ہو گی۔

جب کہ جمہوریت کے اجتماعات، جلسے، جلوسوں، مظاہروں اور ہڑتالوں پر ایک نظر ڈالیں تو ہر طرف "پتھراؤ، جلاؤ، توڑ پھوڑ، نفرت، لعنت اور گالی گلوچ کا ماحول دکھائی دیتا ہے۔ پھر بھی فرقہ واریت کا الزام مذہب کے علمبرداروں اور پرستاروں پر رکھا جا رہا ہے۔

ے خون قتیل بے سر و ساماں بہ پائے خویش
مالید آں نگار حنا را بہانہ ساخت

(ترجمہ: بیچارے مقتول کے خون سے اپنے پاؤں رنگ کر اس نے مہندی لگانے کا بہانہ بنایا)

تاہم میری اس تحریر کا مقصد یہ نہیں کہ میں مذہبی متعصبانہ فرقہ واریت کی حمایت اور دفاع کر رہا ہوں بلکہ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جمہوریت پرستوں کی مشاہداتی فرقہ واریت کے مقابلے میں مذہبی موہوم فرقہ واریت کوئی قابل ذکر چیز نہیں۔

دین جمہوریت کی تاریخ میں فرقہ واریت کی اُنتہاء

پاکستان کے صدر غلام اسحٰق خان ۱۹۹۱ء کے اواخر اور ۱۹۹۲ء کے اوائل میں قومی اسمبلی اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس سے سالانہ خطاب کر رہے تھے۔ اسمبلی ہال مختلف ممالک کے سفیروں اور ملکی و غیر ملکی معززین، شرفاء اور خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اتفاق سے ان دنوں میں پشاور میں تھا۔ رات کو ٹی وی پر خبریں سننے کے لئے ہم بیٹھے تو ٹی وی پر جو کچھ دیکھا اور سنا، یقین کیجئے کہ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ واقعی یہ ایک

حقیقت ہو سکتا ہے ؟اور صرف میں نہیں بلکہ بھرے ہال میں ہر ایک کا چہرہ سوالیہ نشان بن چکا تھا کہ کیا ایک عظیم اسلامی ملک کے اعلیٰ ترین شرفاء اور مدبرین کی چوٹی کی محفل میں ایسا...... ہو سکتا ہے ؟ کیا یہ حرکات ایک مسلمان ملک وملت کی عزت وناموس کے تشخص کو بین الاقوامی طور پر برہنہ کرنے کی سازش تو نہیں؟ کیا اس سے پہلے نفرت وفرقہ واریت کا ایسا منظر چشم فلک نے دیکھا ہوگا؟

میں اس بحث میں نہیں جانا چاہتا کہ کون حق بجانب تھا؟ بلکہ میں دین جمہوریت کی خوبیوں میں سے ایک چشم دید خوبی کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ٹی وی کے پردے پر جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا وہ یہ تھا۔

کہ جب صدر پاکستان نے کھڑے ہو کر خطاب شروع کیا تو اس کے سامنے بائیں جانب ایک نوجوان عورت بے نظیر بھٹو صاحبہ جو کہ حزب اختلاف کی لیڈر تھی، کھڑی ہو گئی اور زور، زور سے بولنے اور شور کرنے لگی اور اچھلتے ہوئے ڈیسک بجانے لگی۔ اب اس کے ساتھ اور پیچھے بیٹھنے والے بوڑھے (جن کے سر کے بال بالکل سفید تھے) اور نوجوان سب اٹھ کھڑے ہوئے اچھلنے کودنے ڈیسک بجانے اور صدر پر آوازیں کسنے اور سیٹیاں بجانے لگے۔ وقفہ وقفہ سے بے نظیر صاحبہ اتنی زور سے تقریر کرنے لگ جاتیں کہ صاف اندازہ ہوتا کہ ایک ہال میں دو متوازی مقرر صاحبان بول رہے ہیں، اور دوسری طرف صدر صاحب بغیر کسی وقفہ کے تقریر جاری رکھے ہوئے تھے، تاہم بہت کوشش کے باوجود شور اور غوغا کے سبب مجھے کسی ایک کی بات بھی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ کافی دیر کے بعد جب حزب اختلاف والے (شاید نعرہ بازی سے) تھک گئے تب وہ واک آؤٹ کر کے باہر چلے گئے اور سامعین نے صدر کی باقی ماندہ تقریر سنی۔ تاہم یقین کیجئے کہ خبریں ختم ہو جانے کے بعد تمام سامعین خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے اور کسی نے آپس میں اس چشم دید واقعہ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، نہ جانے کیوں؟

چوں کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی؟

کیا مہاجرینؓ اور انصارؓ دو سیاسی پارٹیاں تھیں

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دین اسلام کے منصوص اور قطعی مسائل کے سوا دیگر پیش آمدہ اجتہادی مسائل میں تصفیہ، مشاورت، قوت دلیل اور صحت دلیل کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اکثریت کی بنیاد پر نہیں۔ اور یہ فطری بات ہے کہ مشورہ طلب مسائل میں عموماً اختلاف رائے ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ (ایک مقام) میں انصار جمع ہوئے۔ تاکہ انصار میں سے کوئی خلیفہ مقرر کیا جائے جب مہاجرین کو اطلاع ملی تو حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح ایک دو مہاجرین کو لیکر جلدی سے وہاں پہنچے۔ انصارؓ میں سے اگر کوئی شخص خلافت سنبھالنے کی پوزیشن میں تھا، تو وہ حضرت سعدؓ بن عبادہ تھے۔ بحث و مباحثہ کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے حضرت سعدؓ بن عبادہ سے فرمایا:

ولقد علمت یا سعد! ان رسول اللہ ﷺ قال وانت قاعد قریش ولاۃ ھذا الامر فبر الناس تبع لبرھم وفاجرھم لفاجرھم.

(حافظ ابن کثیر سیرۃ النبی ﷺ جلد ۴، صفحہ ۹۱ ھ۔ بحوالہ خلافت و جمہوریت، عبدالرحمان صفحہ ۴۹)

"اے سعد! تم خوب جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا اور اس وقت تم خود بھی موجود تھے، قریش امر خلافت کے والی ہیں، نیک لوگ قریش کے، نیک کی اور فاجر لوگ ان کے فاجر کی اتباع کرتے ہیں"۔

اس دلیل کے بعد حضرت عمرؓ نے ہاتھ بڑھایا اور ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی ان کے بعد مجلس میں موجود دو یا تین مہاجرین نے بھی بیعت کی اور پھر وہاں موجود تمام انصار نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی بجز ایک آدمی کے۔

عمر فاروقؓ فرماتے ہیں:

فقلت ابسط یدك یا ابوبکر فبسط یده فبایعته وبایعه المهاجرون ثم بایعه الانصار الخ. (بخاری شریف، کتاب المحاربین باب رجم الحبلی)

"پس میں نے ابو بکر سے کہا اپنا ہاتھ بڑھایئے انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے بیعت کی اور مہاجرین نے بیعت کی پھر انصار نے بیعت کی"۔

خلافت ابو بکر صدیقؓ کے اس ہنگامی طور پر پیش آنے والے واقعے کو یار لوگوں (جمہوریت پرستوں) نے دین جمہوریت کی طرح کے، حزب اختلاف و حزب اقتدار یا اکثریت و اقلیت اور کثیر الجماعتی نظام کے جواز کے لئے ایک ٹھوس دلیل کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دیکھو انصارؓ اور مہاجرین دو سیاسی پارٹیاں تھیں، اور ہر ایک پارٹی حصول حکومت کے لئے کوشاں تھی اور چونکہ مہاجرین اکثریت والی پارٹی تھی، اس لئے خلافت اس کو ملی۔

عقل انگشت بدندان کہ ایں چہ بوالھوسیست

(ترجمہ: عقل حیران ہے کہ یہ کیا بیہودگی ہے۔)

حالانکہ یہ سراسر جھوٹ ہے کیونکہ۔

۱۔ اگر انصار اور مہاجرین دو الگ الگ سیاسی پارٹیاں تھیں تو اس مجلس شوریٰ میں جس میں مہاجرین صرف چار یا پانچ تھے، باقی اراکین سب انصار تھے مہاجرین کی اکثریت کی بات کیا سفید جھوٹ نہیں؟

۲۔ اگر یہ دو الگ الگ سیاسی پارٹیاں تھیں تو انصارؓ نے اپنے پارٹی لیڈر سعدؓ بن عبادہ کو جو خلافت کے امیدوار تھے، چھوڑ کر کیوں حضرت ابو بکرؓ کو ووٹ دیا؟

۳۔ کیا اس انتخاب کے بعد انصارؓ کی طرف سے کسی موقع پر حزب اختلاف کا کردار ادا کرنے کا کوئی شائبہ بھی دیکھنے میں آیا؟

۴۔ کیا انصارؓ اور مہاجرینؓ کو ان دو صفاتی القاب (مہاجرین و انصار) سے اللہ تعالیٰ

نے نواز اٹھایا انہوں نے یہ دونام جدا جدا سیاسی پارٹیوں کے ناموں کے طور پر خود اپنائے تھے؟

۵۔ کیا انصارؓ اور مہاجرینؓ کے دو الگ پارٹیوں کے طور پر وجود میں آنے کی غرض یہ تھی کہ اقتدار پر قبضہ کر سکیں؟ جب کہ جمہوریت کی سیاسی پارٹیوں کے ترکیبی اجزاء اور منشور میں حکومت حاصل کرنا ایک بنیادی جزء ہوتا ہے۔

لہٰذا ایسا سمجھنا نہ صرف تاریخی حقائق کو مسخ کرنا ہوگا بلکہ ان مقدس ہستیوں پر ایک بہتان ہوگا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

محمد رسول الله والذين معه اشدآء على الكفار رحمآء بينهم تراهم ركعا سجدا يبتغون فضلا من الله ورضوانا۝

(الفتح۔ آیت: ۲۹)

"محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں کفار پر سخت ہیں، اور آپس میں رحم دل ہیں، تو انہیں دیکھے گا رکوع و سجود کرتے ہوئے ڈھونڈھتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی"۔

یعنی صحابہ آپس میں شیر و شکر اور جماعت واحدہ ہیں، اور کفار کے لئے حزب اختلاف ہیں۔ اور ان کی اس جماعت بندی کی واحد غرض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنا ہے۔

دین جمہوریت کی سیاسی پارٹیوں کی تعریف

یورپین علمبرداران جمہوریت نے سیاسی پارٹیوں کی تعریف میں یوں لکھا ہے:

۱۔ میک آئیور : "ایسی جماعت جو کسی اصول یا پالیسی کی بنیاد پر منظم ہو اور جو آئینی ذرائع سے حکومت سنبھالنے کی کوشش کرے"۔

۲۔ گلکرائسٹ : "شہریوں کا ایک منظم گروہ جو ایک ہی سیاسی عقیدہ رکھتے ہیں اور

جو سیاسی اتحاد کے ذریعہ اقتدار حکومت کے حصول کی کوشش کرتے ہیں"۔

۳۔ لارڈ برائس : "منظم جماعتیں جن کی رکنیت رضاکارانہ ہوتی ہے، اور جن کا پورا زور سیاسی طاقت کے حصول پر صرف ہوتا ہے"۔

(اصول سیاسیات۔ مصنف صفدر رضا، صدر شعبۂ سیاسیات بعنوان سیاسی جماعتیں صفحہ ۳۰۹ پانچواں ایڈیشن)

خلاصہ! جمہوریت میں ایک سیاسی جماعت کے اجزاء ترکیبی تین ہیں۔

۱۔ کسی مخصوص سیاسی عقیدے کی بنا پر بنی ہو۔

۲۔ رضاکارانہ رکن سازی کی تنظیم ہو۔

۳۔ تشکیل اور تنظیم کا مقصد حصول اقتدار ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ جو سیاسی جماعتیں الیکشن ہار جاتی ہیں، وہ حزب اختلاف کی شکل میں اپنا الگ تشخص اور مستقل وجود برقرار رکھتی ہیں۔ اور حزب اقتدار کی ہر پالیسی اور کارکردگی پر نکتہ چینی کرتی رہتی ہیں۔ آخرکار تنقید اور جواب تنقید فریقین کی انا کا مسئلہ بن کر اختلاف پر منتج ہوتا ہے۔ یہ اختلاف جمہوری سیاست میں ایک لازمی عنصر کی سی حیثیت رکھتا ہے جس کے بغیر اسمبلیاں تشکیل نہیں پاسکتیں۔

اب انصاف کیجئے کہ سقیفۂ بنی ساعدہ کے انتخاب میں اور اس کے بعد پورے خلافت صدیقی بلکہ خلفاء راشدین کے زمانے میں کہیں ایسے واقعات پیش آئے ہیں تو بتائیے؟ البتہ اجتہادی مسائل میں اختلاف رائے رہا ہے، مثلاً بنو ہاشم کو شکوہ تھا کہ ہمیں انتخاب خلیفہ میں کیوں نظر انداز کیا گیا۔ حالانکہ یہ ایک ہنگامی حادثہ تھا خدشہ تھا کہ کہیں پھوٹ نہ پڑ جائے جبکہ اہل بیت حضور ﷺ کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے، لیکن باوجود اس شکوہ کے اگرچہ حضرت علیؓ نے بیعت کرنے میں تاخیر کی لیکن کہیں بھی حکومت کی پالیسیوں پر تنقید نہیں کی اس لئے کہ تمام صحابہ کا سیاسی عقیدہ ایک تھا۔ لہٰذا صحابہ سب کے سب ایک ہی جماعت کے افراد تھے نہ کہ متعدد جماعتیں۔

ہاں حضرت عثمانؓ کو شہید کرنے والے سبائی باغیوں کے پروپیگنڈہ کا شکار مسلمان کسی حد تک سیاسی پارٹیوں کی تعریف میں آسکتے ہیں، مگر انہیں جمہوریت پرست اپنے لئے بطور دلیل پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ صراحتاً بغاوت پر اتر آئے تھے۔

باب ہفدہم

دین جمہوریت مغربی دانشوروں کی نظر میں

جیسا کہ کتاب ہذا کی ابتدا میں ذکر ہو چکا ہے، کہ دین جمہوریت کی ابتدا یونان میں ایک مشرکانہ نظریہ سے ہوئی اور آج اس کی انتہائی ترقی یافتہ شکل بھی وہی مشرکانہ نظریہ (عوام کی حاکمیت اور شارعیت) ہے۔ تاہم ہر دور میں نہ صرف اپنے زمانے کے بلکہ تاریخ انسانیت کے مانے ہوئے اعلیٰ ترین علماء، عقلاء اور دانشوروں نے بھی برملا اس جمہوریت کی حماقت اور کھوکھلے پن پر کاری ضربیں لگائی ہیں، اور آج تک برابر اس کے ناقدین میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

وہ دن دور نہیں کہ خواص و عوام دینِ جمہوریت کے باقی ماندہ آدھے حصے (سرمایہ دارانہ جمہوریت) کو بھی اس ذلت اور نفرت کے ساتھ ٹھکرا دیں گے جس طرح انہوں نے مردود نصف (اشتراکی جمہوریت) کے بت کو پاش پاش کر دیا ہے اور یقیناً

؎ بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

والی بات بہت جلد نظر آئے گی انشاء اللہ "وما ذالك على الله بعزيز"۔

رئیس العقلاء "سقراط" اور جمہوریت

سقراط جو اپنے عہد میں عاقل ترین افراد میں شمار ہوتا تھا جمہوریت کے متعلق یوں لکھتا ہے:

"اس جمہوریت سے زیادہ مضحکہ خیز چیز اور کیا ہو سکتی ہے، جس کی ناک میں ہجوم نے نکیل ڈال رکھی ہو، جہاں جذبات کا دور دورہ ہو، جہاں حکومت ایک مجلس مباحثہ ہو، جہاں فوج کے سپہ سالار بن سوچے سمجھے منتخب و برخاست اور ہلاک کئے جاتے ہوں، جہاں حروف

جھی کے اعتبار سے بے چارے موٹی عقل رکھنے والے کسانوں اور تاجروں کو منتخب کرلیا جاتا ہو تاکہ وہ سلطنت کی عدالت عالیہ کے ارکان کی حیثیت سے کام کریں"۔

(ول ڈیورانٹ داستان فلسفہ۔ ترجمہ سید عابد علی عابد صفحہ ۴۴)

سقراط آگے لکھتا ہے:

"کیا یہ گھٹیا درجے کا توہم نہیں کہ محض تعداد کی کثرت سے دانشوری وجود میں آجائے گی۔ اس کے برخلاف کیا یہ بات مسلمہ طور پر مشاہدے میں نہیں آتی کہ جو لوگ مجمع میں شامل ہوتے ہیں وہ ان لوگوں سے کہیں زیادہ بیوقوف تشدد پسند اور ظالم ہوتے ہیں جو تنہا اور علیحدہ ہوتے ہیں۔ کیسی شرمناک بات ہے کہ انسانوں پر وہ خطیب (مقرر) حکمران ہوں جو طویل ترین تقریریں کرتے ہوں اور جنہیں پیتل کے ان برتنوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جنہیں ضرب لگائی جائے تو اس وقت تک صدا دیتے رہتے ہیں جب تک کوئی ان پر ہاتھ نہ رکھ دے"۔ (حوالہ مذکورہ)

سقراط نے کتنی پتے کی بات کہی ہے، کہ کوئی ظالم، جاہل اور اوباش اکثریت کے بل بوتے پر جو کچھ کر سکتا ہے وہ اکیلے پن میں ہرگز نہیں کر سکتا کیونکہ اسے انجام بد کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔

افلاطون اور ارسطو :

افلاطون اور ارسطو نے بھی تصور جمہوریت کو رد کیا ہے۔

جدید جمہوریت کے بانی "روسو" اور جمہوریت

مفکر و محرک انقلاب فرانس، بانی جمہوریت جدیدہ "روسو" اکثریت کی حاکمیت کے تضادات اور حماقت کو یوں اجاگر کرتے ہیں۔

(ترجمہ) "اگر ہم اس اصطلاح کو اس کے صحیح ترین معنوں میں استعمال کریں تو (حقیقت یہ ہے کہ) سچی جمہوریت نہ کبھی موجود رہی ہے، نہ کبھی موجود ہو گی، یہ بات سراسر خلاف عقل ہے کہ حکومت کرنے والے کثرت میں ہوں اور جن پر حکومت کی جارہی ہو وہ قلیل ہوں"۔ (مغربی جمہوریت اہل مغرب کی نظر میں صفحہ ۶)

برطانیہ کے مرد آہن مسٹر چرچل کہتے ہیں

"جمہوریت ہر اس نظام کے مقابلے میں جواب تک آزمایا گیا ہے بدترین قسم کا نظام حکومت ہے"۔ (حوالہ مذکورہ)

یورپ کے عظیم مؤرخ "کارلائل" کہتے ہیں

"ہر عقلمند آدمی کے مقابلے میں نو بیوقوف ہوتے ہیں جمہوریت احمقوں کی حکمرانی کا دوسرا نام ہے"۔

ڈونلے اگیشن کہتے ہیں

"جمہوری پارٹی ایک خچر ہے جسے نہ تو اپنے آباؤ اجداد پر فخر ہے اور نہ اپنے اخلاف کے سلسلے میں کسی بہتری کی امید ہے"۔ یہی بات جمہوریت کے بارے میں بھی اتنے ہی وثوق اور تیقن سے کہی جاسکتی ہے۔

برنارڈ شاہ

ممتاز انگریزی ڈرامہ نگار برنارڈ شاہ کہتے ہیں۔

"جمہوریت متعدد نااہل لوگوں کے ذریعے منعقد ہونے والے الیکشن کے نتیجے میں

چند بد عنوان لوگوں کے تقرر کا دوسرا نام ہے"۔

لیکی

آئر لینڈ کے ممتاز مورخ اور مقالہ نگار ولیم ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی جو کہ کئی معرکۃ الآراء کتب کے مصنف ہیں اپنی کتاب "جمہوریت اور آزادی" میں لکھتے ہیں:

"جمہوریت کو کیا کہئے جس کے سبب شرابی، آوارہ، اوباش اور سماج دشمن عناصر بھی بعض اوقات الیکشن میں کامیاب ہو جاتے ہیں"۔

فاضل مصنف آگے لکھتے ہیں۔

"خالص جمہوریت نہایت غیر مستحکم حکومتوں کا باعث رہی ہے، جن میں ٹیکس اور قرضوں کی مقدار بڑھتی جاتی رہی ہے، جن میں مسلسل فوجی بغاوتیں ہوتی رہی ہیں اور جہاں انارکی اور آمریت بار بار آتی رہی ہے۔ میکسیکو کی مثال دے کر مصنف کہتا ہے کہ میکسیکو میں ۱۸۲۱ء سے ۱۸۵۳ء تک ۳۲ سال کے عرصہ میں جمہوریت کی کم و بیش ۴۸ اقسام یکے بعد دیگرے نافذ ہوئی ہیں۔ اسی ذیل میں مصنف اسپین اور فرانس کی جمہوری قلابازیوں کا ذکر بھی کرتا ہے"۔

لیکی۔ مغربی جمہوریت کو مشرقی لوگوں کے مزاج کے خلاف ٹھہراتا ہے اور لکھتا ہے۔

"ہندوستان میں بعض ایسے (سیاسی) طریقہ ہائے کار کو رواج دیا جا رہا ہے، جو جدید یورپی جمہوریتوں سے مستعار لئے گئے ہیں، اور جو مشرقی لوگوں کے لئے قطعی طور پر غیر مناسب، ان مل اور بے جوڑ ہیں"۔ (جمہوریت اور آزادی۔ صفحہ ۲۵۰)

شپنگلر

جرمن کے نامور فلسفی مورخ اور ناقد شپنگلر نے نہ صرف جدید جمہوریت پر تنقید کی ہے بلکہ قدیم جمہوریت کی بھی خوب خبر لی ہے۔ جو اس نے اس بارے میں لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ رومی لیڈر عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے جو حربے استعمال کرتے تھے ان میں سے اکثر ہمارے لئے قابل نفرین اور ناقابل برداشت ہیں۔ مثلاً دوران تقریر آہی اثرات اور اپنے کپڑے پھاڑ ڈالنا وغیرہ۔ اور تو اور قیصر روم پچاس سال کی عمر میں بھی اپنے سپاہیوں کے لئے یہ کھیل کھیلنے پر مجبور تھا، کیونکہ وہ اس کے عادی ہو چکے تھے اور خدمت کی بجا آوری سے پہلے اس ڈرامے کی توقع رکھتے تھے، اس طریق کار میں سامعین کی شرمناک خوشامد بھی شامل تھی، اپنے مخالفین کے بارے میں شرمناک جھوٹ بولنا، فصاحت وبلاغت کے دریا بہانا، دھمکیاں دینا اور مکّے دکھانا، اوران سب سے بڑھ کر دولت کے حربے آزمانا عام بات تھی۔

رینے گینوں

رینے گینوں فرانس کا ممتاز دانشور تھا جس نے مسلمان ہو کر اپنا اسلامی نام عبدالواحد یحیٰی رکھا۔ رینے گینوں لکھتا ہے:

"جمہوریت کے نظریے کے مطابق قوت کا مآخذ نچلا طبقہ ہے، اور یہ لازماً اکثریت پر مبنی ہوتا ہے یہ ایک ایسا اعتقاد ہے، جس کا منطقی نتیجہ تمام حقیقی قابلیت واہلیت کی نفی کی صورت میں نکلتا ہے، کیونکہ اہلیت و قابلیت کا مطلب ہمیشہ مقابلتاً برتری ہی کا ہوگا اور اس کا تعلق لازماً اقلیت سے ہوگا"۔

اس دلیل کا خلاصہ یہ ہو سکتا ہے "گھٹیا سے بڑھیا" کا صدور نہیں ہو سکتا یہ ریاضی کا

ایک صاف اور سیدھا اصول ہے کہ نیست سے ہست اور کم سے زیادہ کا حصول نہیں ہو سکتا۔

لارڈ برٹرینڈ رسل

عہد حاضر کے مشہور فلسفی اور ممتاز مفکر رسل لکھتے ہیں۔

"سب سے کامیاب جمہوری سیاست دان وہ ہوتے ہیں، جو جمہوریت کو ختم کر کے آمر بن جاتے ہیں۔ لینن، مسولینی اور ہٹلر اقتدار حاصل کرنے میں جمہوریت ہی کے مرہون منت تھے"۔

آگے چل کر لکھتا ہے:

"اکثریت کا جبر ایک بہت حقیقی خطرہ ہے یہ سمجھنا غلطی ہے کہ اکثریت ہمیشہ درست کہتی ہے۔ ہر نئے مسئلے میں اکثریت ہمیشہ غلطی دکھاتی ہے"۔

(ماخوذ از مغربی جمہوریت اہل مغرب کی نظر میں، حسین فراقی)

ہم اقوام غیر کے فلسفیوں کی، جمہوریت پر تنقید کے ان چند نمونوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان جیسے دیگر مغربی اسکالروں، فلاسفروں اور سائنس دانوں کے ناموں کی فہرست اور ان کی اس باریک منطقی اور سائنٹیفک تنقید کو اگر جمع کیا جائے جو انہوں نے اس بارے میں سپرد تحریر کی ہے تو ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔

علامہ اقبالؒ اور جمہوریت

شاعر مشرق علامہ اقبال نہ صرف ایک شاعر تھے، بلکہ یورپ کے جدید فلسفوں اور علوم کے ماہر اور یورپ کے مزاج شناس بھی تھے۔ آپ کا ہر قول اور شعر رموز اور اسرار کا خزینہ ہے، آپ کی ہر بات مسلمانان وطن کے لئے عمومی طور پر اور تعلیم نو کے روشن فکر لوگوں کے لئے خصوصی طور پر ایک "ناقابل انکار حجت" کی حیثیت رکھتی ہے۔ جمہوریت

کے متعلق علامہ کے اشعار ذکر کئے بغیر یقیناً یہ بحث تشنۂ تکمیل رہ جائے گی وہ فرماتے ہیں:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

(بانگ درا)

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانی نہ می آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نہ می آید

(پیام مشرق)

فرنگ آئینِ جمہوری نہاد است
رسن از گردنِ دیوے کشاد است
چو رہزن کاروانے در تگ و تاز
شکمہا بہرِ نانے در تگ و تاز

گروہے را گروہے در کمین است
خدایش یار اگر کارش چنین است
ز من دہ اہل مشرق را پیامے
کہ جمہور است تیغ بے نیامے

(زبور عجم)

ـ اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

(ضرب کلیم)

ـ تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

(ارمغان حجاز)

ـ ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

(ارمغان حجاز)

ـ اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

(بانگ درا)

۔ یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری

(ضرب کلیم)

یہ ہیں فلسفی شاعر علامہ اقبال کی دین جمہوریت پر چند ضربات۔
ذیل میں ناظرین کی آسانی کے لئے علامہ کے اعتراضات اور تنقیدات کا نمبروار خلاصہ پیش خدمت ہے۔

۱۔ مغرب کا جمہوری نظام بظاہر آزادی اور حریت کی پر فریب شکل ہے۔ مگر درحقیقت یہ وہی پرانی آمریت، سرمایہ دارانہ نظام، ظلم و بربریت ہے۔

۲۔ پارلیمنٹ، اسمبلی اور مقننہ میں لوگوں کی ترقی اور مفادات کے لئے گرما گرم مباحثے اور آئین سازی کے لئے مکالمے درحقیقت غریبوں کے لئے نہیں بلکہ سرمایہ داروں کے حقوق کے تحفظ پر منتج ہوتے ہیں۔ عوام کے لئے ان کے اثر کی مثال فقط ایسی ہے، جیسے مغرب کے دواخانوں کی وہ نشہ آور گولیاں جن پر میٹھا خول چڑھایا گیا ہو اور جن کا فائدہ مرض کا علاج نہیں بلکہ قوتِ حس کو مفلوج کرنا ہوتا ہے۔

۳۔ جمہوریت کے سبز باغوں کی حقیقت، دھوکہ دہی اور سراب کے سوا کچھ نہیں مگر عوام اسے حقیقی باغات سمجھ بیٹھے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے کوئی نادان جیل خانے کی سلاخ دار کوٹھڑی کو گھر سمجھ بیٹھے۔

۴۔ دین جمہوریت سے دور بھاگو اس لئے کہ اس میں ادنیٰ اور اعلیٰ، کمینے اور شریف، عاقل اور احمق، عالم اور جاہل کی کوئی تمیز نہیں ہے، حالانکہ مسلّمہ بات ہے کہ نہ تو اربوں

کھربوں چیونٹیوں سے سلیمانی فطرت حاصل ہو سکتی ہے، اور نہ ہی دو سو گدھوں کے دماغوں سے ایک انسانی دماغ جیسا کارنامہ انجام دینا ممکن ہے۔

۵۔ جمہوریت کے کارناموں اور تحفوں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

(الف) زنجیروں میں جکڑے ہوئے مقید دیو کو "حریت" کے نام پر فساد پھیلانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ (رسن از گردن دیوے کشادا است)

(ب) ملک کے محافظین کو لٹیرے بنا دیا۔

(ج) زندگی کی غرض و غایت اور مقصد، محض پیٹ کو بھرنا قرار دے دیا۔

(د) حصول اقتدار کے لئے حزب اقتدار اور حزب اختلاف کو آپس میں دست و گریباں کر کے ملک کو خانہ جنگی کے دھانے پر لا کھڑا کیا۔ جس ملت کی روش یہ ہو اسے خدا ہی بچا سکے گا۔

۶۔ جمہوری حکومت کی مختصر تعریف یہ کہ "وہ حکومت جس میں صرف سروں کو گنا جاتا ہے۔ اہلیت، قابلیت اور استعداد پرکھنے کے لئے اس کے ہاں کوئی معیار اور کوئی میزان نہیں"۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

۷۔ جمہوریت بدترین چنگیزیت ہے، مگر ہم نے اسے خوشنما اور دلربا بنا لیا ہے۔

۸۔ جمہوریت کے آزادانہ انتخابات بھی عوام کے لئے قتل گاہیں ہیں۔

جمہوریت کی آری سے اوروں کو چیرنے والا خود بھی ساتھ کٹ مرتا ہے۔ لہٰذا اس نو آوردہ گندی تہذیب کی جملہ گندگی کو باہر پھینک دو۔

۹۔ مشرق میں انسان کی بربادی کا سبب وڈیروں، نوابوں اور سرداروں کی غلامی اور شخصیت پرستی ہے، جب کہ مغرب میں اس کا سبب، جمہوری نظام ہے۔

۱۰۔ نجات کا واحد ذریعہ حضور ﷺ کے لائے ہوئے دین کی پیروی اور اطاعت

و تقلید ہے اور بس۔ "غلامے پختہ کارے شو"۔

یہ تھا علامہ اقبال کی تنقیدات کا خلاصہ۔

جدید تعلیم سے مزین دوستوں سے مخلصانہ گذارش

جدید تعلیم یافتہ دوستوں سے گذارش ہے، کہ دین جمہوریت پر دین اسلام (قرآن وسنت) کے زاویہ نگاہ سے اعتراض چونکہ آپ صاحبان کی ذہنی قوت ہاضمہ کے لئے یقیناً قابل قبول نہیں، اور اس میں آپ حضرات ایک حد تک معذور بھی ہیں۔ کیونکہ پچیس تیس سال تک آپ صاحبان کو ایک خاص تعلیم، ایک خاص ماحول میں دی گئی، اور ایک خاص انداز سے آپ کے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی گئی کہ قرآن وسنت کا ہر حکم، اللہ اور اس کے نبی ﷺ کا ہر فرمان، تنگ نظر ملا کے ملاازم کا حصہ ہے۔ دین کے احکامات تنگ نظر، بنیاد پرست اور دقیانوسی ملاؤں کی باتیں ہیں۔ بس اتنی سی بات آپ صاحبان کے نزدیک لعل وگوہر کو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں پھینکنے کے لئے ایک سائنٹیفک دلیل ہے۔ حالانکہ عالم دین کا کسی شرعی حکم میں صرف اسناد دخل ہوتا ہے، کہ وہ اس کے متعلق کسی قرآنی آیت یا حدیث رسول ﷺ کا ریفرنس دیتا ہے، اور شریعت میں ان کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور بس۔

مگر علامہ اقبالؒ اور یورپ کے دانشوروں، فلاسفروں اور اسکالروں کی باتیں تو یقیناً آپ صاحبان کے ذہنی ہاضمہ کے لئے مرغوب ترین غذا ہیں۔ لہٰذا انصاف کرتے ہوئے تھوڑے وقت کے لئے مغربی جمہوریت کی اندھی تقلید کی عینک اتار کر کھلی آنکھوں اور کھلے ذہن سے مذکورہ مغربی مفکرین اور علامہ اقبال کی تنقیدات کو سمجھیں، اور پھر جمہوریت کی موجودہ کرتوتوں سے ان کا موازنہ کریں کہ ان اسکالروں نے جو کچھ کہا ہے، متعصبانہ الزام تراشیاں ہیں یا واقعی مشاہداتی حقائق ہیں، یہ فیصلہ آپ خود بہتر طور پر کرسکتے ہیں۔

دین جمہوریت کے منہ پر فطرت کا تھپڑ

دین جمہوریت کی وہ اساس جس پر جمہوریت کی ملمع اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی عمارت قائم ہے، وہ ہے "اکثریت" کا اصول۔ گذشتہ مباحث میں از روئے نقل و عقل اس کے کھوکھلے پن پر سیر حاصل تحقیق ہو چکی ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا ہے، کہ انسانی اور کائناتی تاریخ کے ہر دور میں، ہر شعبے میں "فطرتی قوانین" اس اصل کی کس طرح دھجیاں اڑاتے رہتے ہیں معمولی غور کریں تو خوب سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً آپ حیوانات، نباتات اور جمادات کی ہر ایک نوع کے افراد کا مطالعہ کریں۔ تو آپ کھلی آنکھوں سے خود مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ قدرت نے ہر دور میں ہر شعبے کے افراد کی اقلیت میں کمال اور خوبی کو رکھا ہے، اور نقص و عیب کو اکثریت میں ودیعت کر رکھا ہے۔

مثلاً نوع انسان کو لیجئے کہ نبوت، ولایت، عقل و دانائی اور علم و ہنر جیسے جملہ اوصاف کمال و خوبی اقلیت بلکہ کمترین اقلیت کے حصہ میں آئے ہیں، اور معاشرے کے چیدہ چیدہ افراد جیسے سائنس دان، فلاسفر، انجینئر، حاذق اور دوسرے ماہرین فنون ہمیشہ اقلیت میں رہے ہیں۔

اس کے برعکس فسق و فجور، شرک و کفر، جہالت و حماقت، سائنس و ٹیکنالوجی اور پیشہ ورانہ فنون سے بے خبری حتی کہ جملہ عیوب اور نقائص کی قدرت نے عوام کی عظیم اکثریت میں بھرمار کر دی ہے۔ اور یہی حال دیگر مخلوقات کی جملہ اجناس اور انواع کے افراد کا ہے۔

نتیجہ :

اقلیت میں جتنی ترقی ہو گی کمال اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔ تا آنکہ انسانیت کے دریگانہ محمد مجتبیٰ ﷺ کی ذات گرامی پر جا کر یہ ترقی رک جائے گی۔

اسی طرح اکثریت میں جتنی ترقی اور اضافہ ہوگا جہالت، ظلم وبربریت، حماقت، بیوقوفی، بے حیائی، بد تمیزی، بے ایمانی اور بے قدری جیسے تمام نقائص اور عیوب کی ترقی اور عروج ہوگا، تا آنکہ یاجوج اور ماجوج کی نوبت آجائے گی۔ بلاکم وکاست کائنات کی تقریباً ہر نوع کی یہی کیفیت ہے۔

تو خود کتاب مفصل بنا ازیں مجمل

یہ گویا قدرت کی طرف سے ایک دائمی تھپڑ ہے جو دین جمہوریت کے منہ پر رسید کیا جاتا رہتا ہے۔ (فاعتبروا یا اولی الابصار)

باب ہژدہم

دین جمہوریت کے بارے میں چند اہم سوالات اور جوابات

میں کتاب ہذا کی ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ یورپ نے پروپیگنڈہ مہم کے تحت مسلمانان عالم کو ان دیکھی لیلائے جمہوریت کا اولاً تو دلدادہ بنایا پھر مغرب نے خود ہی مسلمانوں کے لئے بلا واسطہ یا اپنے مستشرقین ایجنٹوں کے ذریعے دین اسلام اور دین جمہوریت میں وحدت و یگانگت کے گیت گانے شروع کر دیے کہ ان دو متضاد، ادیان میں ذرہ برابر فرق نہیں۔

ے رشتہ وصل بحدیست میان ما و تو
کہ رقیب آمد و پرسید نشان ما و تو

ترجمہ : بوقت وصل ہمارے درمیان اس حد تک وحدت واتصال ہوا کہ رقیب امتیاز نہ کر سکا۔

سادہ لوح مسلمان نے سکھ کا سانس لیا کہ شکر ہے، کہ دشمن تسلیم کرتا ہے کہ اسلام بھی قبولیت اور شرافت کی اس بلندی پر فائز ہے، جس پر جمہوریت براجمان ہے۔ اب ہم اسلام اور جمہوریت کو برابر قرار دینے والے یورپین ذہنیت یا یورپ سے برآمد کردہ شبہات اور ان کی حقیقت کو تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔

سوال نمبر ①

اسلام کا نظامِ حکمرانی شورائی ہے اور جمہوریت کا بھی۔

دین اسلام اور دین جمہوریت کی یکسانیت کے لئے یہ بات ایک اساسی اور بنیادی طور

پر پیش کی جاتی ہے، کہ اسلام کا نظامِ حکمرانی شورائی ہے اور مشورہ کے اندر جو بات طے ہوتی ہے وہی قانون اور لائحہ عمل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اپنے رسول کو حکم دیا کہ "آپ اپنے صحابہ سے مشورہ کیا کرو" بلکہ مسلمانوں کو شورائی طریقۂ حکمرانی اپنانے پر زور دیا ہے "امرھم شوریٰ" ان کے آپس کے امور مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ حضور ﷺ کی مختلف مجالسِ شوریٰ اس بات کی زندہ مثالیں ہیں۔ حتیٰ کہ عبادت تک کے مسئلے میں بھی مشورہ سے فیصلے کئے جاتے (اذان کے متعلق مشورہ) نیز خلفاء راشدینؓ بھی مشورہ کے تحت حکومت چلاتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

اور دین جمہوریت کی حکمرانی بھی اکثریت کے مشورہ کی مرہون منت ہے۔ اکثریت کی رائے اور مشورہ جب تک سامنے نہ آجائے تب تک نہ کوئی قانون بنتا ہے اور نہ حکومت و حکمرانی۔ لہٰذا نتیجہ یہ ثابت ہوا کہ دین اسلام اور دین جمہوریت در حقیقت ایک ہی چیز ہیں اگر فرق ہے تو صرف نام کا ہے اور بس۔

جواب :

اوّل تو یہ بنیاد اور اصل ہی جھوٹ اور باطل ہے کہ اسلام کا نظامِ حکمرانی شورائی ہے۔ یہ محض دھوکا دہی ہے یا اسلامی نظام کی حقیقت سمجھنے میں مجرمانہ کوتاہی۔

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا میرود دیوار کج

ٹیڑھی بنیادوں پر دیوار کھڑی کرنے سے تو ٹیڑھی دیوار ہی بنے گی خواہ اسے کتنا ہی بلند کیا جائے۔

اسلامی نظام حکمرانی بحیثیت مجموعی شورائی ہرگز نہیں ہے بلکہ آمرانہ ہے۔ مگر کسی ظلوم اور جہول کی آمریت ہرگز نہیں ہے۔

بلکہ اسلام کا نظام حکمرانی "شرعی دلیل" کی آمریت ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے

کہ یہ "وحی" کا نظام حکمرانی ہے، جو کہ سراسر آمرانہ نظام ہے جس حکم کے متعلق وحی نازل ہوئی پوری انسانیت کے مدبرین حکماء اور عقلاء کی گردنیں تو کیا انبیاء کی گردنیں بھی اس کے لئے خم ہو گئیں، بلکہ ذہن و سمجھ کو بھی وہ حکم قبول کرنا پڑا خواہ وہ حکم عبادات کے متعلق ہو یا اقتصادیات اور معاشیات سے وابستہ ہو یا حاکم و محکوم اور ربط و ملت وغیرہ سے متعلق ہو۔

فلا وربك لا يومنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا فى انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما○

(النساء آیت: ٦٥)

"پس تیرے رب کی قسم ہے، کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہوں گے تا وقتیکہ اپنے معاملات اور اختلافات میں تجھے فیصلہ اور حکم کرنے والا تسلیم نہ کرلیں پھر تیرے حکم اور فیصلہ پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور خوشی سے قبول کریں"۔

وما ينطق عن الهوى. ان هو الا وحى يوحى○

(النجم۔ آیت: ۳)

"اور وہ (پیغمبر) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا وہ تو ہر حکم اس وحی سے کرتا ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے"۔

؎ مصطفیٰ ہر گز نہ گفتی تا نہ گفتی جبرئیل
جبرئیلش ہم نہ گفتی تا نہ گفتی کردگار

وما كان لمومن ولا مومنة اذا قضى الله ورسوله امرا ان يكون لهم الخيرة من امرهم ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا مبينا○ (الاحزاب۔ آیت: ٣٦)

"کسی مومن مرد یا عورت کے لئے گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کا

رسول کسی کام کا حکم دے تو انہیں اپنے کام میں (مزید کوئی) اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی (یعنی خود مختاری) کی تو وہ صریح گمراہ ہوا"۔

تشریح : کیا ان جیسی بے شمار قطعی نصوص کے بعد یہ بات کہنے کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے، کہ اسلام کا نظامِ حکمرانی شورائی ہے۔ یعنی انسانوں کے مشورے سے قوانین بنتے اور ٹوٹتے ہیں؟

سوال نمبر ۲

اسلام میں حریت اور آزادی ہے اور جمہوریت میں بھی یہی ہے۔

اسلام حریت اور آزادی کا علمبردار ہے، اور اس نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا بلکہ انسان کو سرمایہ داروں، نوابوں، سرداروں، فوجی آمروں اور مذہبی اجارہ داروں سے نجات دلائی ہے۔

جب کہ جمہوریت کا بنیادی فلسفہ بھی حریت عامہ، عمومی آزادی ہے لہذا دین اسلام اور دین جمہوریت ایک فلسفے کے دو نام ہوئے۔

جواب :

اس میں شک نہیں کہ دونوں ادیان میں الفاظ کی حدود کے اندر مطلوبہ حریت اور آزادی تو ایک جیسی چیز ہے۔ بلکہ اس لفظی مشابہت اور بعض شواہد اور آثار کو یار لوگوں نے اسلام اور جمہوریت کی یگانگت کے لئے ایک حقیقی سند سمجھ لیا ہے۔

مثلاً وہ اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے عمر فاروق ﷛ کا وہ قول بطور استشہاد پیش کرتے ہیں۔ جو انہوں نے ایک موقعہ پر فرمایا "متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم أحرارا" تم نے کب سے انسانوں کو اپنا غلام سمجھ لیا ہے، جب کہ ان کی ماؤں نے

انہیں آزاد جنا ہے"۔

لیکن یاد رہے کہ مذکورہ لفظ "حریت" کی لفظی وحدت کے باوجود اسلام کی حریت (آزادی) اور جمہوریت کی حریت کے معنوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، بالکل ویسا ہی جیسے فارسی کے لفظ "شیر" و "شیر" میں ہے۔ علامہ رومیؒ فرماتے ہیں۔

کار پاکان را قیاس خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

دین اسلام انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلاتا اور اسے "عبداللہ" اللہ کا غلام بناتا ہے۔

اور دین جمہوریت انسان کو اللہ تعالیٰ کی غلامی اور حاکمیت سے نجات دلا کر اسے عوام کی خواہشات اور حاکمیت کا غلام بناتا ہے۔

سوال نمبر ۳

اگر اسلام کا نظامِ حکمرانی شورائی نہیں تو اسلام میں شورائیت کا مفہوم کیا ہو گا؟

جواب :

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کا نظام حکمرانی "شرعی دلیل" کی آمریت ہے اور جن مسائل کے متعلق واضح دلیل موجود نہ ہو، ان میں شوریٰ کا اجلاس دلیل حقہ کی دریافت اور جستجو کے لئے منعقد کیا جاتا ہے۔ لہٰذا شوریٰ کی حیثیت ثانوی اور ایک وسیلہ کی سی ہے۔ باقی رہی شرعی دلیل کی نوعیت، اقسام اور طریقہ جستجو و استنباط تو اس کی مکمل تفصیل اصول فقہ اسلامی میں دیکھی جا سکتی ہے یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

سوال نمبر ۴

اگر جمہوریت شجر ممنوعہ ہوتا تو ہندوستان کے چوٹی کے علماء حق ہندوستان میں سیکولر جمہوریت کی حمایت کیوں کرتے۔ حالانکہ وہاں کے علماء اس کی حمایت کرتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ جمہوریت یا سیکولرازم اسلام کے منافی نہیں ہے۔

جواب:

ایک احمق کا قصہ مشہور ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ بڑا احمق تھا، لیکن وہ اپنے سے زیادہ احمق لوگوں کی بستی میں رہنے کے باعث بڑا عاقل سمجھا جاتا تھا۔ ایک دن گاؤں کا ایک نوجوان کھجور کے درخت پر چڑھا لیکن وہ نیچے اترتے ہوئے گھبراتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اتر نہیں سکتا تھا۔ آخر کار لوگوں نے چارہ جوئی کے لئے اس مرد عاقل کی طرف رجوع کیا۔ اس نے حکم دیا کہ ایک مضبوط رسے کا ایک سرا کھجور پر پھینک دیا جائے اور وہ نوجوان اس کو اپنی کمر کے گرد مضبوطی سے باندھ لے۔ چنانچہ اس نوجوان نے ایسا ہی کیا۔ اب عاقل نے نیچے کھڑے دو تین نوجوانوں کو حکم دیا کہ رسے کا دوسرا سرا پکڑ کر پوری قوت سے کھینچو۔ جیسے ہی کھجور میں پھنسے ہوئے نوجوان کو کھینچا گیا۔ وہ کھجور سے اکھڑا اور دھڑام سے زمین پر آگرا اور مر گیا۔ اب وہ مرد عاقل بولا۔

تقدیر ہرگز نہیں ٹل سکتی ورنہ میں نے اسے سلامتی کے ساتھ نیچے اتارنے کا آزمودہ طریقہ بتایا تھا۔ کیونکہ میں نے بذات خود ایسی ہی رسی سے انتہائی گہرے کنوؤں سے کئی آدمی صحیح سلامت باہر نکالے ہیں۔

داد دیجئے اس احمق کے قیاس اور اجتہاد کی۔ یہی کیفیت ہے سائل کے قیاس کی کیونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے، اگر مذہبی حکومت بنتی تو مسلمان چونکہ اقلیت میں تھے ہندوؤں کی بنتی، لہٰذا ایسی حکومت اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے لئے بہت

نقصان دہ ہوتی اور سیکولر جمہوریت یا لادینی حکومت مسلمانوں کے مفاد میں تھی۔ اس لئے علماء کے لئے ضروری تھا کہ وہ سیکولرازم اور جمہوریت کی حمایت کرتے۔

مگر پاکستان میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ملک اسلامی نظریے لا الہ الا اللہ کے نام پر بنا ہے۔ اب یہاں اسلامی نظام کی جگہ سیکولرازم یا جمہوریت (عوام کی حاکمیت) کی حمایت کرنا اللہ کی حاکمیت میں انسانوں کو شریک بنانا نہیں تو اور کیا ہے؟

سوال نمبر ۵

کہا جاتا ہے کہ اسلام میں بھی مساوات اور برابری کی تعلیم ہے، اور جمہوریت بھی دین مساوات ہے اس لئے دونوں نظام درحقیقت ایک جیسی تعلیمات اور ایک جیسے فلسفے کے علمبردار ہیں۔

جواب :

دین جمہوریت میں اگر کوئی حقیقی کمال ہے تو وہ صرف اتنا، کہ لوگوں کو الو بنانے کے لئے اس کے موجدوں نے اس میں بلا کی افیون اور سحر انگیزی بھر دی ہے۔ کہیں مزدوروں، محنت کشوں اور مفلسوں کے سامنے بانسری بجادی کہ تمہیں ملوں، کارخانوں اور خزانوں کا مالک بنا دیا جائے گا اور کہیں حروف ابجد سے ناواقف عوام کو یقین دلایا کہ تمہیں حاکم بنا دیا جائے گا بس اتنی سی بات پر یہ لوگ عقل و دماغ کھو بیٹھتے ہیں، اور اس خیالی سبز باغ کو حقیقت سمجھ کر بیچارے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

اسی طرح مذہبی لوگوں نے کہہ دیا کہ دین اسلام مساوات اور برابری کا وہ واحد دین ہے جس نے محمود و ایاز کو ایک صف میں لا کھڑا کیا بس اتنی سی بات سے سادہ لوح مسلمان اس حد تک مسمرائزڈ ہو جاتے ہیں، کہ وہ ان الفاظ کے ضمن میں پوشیدہ مقاصد و کفریات اور عواقب و مضمرات کا تجزیہ کئے بغیر اس بات کی فخریہ انداز میں دعوت شروع کر دیتے ہیں کہ

حقیقی مساوات اور برابری کا اگر کوئی دین ہے تو صرف اسلام ہی ہے۔ اس موقع پر امیر المومنین عمر فاروقؓ کے سفر بیت المقدس میں اپنے نوکر کے ساتھ سواری پر باری باری سفر کرنے کی مثال بھی دیتے ہیں تاکہ ان کا دعویٰ مزید نکھر جائے۔ مگر اس دعوے کے نتیجے میں یہ سادہ لوح مسلمان خود کو اور دوسرے مسلمانوں کو دین جمہوریت کی کفریات کے جس فولادی جال میں جکڑ دیتے ہیں، اس سے نکلنے کے لئے اس بات کے بغیر اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ دین اسلام میں قطع و برید، تحریف اور تاویل کی جائے۔ مثلاً ایک مرتبہ جب آپ نے دین جمہوریت کی مساوات اور برابری کا اصول تسلیم کیا تو آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ۔

(الف) اسلام میں بھی مرد کی طرح عورت کی سربراہی جائز ہے۔

(ب) ہر جگہ ایک عورت کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہوگی۔

(ج) میراث میں بھی مرد اور عورت کا حصہ برابر ہے۔

(د) جیسا کہ مرد کے لئے چار بیویاں جائز ہیں عورت کے لئے بھی بیک وقت چار شوہروں کو جائز ماننا پڑے گا یا یوں کہئے کہ جب بیوی کے لئے بیک وقت دو شوہر رکھنا جائز نہیں تو مرد کے لئے بھی جائز نہیں کہ وہ بیک وقت دو بیویاں رکھے۔

(ہ) بغیر حجاب کے آزادانہ گھومنا پھرنا اور روزگار کے جملہ مواقع میں بنیادی حقوق اور مساوات کا اصول تسلیم کرنا ہوگا۔

(وعسٰی ان تحبوا شیئا وھو شر لکم)

آج یہ سادہ لوح مسلمان جمہوریت کے مفسدات کی دلدل میں پھنسے ہوئے جو ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، تو یہ سب کچھ ان کے خود اختیار کردہ بھولپن کے نتائج ہیں، کہ اسلام مساوات اور برابری کا دین ہے۔ حالانکہ حقیقی مساوات (بمعنیٰ جمہوریت کی مساوات) از روئے اسلام ناجائز اور از روئے عقل ناممکن ہے۔

دین جمہوریت والی مساوات کے لئے، عقل اور نقل میں کوئی گنجائش نہیں

جمہوریت کی مساوات کا مختصر خلاصہ یہ ہے، کہ انسانی افراد کے حقوق، مراعات، ذمہ داریاں اور فرائض، قدر و قیمت برابر ہے۔ لہٰذا مرد اور عورت، عالم وجاہل، عاقل وبے عقل، ہنر مند وبے ہنر، دیانت دار اور بددیانت، متضاد صفات کے مالک افراد جمہوریت کی مساوات کے ترازو میں ایک جیسی قدر و قیمت، حقوق اور ذمہ داریوں کے مستحق ہیں۔

حالانکہ عقل سلیم، شریعت، مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہے، کہ ایسی ہمہ گیر مساوات ناممکن ہے۔ بلکہ آج کل جدید سائنس اس کی گواہی دے چکی ہے کہ مرد اور عورت کے ظاہری اعضاء اور باطنی قوی اور فطری استعداد میں واضح تفاوت موجود ہے، جیسے کہ آپ پچھلے صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

دین اسلام میں مساوات نام ہے موزونیت اور تعدیل کا

واضح رہے کہ مساوات عربی لفظ ہے جس کا مادہ س، و، اور ی، ہے جس سے مختلف صیغے اور شکلیں بن سکتی ہیں۔ مثلاً "سوی" "تسویہ" "مساوات وغیرہ۔

الذی خلق فسوی ○ (پارہ ۳۰، اعلیٰ، آیت: ۲)

"اللہ وہ ذات ہے جس نے تمام کائنات پیدا کی ہے اور پھر ان میں مساوات اور برابری قائم کی"۔

فسواھن سبع سماوات ○ (پارہ، البقرہ، آیت: ۲۹)

"پھر سات آسمانوں کا تسویہ اور برابری کردی"۔

رفع سمکها فسواها ○ (النازعات، آیت: ۲۸)

"آسمان کی چھت بلند کی پھر اس میں مساوات قائم کی"۔

بلی قادرین علی ان نسوی بنانه ○ (پارہ، القیامہ۔ آیت: ۴)

"ہاں ہم تو اس پر قادر ہیں کہ انسان کی انگلیوں کے پور پور میں مساوات وبرابری قائم کریں"۔

الذی خلقك فسواك فعدلك ○ (پارہ ۳۰، انفطار، آیت: ۷)

"(اللہ) وہ ذات ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہارے ظاہری اور باطنی اعضاء میں مساوات اور تعدیل و تناسب قائم کی"۔

تشریح: مشاہدہ گواہ ہے کہ مذکوہ آیات قرآنی میں کائنات کے اندر مساوات اور برابری کا مطلب ہرگز وہ مساوات نہیں ہے، جس مساوات کا دعویٰ دین جمہوریت کر رہی ہے۔

دیکھئے قرآن کہتا ہے کہ میں نے آسمانی کائنات کے اندر مساوات قائم کی ہے۔ مگر آفتاب اور مہتاب دونوں کے جسم، ذات، صفات، افعال اور تاثیرات میں، جمہوریت والی مساوات کا ذرہ بھر وجود نہیں، مگر قرآنی مساوات ان تمام کائنات میں سو فیصد موجود ہے۔ نیز انسان کی انگلیوں کے اندر یا دیگر اعضاء کے اندر مروّجہ جمہوری مساوات قطعاً نہیں ہے۔ مگر قرآنی مساوات ان میں یقیناً موجود ہے۔

امام لغت القرآن علامہ راغب فرماتے ہیں۔

المساوات المعادلة. (المفردات صفحہ ۲۵۱)

"چیزوں کے اندر مساوات کا مفہوم ہے کہ ان کے اندر عدل ہو"۔

قوله (فسواك) ای جعل خلقك علی ما اقتضت الحکمة.

(المفردات صفحہ ۲۵۲)

"جسم انسانی کے اعضاء کے اندر مساوات سے مراد ہے عدل یعنی ہر ایک عضو ایسا

بنایا جو کہ حکمت، دانائی اور مقتضائے حال کے عین مطابق ہو"۔

العدالة والمعادلة يقتضي معنى المساوات. (المفردات صفحہ ۳۲۷)

قرآنی اصطلاح میں عدالت، تعدیل اور مساوات کا مفہوم تقریباً ایک جیسا ہے۔

علامہ آگے لکھتے ہیں۔

فالعدل هو التقسيط على سواء وعلى هذا روى بالعدل قامت السموات والارض تنبيهاً انه لو كان ركن من الاركان الاربعة فى العالم زائدا على الآخر اوناقصا عنه على مقتضى الحكمة لم يكن العالم منتظما. (المفردات صفحہ ۳۲۷)

"عدل کا مفہوم ہے مقتضائے حکمت کے مطابق برابری۔ اور یہی معنی ہے اس روایت کا جس میں کہا گیا ہے کہ آسمان وزمین کا نظام عدل کے بل بوتے پر قائم ہے۔ یعنی کائنات کے اندر عدل ومساوات ہے۔ اگر کائنات کے عناصر میں مقتضائے حکمت کے تناسب سے ایک دوسرے پر کمی اور بیشی واقع ہو جائے تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا"۔

پس خلاصہ یہ کہ ازروئے شریعت عدل اور مساوات کا صحیح اور حقیقی مفہوم یہ ہے جس کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

(اعطاء كل ذى حق حقه) ہر حق دار کو اس کا حق دینا قرآن کریم نے اسی عدل ومساوات کو دوسرے الفاظ میں موزونیت کا نام دیا ہے۔

والسمآء رفعها ووضع الميزان ۝ (الرحمٰن۔ آیت: ۷)

"اور اس نے آسمان بلند کیا اور (اجرام سماوی کے لئے) میزان بنایا"۔

وانبتنا فيها من كل شىء موزون ۝ (الحجر، آیت: ۱۹)

"اور ہم نے زمین میں ہر ایک چیز موزونیت اور تناسب رکھنے والی اگائی"۔

ان آیات کی تفسیر میں امام الہند ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

"یہ "المیزان" یعنی ترازو کیا ہے؟ تعادل وتوازن کا قانون ہے جو تمام اجرام سماویہ کو

ان کی مقررہ جگہ میں تھامے ہوئے ہے، اور کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے توازن کا پلہ کسی ایک طرف کو جھک پڑے"۔ (ترجمان القرآن۔ جلد ۱، صفحہ ۱۲۰)

اسی طرح علامہ راغب اصفہانی تحریر فرماتے ہیں:

ذالك اشارة الى كل ما او جده الله تعالى انه خلقه باعتدال.

(المفردات مادہ (وزن) صفحہ ۵۴۳)

"اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اللہ نے جو کچھ پیدا فرمایا ہے وہ اعتدال اور موزونیت کے ساتھ پیدا فرمایا ہے"۔

امام الہند ابوالکلام آزادؒ "عدل" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ایک جزء کا دوسرے سے کمیت یا کیفیت میں مناسب و موزوں ہونا عدالت ہے۔

اب غور کریں کہ کارخانہ ہستی میں بناوٹ اور خوبی کے جس قدر مظاہر ہیں، کس طرح اس حقیقت سے ظہور میں آئے ہیں۔ وجود کیا ہے؟ عناصر کی ترکیب کا اعتدال ہے اگر اس اعتدالی حالت میں ذرا بھی خلاء واقع ہو جائے تو وجود کی نمود معدوم ہو جائے الخ۔

(ترجمان القرآن جلد ۱، صفحہ ۱۱۹)

قانون تزویج و تقابل

من كل شيء خلقنا زوجين ○ (الذاریات، آیت: ۴۹)

"اور ہر چیز میں ہم نے جوڑے پیدا کر دیئے (یعنی دو دو اور متقابل اشیاء پیدا کیں)"۔

خلق الازواج كلها مما تنبت الارض ومن انفسهم ومما لا يعلمون ○ (یٰس، آیت: ۳۶)

"اس نے زمین کی پیداوار میں اور انسانوں میں اور ان تمام مخلوقات میں

جن کا علم انسان کو نہیں دو دو اور متقابل چیزیں پیدا کیں"۔

کائنات کا کوئی بھی گوشہ دیکھ لیں کوئی چیز جفت اور طاق کے بغیر نظر نہیں آئے گی بلکہ ہر چیز اپنا کوئی نہ کوئی ثانی ضرور رکھتی ہے۔ مثلاً آسمان کے لئے زمین، رات کے لئے دن، صبح کے لئے شام، غم کے لئے سرور، سورج کے لئے چاند، زندگی کے لئے موت، مرد کے لئے عورت وغیرہ۔ ان میں مساوات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان کے بیشتر اجزاء اور خاصیتوں میں تضاد ہے۔ لیکن باوجود اس تضاد کے ہر جوڑے میں اس حد تک موزونیت، مناسبت اور تعدیل ہے، کہ ہر ایک کا وجود، بقا اور پہچان دوسرے کی مرہون منت ہے۔

انسان کو دو مختلف جنسوں یعنی مرد اور عورت میں تقسیم کر دیا گیا ہے، اور پھر ان میں فعل وانفعال، جذب، وانجذاب، تاثر وتاثیر اور درشتی وملائمت کی ایسی مناسب اور موزوں تقسیم کر دی کہ ہر ایک دوسرے کے سوال کا صحیح جواب ہے، اور ہر ایک میں دوسرے کے تقاضے اور احتیاج کا موزوں ترین مداوئی بدرجہ اتم موجود ہے۔

(فسبحان اللہ احسن الخالقین)

اسی موزونیت کو قرآن تسویہ، تقدیر، اتقان، تعدیل اور مساوات جیسی اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

الذی خلق فسوی ۝ والذی قدر فھدی ۝ (الاعلیٰ، آیت: ۲)

"وہ اللہ جس نے ہر چیز پیدا کی پھر اسے مناسبت اور موزونیت سے درست کیا اور وہ جس نے ہر چیز کے لئے اندازہ ٹھہرایا پھر اسے ہدایت دی"۔

الذی خلقك فسواك فعدلك ۝ (الانفطار، آیت: ۷)

"وہ اللہ جس نے تجھے پیدا کیا اور پھر تیرے بدن میں تسویہ اور اعتدال ملحوظ رکھا"۔

صنع اللہ الذی اتقن کل شیء ۝ (القصص، آیت: ۸۸)

"یہ اس اللہ کی کاریگری ہے، جس نے ہر چیز توازن، تعادل، درستگی اور استحکام کے ساتھ بنائی"۔

ما تری فی خلق الرحمان من تفاوت ۝ (الملک۔ آیت: ۳)

"تم رحمان کی بناوٹ میں فرق اور بے ڈھنگی نہیں پاؤ گے"۔

تشریح: ان آیات پر نظر ڈالئے اور پھر کائنات کی ایک ایک جنس، ایک ایک نوع اور ایک ایک فرد کا مشاہدہ کیجئے۔ سورج اور چاند جیسے عظیم اجرام سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے ذرے (ایٹم) کا جگر چیر ڈالئے ہر جگہ اختلاف، تنوع اور رنگینی ہے دو چیزوں کی شکل وصورت، رنگ وبو، کمال وجمال، خواص وکارکردگی حرکات وسکنات حتیٰ کہ ان کے جوہری اجزاء (الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران) تک میں تفاوت اور تنوع ہے، مگر قرآن کہتا ہے کہ تم اس کائنات میں کوئی تفاوت نہیں پاؤ گے بلکہ ان میں مساوات ہے۔

فسواھن سبع سماوات ۝ (البقرہ، آیت: ۲۹)

"پھر اللہ نے "کائنات کے مادے دخان سے" سات آسمانوں کو بنایا مساوات وتوازن کے ساتھ"۔

ظاہر بات ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں مساوات اور عدم تفاوت سے مراد توازن، تعادل اور تناسب ہی ہے۔

سورج اور کرۂ زمین کے فرق کو دیکھئے کہ سورج حجم میں زمین سے تیرا لاکھ گنا بڑا ہے، مگر قدرت نے ان کے درمیان فاصلہ، حدرفتار، کشش ثقل اور موزونیت کی ایک ایسی مساوات قائم کردی ہے، جس میں سر مو تفاوت اور کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ یہ ہے دین اسلام کی مساوات کی حقیقت۔ اور وہ ہے دین جمہوریت کی مساوات کہ جس نے مرد کو عورت اور عورت کو مرد بنا کر رکھ دیا ہے۔ (فاعتبروا یا اولی الابصار)

سوال نمبر ۶

صدیوں سے کرۂ ارض پر دین جمہوریت کی مدح سرائی اور توصیف وتعریف کے گن گائے جارہے ہیں، جس پر آج تک کسی نے اعلانیہ تنقید نہیں کی۔ یہ اصل میں جمہوریت کے جواز پر ایک "اجماع سکوتی" ہے۔ لہٰذا آج جمہوریت پر اعتراض کرنا گویا اجماع امت کی مخالفت کرنا ہے۔

جواب :

اولاً تو اجماع سکوتی کا دعویٰ خاص کر مسلمان ممالک کے اعتبار سے بے بنیاد ہے، مثال کے طور پر پاکستان کے علماء کو لیجئے کیا وہ سب مروجہ جمہوریت پر متفق ہیں؟ یا متفق ہو سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں۔

جب کہ جمہوریت نام ہی عوام کی حاکمیت، اکثریت کی شارعیت، اور اباحت مطلقہ کا ہے، جس میں طاقت کا سرچشمہ اور اقتدار اعلیٰ عوام ہوتے ہیں۔ اور حق کا معیار اکثریت ہے، تو بھلا اس کے جواز پر علماء اسلام کیسے متفق ہو سکتے ہیں؟

ثانیاً اگر اس دعویٰ اجماع کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ اجماع لاکھوں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور تمام ادیان سماوی اور وحی منزل من اللہ اور نصوص قطعیہ کے قولی اور عملی اجماع کے خلاف ہے۔ لہٰذا مسلمان کے لئے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

نیز پچھلے صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں، کہ جمہوریت کو یورپ کے کئی نامور، دانشوروں، اسکالروں، مفکرین اور خود بانیان جمہوریت نے بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔

سوال نمبر ۷

از روئے اسلام تعامل یعنی لوگوں کا ایک جاری و ساری عمل کسی چیز کے جواز کے

لئے ایک شرعی دلیل ہے، چونکہ آج کل بین الاقوامی طور پر بشمول ممالک اسلامیہ سب جمہوریت کو اپنا چکے ہیں یا اپنانے کی تیاری میں ہیں، تو کیا یہ تعامل جمہوریت کے جواز کی دلیل نہیں؟

جواب :

نصوص محکمہ اور قطعیہ کے خلاف تعامل، اور رسم و رواج کو قرآن، طاغوتیت، شرک اور فسق و فجور ٹھہراتا ہے چہ جائے کہ وہ ایک شرعی دلیل بنے۔

اگر مذکورہ تعامل کو جواز کی سند کا درجہ دے دیا جائے پھر تو سودی نظام بینکاری، رشوت ستانی، جھوٹ، پروپیگنڈہ، شراب اور قضاء وفیصلہ "بغیر ما انزل اللہ" بطریق اولیٰ جائز ہونگے۔

سوال نمبر ۸

یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلی نصف صدی سے خالص مذہبی جماعتیں جیسے جمعیت العلماء اسلام، جمعیت العلماء پاکستان، جماعت اسلامی اور جمعیت اہل حدیث وغیرہ مروّجہ جمہوری عمل میں برابر حصہ لے رہی ہیں، اور یہ مذہبی جماعتیں پاکستان کے جمہوری عمل کا باقاعدہ ایک حصہ ہیں، اگر جمہوریت ایک غیر اسلامی نظام ہوتا تو یہ جماعتیں کیونکر اس میں حصہ لیتیں۔

جواب :

یہ بات درست ہے کہ ان مذہبی جماعتوں کے مذکورہ عمل سے دلالتاً جمہوریت کے جواز کا ثبوت ملتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ جمعیت العلماء اسلام کے قائد، پاکستان قومی اتحاد کے سابق صدر، صوبہ سرحد کے سابق وزیر اعلیٰ اور عصر حاضر کے مفتی اعظم اور شیخ الحدیث جناب مفتی محمود صاحبؒ نے مروّجہ جمہوریت کے غیر اسلامی ہونے اور اس کے عدم جواز کا

صراحتاً بانگ دہل اعلان فرمایا ہے۔

قومی اسمبلی میں مفتی محمودؒ کا اعلان ابراہیمی

۷ اپریل ۱۹۷۲ء کو مفتی محمود صاحب رحمہ اللہ نے قومی اسمبلی میں جو تقریر فرمائی اس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

بنیادی حقوق کے نام پر ارتداد کی چھٹی :

”یہ بھی کہا گیا ہے، کہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بن سکے گا۔ یہ بات بھی میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک دھوکہ ہے، اس لئے کہ بنیادی حقوق کی دفعات اس کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً ان دفعات میں مذہبی آزادی کے عنوان میں وضاحت سے کہا گیا ہے، کہ پاکستان کے ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے، کہ وہ جو مذہب اور عقیدہ چاہے قبول کر سکتا ہے۔ اس میں گویا مسلمان کو عیسائی، یہودی، ہندو اور مرزائی بننے کا حق دیا گیا ہے۔ اور مرتد ہونے کی اجازت دی گئی ہے، مگر اسلامی قانون کہتا ہے ”من بدل دینہ فاقتلوہ“ (جس مسلمان نے اپنا دین تبدیل کیا یعنی مرتد ہوا اسے قتل کر دو) اسلامی قانون کے تحت اگر اس ہاؤس میں ہم قانون سازی کا کام شروع کریں تو ایسے شخص کے لئے قتل مرتد کی سزا تجویز کریں گے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادًا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف۔**

اسی طرح حدیث میں ہے: ”من بدل دینہ فاقتلوہ“ جس نے اپنا دین بدل دیا اسے قتل کر دو۔

قرآن و سنت کی اس تصریح کے باوجود اب ہم اس کے لئے یہ سزا تجویز نہیں کر سکتے اس لئے کہ آپ نے آزادی مذہب کے نام سے اسے آئین میں اس چیز کا حق دے دیا ہے۔

اور مسلمان کے لئے سب سے عظیم جرم ارتداد ہے زنا، شراب خوری، سود خوری اور ڈاکہ زنی کا جرم اس سے کم ہے، جب بڑے سے بڑے جرم پر سزا نہیں ہو سکتی تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ آئین کسی طرح اسلامی نہیں کہلا سکتا"۔ (آذان سحر۔ صفحہ ۱۰۷)

۱۴؍ جون ۱۹۷۲ء کو لاہور میں منعقدہ ختم نبوت کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مفتی محمودؒ نے مروّجہ جمہوریت کی وضاحت یوں کی۔

"یورپ کی جمہوریت میں حاکم اعلیٰ عوام ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ حاکم اعلیٰ صرف اللہ ہے۔ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ حاکم اللہ کے سوا عوام ہیں تو اس نے اللہ کی ذات میں شریک کیا، اور اللہ کا شریک غیر اللہ کو تسلیم کر لیا۔ اسلام میں اس جمہوریت کا کوئی جواز نہیں"۔

(آذان سحر، صفحہ ۱۱۹)

اسی تقریر میں مفتی صاحبؒ نے فرمایا۔

"جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ (برطانیہ کی) پارلیمنٹ نے (جو دانشوروں، تعلیم یافتہ اور قابل ترین لوگوں کی پارلیمنٹ ہے) طے کر لیا ہے، کہ اگر مرد، مرد کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے تو یہ جائز ہے اور یہ بھی طے کیا کہ مرد، مرد سے شادی بھی کر سکتا ہے"۔

(آذان سحر۔ صفحہ ۱۱۸)

مفتی صاحبؒ کے ان صریح اقوال سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ پاکستان کی مذہبی جماعتوں نے کبھی بھی جمہوریت کو تسلیم نہیں کیا اور ہر جگہ اس کی مخالفت ایک غیر اسلامی نظام کے طور پر کی۔

سوال نمبر ۹

جب مروّجہ جمہوریت غیر اسلامی اور غیر شرعی عمل ہے، تو پھر علماء اسلام اور مذہبی جماعتیں اس میں کیوں حصہ لے رہی ہیں؟

جواب :

سنہ ۱۹۷۱ء کے الیکشن کے دنوں میں مفتی محمودؒ ٹانک میں مولانا فتح خان صاحب کے مدرسہ میں تشریف فرماتھے اور میں آپؒ کے ساتھ ایک ہی چارپائی پر بیٹھا تھا کہ ایک تعلیم یافتہ، سنجیدہ شخص (شائد اخباری نمائندہ تھا) نے مفتی صاحب سے سوال کیا۔

کہ ''مفتی صاحب آپ جانتے ہیں کہ اسمبلی میں قوانین میں ترامیم ممبروں کی اکثریت کے بل بوتے پر کی جاسکتی ہیں، تو کیا آپ اس الیکشن میں اتنے علماء کامیاب کرا سکیں گے کہ وہاں آپ اسلامی قوانین بنا سکیں؟''

مفتی صاحب نے فرمایا ''نہیں''۔

تو سوال کرنے والا بولا ''تو پھر اس الیکشن میں حصہ لینے کا کیا فائدہ۔ جب کہ بظاہر اس انتخابی معرکہ نے خواتین، نوابوں، سرداروں اور سرمایہ داروں بلکہ عوام تک کے، علماء کرام اور اماموں کے ساتھ تعلقات اتنے تلخ اور کشیدہ بنادیے ہیں، کہ کئی علماء اور اماموں کو مساجد سے نکال دیا گیا ہے''۔

تو مفتی صاحب نے کہا ''ہم اتنے علماء کو اسمبلیوں کے اندر پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ جب اسمبلی کے اندر عوامی نمائندے اسلام کے خلاف تیز رفتاری سے قوانین بنانا چاہیں گے تو ہم ان کی سرعت رفتار کو بریک لگائیں گے تاکہ ان کی رفتار رک جائے یا کم ہو جائے اور اندر سے جب باہر آئیں گے تو ملک بھر میں مسلمان عوام کو ان کی گمراہی کے مقابلہ میں لا کھڑا کریں گے''۔

خلاصہ یہ کہ جب تک علماء کے پاس یہ قوت نہیں کہ مروّجہ غیر اسلامی جمہوری نظام بدل ڈالیں (اسمبلی اور پارلیمنٹ جہاں قوانین بنائے جاتے ہیں میں جانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے جمہوری الیکشن لڑنا۔) تو بہ امر مجبوری یہ عمل علماء کے لئے نہ صرف جائز ہوگا بلکہ شرعاً اور عقلاً ان پر فرض ہوگا کہ اسی گندے راستے سے یورپی جمہوریت کے بتکدوں

کے اندر جا گھسیں اور جمہوریت پرستوں کے نت نئے بنائے ہوئے بتوں پر مومنانہ ضربیں لگاتے رہیں۔

گویا کہ مغربی جمہوریت کی پارلیمنٹ بت خانہ نمرودی ہے، جہاں آذر بن کر بت تراشی کے لئے جانا سخت ترین گناہ ہوگا۔ اور ابراہیم علیہ السلام بن کر (صفت ابراہیمی اختیار کر کے) بت شکنی کے لئے اندر جانا عظیم عبادت ہوگی۔

(فللہ الحجۃ البالغہ)

سوال نمبر ۱۰

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ عوامی اور جمہوری حکمرانی سے انسانوں کی شخصی آمریت کے نتائج بدرجہا بدتر ہیں، تو کیا جمہوریت کی مخالفت آمریت کی حمایت نہ ہوئی؟ یہ تو گویا عوام کو ہمدردانہ رنگ میں بارش میں سے کھینچ کر پرنالے کے نیچے کھڑا کرنا ہوا۔

جواب :

یہی تو مسلمانوں کی نادانی اور بھولپن ہے، کہ وہ سمجھتے ہیں کہ نظام حکمرانی فقط دو ہی ہیں جمہوریت اور آمریت۔ ان دونوں کے درمیان تیسرے نظام حکمرانی کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ حالانکہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ کی حکمرانی کے مقابلہ میں انسان کی حکمرانی پر خواہ وہ جمہوریت ہو یا آمریت لعنت بھیجے۔ اور حقیقی اسلامی اور خالص شرعی نظامِ حکمرانی کی حمایت کرے اور اسی کی دعوت چلاتا رہے۔

سوال نمبر ۱۱

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ اسلامی نظام حکمرانی جیسا بہترین نظام تو یقیناً کوئی اور نہیں لیکن اس پندرھویں صدی میں اسلام کا نظام نافذ کرنا ممکن نہیں

خاص کر موجودہ سائنسی اور ٹیکنالوجی کے تیز ترین ترقی کے دور میں۔ اس لئے یہی جمہوریت بہتر ہے۔

جواب :

یہ درست ہے کہ آج کل بہت سے سادہ لوح اور صحیح العقیدہ مسلمان بھی اس خلجان اور اندیشے میں مبتلا ہیں۔ مگر اس اندیشے کی حقیقت بجز اس کے کچھ بھی نہیں کہ مسلمان آج جمہوریت پرستوں کی بھرپور پروپیگنڈہ مہم سے مرعوب ہو کر احساس کمتری میں مبتلا ہیں جس کے صرف دو ہی اسباب ہیں۔

سببِ اوّل :

موجودہ دور میں نظام اسلام اس لئے قابل عمل نہیں کہ اس کا قانونی ڈھانچہ سخت ہے، تنگ ہے اور غیر توسیع مزاج ہے، جس کے سبب آج کل معاشرہ اس میں ڈھل نہیں سکتا۔

سببِ دوم :

چونکہ اسلامی نظام ترقی اور عروج کے منافی ہے، اس لئے اس پندرھویں صدی میں یہ ناقابل عمل ہے۔

مگر یہ دونوں اسباب بے بنیاد، نامعقول اور شیطانی وسوسہ ہیں۔

سببِ اوّل کو لیجئے :

قرآن کریم کے زمانہ نزول پر ایک نظر ڈالئے کہ انسانیت، جہالت، حماقت اور بے تہذیبی کے تاریک ترین اندھیروں میں بھٹک رہی تھی۔ قبائلی عصبیت اور قوم پرستی اس عروج پر تھی کہ ایک دوسرے کی مردہ کھوپڑیوں میں شراب پینا اور انسان کے چمڑے سے جوتے بنانا باعث فخر و تسکین تھا۔ بے رحمی اس حد تک کہ لوگ اپنی بچیوں کو زندہ در گور کر دیتے تھے۔ بے حیائی اس حد تک کہ خانہ خدا کے گرد مرد اور عورتیں ننگا ہو کر طواف

کرتے۔ غرض کونسی حیوانی خواہش تھی جسے وہ پورا نہیں کرتے تھے۔ پیدائش سے لیکر موت تک اسی ماحول میں پھلے پھولے۔ اگر اس معاشرے میں اسلامی نظام قابل عمل ہو سکتا تھا اور وہ معاشرہ اسلامی نظام میں ڈھل سکتا تھا۔ تو کونسی وجہ ہے، کہ آج اس پندرھویں صدی کا تعلیم یافتہ مہذب معاشرہ جو نہ صرف نظام اسلام سے محبت وانس رکھتا ہے۔ بلکہ اس کی حقانیت اور افادیت پر مکمل ایمان ویقین بھی رکھتا ہے، باوجود اس قرب و تعلق کے یہ معاشرہ نظام اسلام میں نہیں ڈھل سکتا؟ یا اس معاشرے کے لئے نظام اسلام کیوں ناقابل عمل ہے؟ یہ منطق ناقابل فہم ہے۔

؎ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

رہی یہ بات کہ اسلامی نظام اور قوانین محدود اور تنگ ہیں، ان میں اتنی وسعت نہیں کہ انسانیت کے موجودہ مسائل اپنے دامن میں سمیٹ کر حل کرے۔ ایسی سوچ کی اساس یقیناً اللہ تعالیٰ کی ذات اور دین اسلام کی تعلیمات سے کلی طور پر ناواقفیت ہی ہے، حالانکہ جس طرح اللہ کی ذات لامحدود ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات اور تخلیقات وسیع تر اور بحر بیکراں ہیں۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں حیوانات، نباتات، جمادات، علوی اور سفلی کائنات کی بھرمار دیکھئے جن کی مقدار، تعداد اور صفات کے شمار وحساب سے پوری انسانیت عاجز ہے۔ نیز سورج، زمین، پانی، ہوا اور انسان جیسی تخلیقات الٰہی کو دیکھئے نہ صرف یہ کہ ہر دور اور ہر زمانہ کے حالات ان کے لئے سو فیصد موزوں ہیں، بلکہ انسانوں کی نت نئی ضروریات کے لئے یہ خود کفیل بھی ہیں۔ تخلیقات الٰہی جتنا قدیم تر ہوتی جائیں گی اتنا ان کے سربستہ فوائد کھلتے جائیں گے۔

یہ ارتقائی عمل برابر جاری رہے گا، تاآنکہ قیامت کے قریب جب اللہ تعالیٰ کی ان تخلیقات میں سے جملہ سربستہ منافع اور فوائد کے خزانے اُبل کر ظاہر ہوں گے تو اس وقت کا انسان بے ساختہ پکار اٹھے گا کہ "یا خلاق" انسان کتنا تیری ان تخلیقات کو دیکھتا رہا مگر تیرے

جود و فیض کے ان لامتناہی خزانوں سے جاہل اور تہی دامن رہا اور آج ہم ان سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

اس ارتقائی عمل کی صداقت سے تو کوئی فاتر العقل شخص ہی انکار کر سکتا ہے۔ اب دوبارہ ذرا تخلیقات الٰہی کی ابتدا کی طرف لوٹئے۔

ہر ایک نوع کی ابتدا اللہ تعالیٰ نے ایک حقیقی بنی ذرّے (خلیے) (CELL) سے کی ہے، جو کہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھی۔

"هل اتی علی الانسان حین من الدهر لم یکن شیئا مذکورا"۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

انصاف چیخ چیخ کر پکار اٹھتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیقات، تنگی اور زمان و مکان کی محدودیت سے مبرا ہیں۔

اب اصل بات کی طرف آیئے جب قرآن کریم و سنت پر مبنی نظامِ اسلام اللہ تعالیٰ کی ایجاد اور تخلیق ہے، تو اس میں تنگی اور عدم وسعت یا کسی زمان اور مکان کے ساتھ موافق نہ ہونے کے اندیشے اور خلجان کی کوئی حقیقت نہیں، بجز شیطان یا شیطان کے بھائیوں کے وسوسہ کے۔

سبب دوم :

یہ بات صریح مغالطہ اور مغربی پروپیگنڈے کا اثر ہے کہ نظامِ اسلام موجودہ ترقی کے منافی ہے۔ ہم اس کو تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔

انسانیت اور اس کی ترقی

انسان کی مشہور و معروف تعریف "حیوان ناطق" سے کی جاتی ہے، جس سے واضح

ہوتا ہے کہ حضرت انسان دو متضاد قوتوں کا مرکب ہے۔ ایک قوت ناطقہ جس کو مختلف عنوانات اور ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً قوت روحانی، قوت خیر، قوت ملکی، قوت مدرکہ، قوت عاقلہ، قوت ذہنی اور قوت علوی وغیرہ۔

اور دوسری قوت، قوت حیوانی ہے۔ جیسے قوت بہیمی، قوت مادی، قوت شیطانی، قوت شر، قوت سفلی، قوت سبعی اور قوت خواہشات جیسے القاب دیئے جاسکتے ہیں۔

ان دونوں قوتوں کو ہم اختصار کے طور پر "قوت خیر" اور "قوت شر" کہہ سکتے ہیں۔

یہ دونوں قوتیں بذات خود قدرت کے فلسفہ "تزویج" (دو، دو ہونے) کے تحت آپس میں متقابل اور متضاد ہیں۔ اس لئے اپنی آزادانہ فطرت کے اعتبار سے ہر ایک کی خصوصیات، تقاضے اور ترقی وارتقاء کا رخ دوسرے سے الٹ اور دوسرے کی ضد ہے۔ ہر ایک کو اگر اپنی طبعی فطرت پر گامزن ہونے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو قوت خیر اپنے ارتقائی عمل کے نتیجہ میں جملہ صفات خیر وخوبی کو یکے بعد دیگرے طے کرتی جائے گی، تاآنکہ "خیر کل" اللہ تعالیٰ کی ذات سے جاملے گی۔ اور قوت شر اپنے ارتقائے معکوس (الٹی ترقی یعنی سفلی اور تنزلی ترقی) کے نتیجہ میں جملہ صفات شر وبد کو یکے بعد دیگرے طے کرتی جائے گی۔ تاآنکہ "شر کل" یعنی مجسم شیطان بن جائے گی۔ جس کو قرآن "اسفل السافلین" کے درجے سے تعبیر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قوتوں کو ایک انتہائی حکیمانہ تناسب، توازن اور اعتدال کے ساتھ آپس میں ملایا تو اس ملاپ سے ایک تیسری قوت "انسانیت" وجود میں آگئی بالکل اسی طرح جیسے ہائیڈروجن گیس جس کی خاصیت بھڑک کر جلنا ہے اور "آکسیجن گیس" جس کی خاصیت بھڑکا کر جلانا ہے۔ ان دونوں کی ترکیب سے قدرت نے ایک تیسری چیز "پانی" بنادی ہے۔

انسان کی اس حسین ترکیب اور امتزاج کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں "احسن تقویم" بہترین تقویم اور بناوٹ کا نام دیا ہے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ربوبیت کے

پیش نظر انسان کے اندر مذکورہ دونوں (قوت خیر و قوت شر) متضاد قوتوں میں سے ہر ایک کے لئے اس کی فطری راہیں کھلی رکھیں "فھدینہ النجدین" یعنی ہم نے انسان کو دونوں راہیں بتادیں "اما شاکرًا واما کفورًا" خواہ وہ بندہ شاکر بنے یا کافر "کلا نمد ھولاء وھولاء" ہم اہل خیر اور اہل شر ہر ایک کی مدد کرتے ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے مذکورہ دو طرفہ ترقی کے عواقب اور منزلیں بھی بتادیں۔ "ان کتاب الابرار لفی علیین. وان کتاب الفجار لفی سجین"۔

اب اپنے مقصد کی طرف آتے ہیں، دین اسلام کی تعلیمات، احکامات اور نظام اسلام کی غرض اور منزل مقصود یہی ہے، کہ انسانیت کی مطلوبہ صفت (احسن التقویم) قائم ودائم رہے۔ یعنی جملہ صفات کمالات مثلاً تخلیق وایجاد، حصول قوت وقدرت، علم وبصیرت، جود وفیض رسانی، حصول عزت وغلبہ، خلافت وحکمرانی، جہان بانی وجہانداری، عدل واحسان اور نظم وتدبیر وغیرہ میں اس حد تک آگے بڑھے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نیابت اور خلافت کا حق ادا کرتے ہوئے جملہ کائنات اور مخلوقات ظاہری ومخفی کو مسخر کر کے اپنا تابع کرے۔ یہاں تک کہ دنیا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "ونفخت فیہ من روحی" کی جیتی جاگتی تفسیر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

اسی مقام کے حصول کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں: "تخلقوا باخلاق اللہ" اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرنے کی جدوجہد کرو۔

میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور نیک بندوں کی وساطت سے معجزات اور کرامات کے ظہور کے متعلق جو واقعات قرآن کریم میں نقل فرمائے ہیں، ان کی بے شمار حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے، کہ اللہ تعالیٰ انسانیت کو اس کی ترقی وارتقاء کی منزلوں کی نشاندہی کرانا چاہتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ آدم علیہ السلام کے واسطے روحانی قوتوں (ملائکہ) کو تابع کرنا۔

۲۔ نوح علیہ السلام کے لئے پانی کا مسخر کرنا۔

۳۔ موسیٰ علیہ السلام کے لئے زیر زمین پانی اور مختلف قوتوں کا (تسع آیات بینات) مسخر کرنا۔

۴۔ ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ اور زندگی اور موت کا مسخر کرنا۔ (فخذ اربعۃ من الطیر)۔

۵۔ داؤد علیہ السلام کے لئے لوہا و فولاد کے آلات حرب و ضرب مسخر کرنا۔

۶۔ سلیمان علیہ السلام کے لئے بر و بحر، معدنیات، انسان، مور و ملخ، ہوا اور جن جیسی قوتیں مسخر ہو گئیں اسی طرح ان کے لئے آنکھ جھپکنے میں دور دراز ممالک سے ثقیل چیزیں (جیسے تخت بلقیس) منگوائی گئیں۔

۷۔ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے علاج، شفایابی، اور زندگی بخشنے کی قوت کا مسخر کرنا۔

۸۔ محمد مصطفیٰ ﷺ کو پوری کائنات برق رفتاری سے طے کرانا۔

۹۔ عزیر علیہ السلام کے لئے صد سالہ مردے زندہ کرانا اور صد سالہ عرصہ کے لئے کھانے پینے کی چیزیں اسٹور کرانا۔

۱۰۔ بعض دوستوں کو صدیوں تک پر سکون میٹھی، نیند کی صورت میں محفوظ کرانا۔

یہ سب وہ ترقی اور ارتقاء ہے، جس کی طرف قرآن کریم رہنمائی فرماتا ہے۔ مگر انسانیت تاہنوز خواب خرگوش میں ہے۔

قصہ کوتاہ :

نظام اسلام اس نوع کی ترقی وارتقاء کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی دعوت دیتا ہے بشرطیکہ ارتقاء کی کسی منزل پر عبودیت اور نیابت کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔

یہ سب ترقی انسان کی قوت ناطقہ کے ارتقاء کے زمرے میں آتی ہے، جو کہ از روئے

شریعت جائز اور صفت کمال ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے یہ بات سراسر غلط ہے کہ نظام اسلام ترقی کے منافی اور ناقابل عمل ہے۔

رہی انسان کے "حیوانی" پہلو کی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل اور تسکین تو چونکہ یہ مادی اور حیوانی انسان، یعنی جسم طبعی اور ظاہری بدن، حقیقی انسان کے لئے کارکردگی کا آلہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے گھوڑا سوار کے لئے۔ اس لئے دین اسلام نے نہ صرف جسم حیوانی کی ضروریات اور تقاضوں کی تکمیل کی اجازت دی ہے، بلکہ اسے مزید خوب تر اور نافع تر بنانے کی اجازت بھی عطا کی ہے۔

بدقسمتی سے آج مسلمان دین اسلام اور قرآن کریم کی تعلیمات اور اس میں فکر و تدبر سے اتنا دور اور بیگانہ ہو چکا ہے، کہ وہ اسلامی تعلیمات کو بھی بدھ مت اور رہبانیت کی طرح سمجھ بیٹھا ہے۔ جس کے نتیجہ میں آج سمجھا جا رہا ہے کہ اسلام میں دین داری، تقویٰ، رضائے الٰہی اور حصول جنت کے لئے ترک دنیا شرط ہے۔ (یعنی اس دنیا کی ناز و نعم، جاہ و جلال، حشم و خدم، راحت و آسائش اور زینت جیسی تمام فانی نعمتوں سے دست بردار ہونا) تاکہ آخرت کی تمام نعمتیں بدرجہ اتم و اکمل ہمیشہ کے لئے مسلمان کو حاصل ہوں یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ دار الفناء (دنیا کی ترقی) اور دار البقاء (آخرت کی ترقی) یہ دونوں آپس میں سوکنیں ہیں، جن کا بیک وقت حصول بدرجہ اتم ناممکن ہے۔

نتیجتاً دانائی یہ سمجھی جاتی ہے، کہ اس فانی دنیا کی نعمتوں کی ترقی اور عروج کو طلاق دی جائے صرف بقدر قوت لایموت (بقدر ضرورت) کو اپنایا جائے اور آخرت کی ترقی اور عروج کے لئے زندگی وقف کر کے جدوجہد کی جائے۔ آج کے مسلمان تھے اس عمل اور اس دعویٰ کے نتیجہ میں یہ فضا بنی اور یہ معلوم ہونے لگا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے اس فانی دنیا کی نعمتیں بنائی ہی اپنے دشمنوں اور کافروں کے لئے ہیں۔ کیونکہ آخرت میں انہیں کچھ نہ ملے گا۔ اور اپنے دوستوں اور مسلمانوں کے لئے اس دنیا میں تکلیفیں اور مشقتیں رکھ دیں، تاکہ وہ آخرت کی

باقی نعمتوں سے بھرپور لطف اندوز ہوں۔

یہ ہے وہ بنیاد جس کی وجہ سے یہ زعم باطل (کہ نظام اسلام موجودہ تیز رفتار ترقی کے منافی ہے) نہ صرف پروان چڑھا بلکہ عامۃ المسلمین اسے ایک صداقت سمجھنے لگے۔

دونوں جہانوں کی نعمتیں صرف مسلمان کے لئے ہیں

مذکورہ زعم باطل کے برعکس قرآن کہتا ہے، کہ اس دنیا کی تمام نعمتیں اور ترقی کی منزلیں طے کرنا مسلمانوں کے لئے نہ صرف جائز ہیں، بلکہ یہ سب کی سب انہی کے لئے بنائی گئی ہیں۔ کافر کو محض بطور طفیلی کے ان میں شرکت کا موقع دیا گیا ہے۔

ایک اصولی بات ذہن نشین کیجئے

وہ یہ کہ اس مادی کائنات اور فانی دنیا میں حضرت انسان نے بطور "خلیفہ" نیابتاً حکمرانی اور جہاں بانی کرنی ہے، اور اس کو بطور خلیفہ بھیجنے والی حکیم اور علیم ذات اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ قیامت تک ہر زمانے اور ہر دور میں انسان کو کن کن حالات سے واسطہ پڑے گا کیسی کیسی چیزوں اور کیسی کیسی ایجادات کی ضرورت پیش آئے گی، اور اُسے ترقی اور عروج کی کتنی منازل طے کرنی ہوں گی۔

رحمٰن اور رحیم ذات اللہ تعالیٰ نے انسان کی آمد سے بہت پہلے اس کی جملہ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کائنات میں نعمتوں کے خزانے بھر دیئے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وان من شیء الا عندنا خزآئنه وما ننزله الا بقدر معلوم○

(الحجر۔ آیت: ۲۱)

"اور کوئی شے نہیں جس کے ہمارے پاس خزانے موجود نہ ہوں لیکن ہمارا طریق کار ہے، کہ جو کچھ نازل کرتے ہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل

کرتے ہیں"۔

گویا کہ رب رحیم نے انسان کے تقاضوں کے پیش نظر اس کی آمد سے پہلے ہی اس کی ضروریات کائنات میں پوشیدہ ودیعت کر دیں۔

واتاکم من کل ما سئلتموہ وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا○

(ابراہیم، آیت: ۳۴)

"اور جو کچھ تم نے مانگا (تمہیں مطلوب تھا) وہ سب کچھ اس نے عطا کر دیا۔ اور اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنی چاہو تو وہ اتنی ہیں کہ ہر گز شمار نہ کر سکو گے"۔

البتہ ان پوشیدہ نعمتوں کا ظہور دو باتوں پر موقوف ہے۔

۱۔ ہر زمانہ کے تقاضائے حال کی ضرورت کے مطابق۔

۲۔ انسانوں کی جستجو اور جدوجہد کے نتیجہ میں۔

ما ننزلہ الا بقدر معلوم○ (الحجر۔ آیت: ۲۱)

"جو کچھ ہم نازل کرتے ہیں (ظاہر کرتے ہیں) اس کا طریقہ کار یہ ہے، کہ مقررہ اندازہ کے ساتھ نازل کرتے ہیں"۔

وکل شیء عندہ بمقدار○ (الرعد۔ آیت: ۸)

"اور اللہ کے دربار میں ہر چیز کا نزول اور ظہور ایک مقررہ مقدار کے مطابق ہے"۔

وان لیس للانسان الا ما سعی○

"اور انسان کے لئے اور کچھ نہیں مگر اس کی مشقت کے ثمرات اور پھل"۔

تشریح: ان آیات قرآنی میں قابل غور چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "لکم" ضمیر

مخاطب سے براہ راست خطاب مسلمان مخاطبین سے فرمایا "لھم" (ان کے لئے یعنی کافروں کے لئے) نہیں فرمایا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مادّی اور فانی دنیا کی تمام نعمتوں کی تخلیق بھی مسلمان کے لئے ہوئی ہے، کافر کی شرکت اس میں فقط طفیلی کے طور پر ہے۔

سائنس کی گواہی اور مشاہدہ کی شہادت

ہم دیکھتے ہیں کہ اس مادّی دنیا میں جو کچھ بھی ہے، ان میں ہر ایک کے اندر کوئی خاص اثر اور خاصیت کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کائنات کی چیزوں کی یہ مختلف خاصیتیں اور اثرات کچھ اس طرح واقع ہوئے ہیں، کہ ہر ایک خاصیت کے ساتھ آج یا آئندہ ہماری کوئی نہ کوئی ضرورت و احتیاج اور راحت و آسائش وابستہ ہے، کہ اس کا حصول کسی دوسرے ذریعہ سے ممکن نہیں ہے۔

سورج جیسے عظیم الجثہ، ستارے سے لیکر ایٹم جیسے خوردبینی ذرّے میں جھانک کر دیکھو تو آپ کو پوشیدہ انعامات خداوندی کے بکھرے خزانے نظر آئیں گے۔ اس دعویٰ اور حقیقت کے ثبوت پر آج سائنس ناقابل انکار گواہی دے رہی ہے۔

سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انّہٗ الحق ۝

(فصلت۔ آیت نمبر ۵۳)

"ہم دنیا اور اُن کے نفسوں میں بڑی نشانیوں کو عنقریب انہیں دکھائیں گے تاکہ ان کے آگے ظاہر ہو جائے کہ یہ حق ہیں"۔

گل رنگیٔ عالم

نہ صرف یہ کہ فیضان رحمت نے اس مادّی دنیا کو انسان کی ترقی اور راحت و آسائش کے خزانوں سے مالا مال کر دیا بلکہ اسے ایک نئی نویلی دلہن کی طرح حسن و جمال اور نقش و نگار سے مزین بھی کر دیا حتیٰ کہ۔ اس عالم رنگ و بو کی مجموعی صورت پر یا اس کے ایک ایک جزو اور گوشے پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا، کہ اس کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر حسن و جمال نے ایک نقاب دلربائی نہ ڈال دیا ہو۔ مثلاً ستاروں کی آنکھ مچولی اور ان کی منظم سیر و گردش، سورج کی تابانی اور بو قلمونی، چاند کی چاندنی اور اتار چڑھاؤ، آسمان کی نیلگونی اور رنگینی، بارش اور اس کی کالی گھٹائیں وخنک ہوائیں، رعد و برق، قوس قزح کی شوخیاں، سمندر کا نظارہ اور دریاؤں کا بہاؤ، پہاڑوں کے سر بفلک سلسلے اور نشیبی دامنوں کی بہاریں، حیوانات کے اجسام اور ان کا تنوع۔ کسی باغ کے اندر جائیں اور ارد گرد نظر گھمائیں تو آپ دیکھیں گے کہ کہیں پھلوں اور پھولوں سے لدی اور جھکی ہوئی شاخیں ہیں، تو کہیں سبز گھاس کا مخملیں فرش جس پر جابجا شبنم کے موتی بکھرے پڑے ہیں، اور رنگ و برنگ تتلیوں کا رقص اور بلبلوں اور دوسرے پرندوں کے نغموں کا زمزمہ جو قوت سامعہ کے نشاط کے لئے قدرت کی موسیقی ہے، اور باد نسیم کی عطر بیزی کی دل آویزی دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ اس جہانِ رنگ و بو کے پیچھے ایک حسین و جمیل قوت ہے، جو چاہتی ہے کہ اس جہان کو حضرت انسان کی آنکھوں کے لئے ٹھنڈک، کانوں کے لئے لذت اور دل و جان کے لئے بہار بنا دے۔ مگر انسان کی فطری کمزوری ہے، کہ جو نعمت اسے مفت میں حاصل ہو اس کی قدر و قیمت سے اس وقت تک غافل رہتا ہے جب تک وہ اس سے محروم نہ ہو جائے۔

قرآن کریم انسان کو اس خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے جگہ جگہ اس تزئین گلستان کا ذکر فرماتا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

ولقد جعلنا فی السمآء بروجا وزینھا للناظرین○

(الحجر۔ آیت: ۱۶)

"اور تحقیق ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور ہم نے اسے زینت دی ہے واسطے دیکھنے والوں کے"۔

ولقد زینا السمآء الدنیا بمصابیح○ (الملک۔ آیت: ۵)

"اور تحقیق ہم نے دنیا کے آسمان کو چراغوں اور قندیلوں سے مزین کیا ہے"۔

افلم ینظروا الی السمآء فوقھم کیف بنینھا وزینھا وما لھا من فروج○ والارض مددنھا والقینا فیھا رواسی وانبتنا فیھا من کل زوج بھیج○ (سورہ ق۔ آیت:۶)

"کیا ان لوگوں نے آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کس طرح اسے بنایا اور اسے مزین کیا اور اس میں کوئی عیب وشگاف نہیں (چھوڑا) اور زمین کو دیکھو کس طرح ہم نے اسے فرش کی طرح پھیلا دیا اور پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے اور اس میں کس طرح خوبصورت نباتات اگا دیں"۔

وانبتنا فیھا من کل شیء موزون○ (الحجر۔ آیت: ۱۹)

"اور ہم نے زمین میں ہر ایک چیز موزونیت اور تناسب رکھنے والی اگائی ہے"۔

وجعل القمر فیھن نورًا وجعل الشمس سراجا○ (نوح۔ آیت: ۱۶)

"اور آسمانوں میں چاند چمکتا ہوا نور بنایا اور آفتاب کو روشن قندیل بنایا"۔

اور اس کے ساتھ رنگینیٔ فطرت پر بھی ایک نظر ڈالیے کہ رب فطرت نے انھیں کس طرح دلربائی عطا کی ہے۔ چنانچہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

ومن الناس والدوآب والانعام مختلف الوانه○ (فاطر۔ آیت: ۲۸)

"اور انسان، جانور، چوپائے طرح طرح کے رنگوں کے (دیکھو فطرت نے اس کو کتنی دلربائی بخشی ہے)

وما ذرا لکم فی الارض مختلفا الوانه○ (النحل۔ آیت: ۳)

"اور دیکھو اللہ نے جو پیداوار مختلف رنگوں کی تمہارے واسطے زمین میں پھیلادی ہے"۔

والزرع مختلفا اکله○ (الانعام۔ آیت: ۱۴۱)

"اور طرح طرح کی کھیتیاں جن کے (دانوں اور پھلوں کے) ذائقے مختلف ہیں"۔

ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانها وغرابیب سود○

(فاطر۔ آیت: ۲۷)

"اور پہاڑوں کو دیکھو مختلف رنگوں کے ہیں، کچھ سفید، کچھ سرخ اور کچھ کالے کلوٹے"۔

وهو الذی سخر البحر لتاکلوا منه لحما طریا وتستخرجوا منه حلیة تلبسونها○ (النحل۔ آیت: ۱۴)

"اور اس نے تمہارے لئے سمندر مسخر کیا تاکہ تم کھانے کے لئے اس سے تازہ گوشت حاصل کرو اور زیورات باہر نکالا کرو جنہیں زینت کے لئے پہنتے ہو"۔

ولکم فیها جمال حین تریحون وحین تسرحون○

(النحل۔ آیت: ۲)

"اور تمہارے لئے مویشیوں میں کتنے حسن وجمال کا سامان کیا جب وہ شام کو چر کر واپس آتے ہیں اور جب چراگاہوں کے لئے نکلتے ہیں"۔

والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینۃ ویخلق مالا تعلمون ○

(النحل۔ آیت: ۸)

"اور تمہاری سواری اور زینت وزیبائش کے لئے پیدا کئے گھوڑے، خچر اور گدھے اور وہ کچھ (دیگر سواریاں) پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں"۔

اللہ تعالیٰ کے جود وکرم پہ قربان جایئے کہ اس نے انسان کی سرشت اور طبیعت میں حسن وجمال، موزونیت وتناسب اور لطافت وپاکیزگی کی ایسی پیاس بھر دی کہ حسن ودلربائی خواہ صورت میں ہو یا صوت میں، منظر میں ہو یا ماکولات اور مشروبات میں، یا ملبوسات اور مکانات میں غرض جس چیز میں بھی حسن وجمال ہو، حضرت انسان غیر شعوری طور پر ادھر کا ہو جاتا ہے۔ شاید قدرت نے انسان کو شکار کرنے کے لئے جنت کے دروازے (اس فانی جہان) میں جنت کی نعمتوں کے نمونے پھیلا دیئے ہیں۔ تاکہ انسان ان کے پیچھے کھنچتا ہوا جنت کی دائمی نعمتوں کا بن دیکھے خریدار بنے۔ اگر انسان میں حسن وخوبی کی یہ طلب نہ ہوتی یا یہ مادی جہاں اس رعنائی اور دلبری سے عاری ہوتا تو بتایئے کہ جنت کی نعمتوں کی جستجو اور انسان کے درمیان کونسا رشتہ اور ارتباط ہوتا؟

زین للناس حب الشھوات من النسآء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ذالک متاع الحیوۃ الدنیا واللہ عندہ حسن المآب ○ (آل عمران۔ آیت: ۱۴)

"انسان کے لئے مرغوب بنادی گئی شہوت کی چیزوں کی محبت، عورتیں اور بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، خزانے اور چنے ہوئے گھوڑے (سواریاں) اور مویشی اور کھیتی باڑی یہ جو کچھ بھی ہے اس عارضی دنیا کا نفع اور نعمتیں ہیں، اور اس سے کہیں بہتر ٹھکانا (بہشت) تو اللہ ہی کے پاس ہے"۔

فیضان رحمت نے جس فیاضی سے حضرت انسان کے لئے جہان رنگ وبو کی تحسین وتزیین کی ہے، شاید کوئی زاہد خشک ہی اس کے تقاضائے حسن کی خاموش دعوت کو نہ سمجھ سکے۔ چنانچہ خالق کائنات نے اعلان فرمایا۔

قل من حرم زینة الله التی اخرج لعباده والطیبات من الرزق قل هی للذین آمنوا فی الحیوة الدنیا خالصة یوم القیامة ٥

(الاعراف۔ آیت: ۳۲)

"آپ ان لوگوں سے پوچھئے کہ کون ہے وہ جس نے حرام کیا اس زینت وزیبائش کو جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہے اور کھانے پینے کی صاف ستھری چیزیں، کہہ دیجئے کہ یہ چیزیں اس دنیا میں ایمان والوں کے لئے ہیں اور قیامت کے دن تو صرف مومنین کے لئے خاص ہوں گی"۔

تشریح : اس دنیا میں کافر بطور طفیلی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، مگر قیامت میں تمام نعمتیں مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص ہوں گی۔ ان آیات سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ دونوں جہانوں کی نعمتیں، راحتیں اور حسن وخوبی مسلمانوں کی میراث ہے، جو لوگ ان دونوں جہانوں کی نعمتوں اور عروج وترقی کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنے بندوں کے طور پر یوں متعارف کراتے ہیں۔

ومنهم من یقول ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة ٥

"ان بندوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں نعمتیں عطا فرما اور آخرت میں نعمتیں عطا فرما"۔

شکر نعمتہائے تو چنداں کہ نعمتہائے تو
عذر تقصیرات ما چنداں کہ تقصیرات ما

مختصر یہ کہ اسلام کے اس دعویٰ سے "کہ دونوں جہانوں کی نعمتیں اور ترقی وعروج

مسلمان ہی کی میراث ہے "اسلام پر سے وہ داغ دھل جاتا ہے" کہ اسلام ترقی کے منافی ہے "مگر افسوس کہ قرآنی تعلیمات سے بیگانگی کے نتیجے میں مسلمان آج خود کہتا پھرتا ہے، کہ اس جہان کی ترقی و عروج اور عزت و نعمت کافروں کی میراث ہے، مسلمانوں کو یہ اعزاز "دوسرے جہاں" آخرت میں ہی حاصل ہو گا۔ چنانچہ وہ راضی بر قضاء اس تقسیم کو بخوشی قبول کر چکا ہے۔

سبک ز جائے نگیری کہ بس گراں گہر است
متاع من کہ نصیبش مبادا ارزانی

اس سوختہ نصیبی پر رویا نہ جائے تو کیا کیا جائے؟

سوال نمبر ۱۲

عموماً کہا جاتا ہے کہ نظام اسلام ایک سخت اور مشکل دین ہے، اس میں سخت ترین سزائیں ہیں، اور قدم قدم پر غیر ضروری پابندیاں ہیں۔ لہٰذا موجودہ دور کے نازک بدن انسان پر اس کا نفاذ ناممکن ہے۔

جواب :

اس بات میں ذرّہ بھر صداقت نہیں بلکہ یہ بھی یورپ کے اس بھرپور پروپیگنڈے کا ایک حصہ ہے، جو وہ متواتر اسلام کے خلاف کر رہے ہیں۔ اور دوسری بات مسلمانوں کی قرآن و سنت کی حقیقی تعلیمات سے بے خبری ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اس کے جملہ احکامات اور اوامر و نواہی میں اسی فطرت سلیمہ کی آبیاری ہے۔ اس لئے اسلامی احکامات میں انسان کے لئے آسانی، موزونیت اور زبردست مناسبت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل سے پہلے ایک بنیادی اصول ذہن نشین کیجئے۔

جملہ احکاماتِ اسلام کے اندر ایک اصول کار فرما ہے

بنیادی طور پر اسلامی احکامات دو قسم کے ہیں۔

اوامر :

اوامر جمع ہے امر کی یعنی کسی کام کے کرنے کا حکم یا آرڈر دینا۔ جملہ عبادات، فرائض، واجبات، سنن، نوافل، مباحات، یا حلال امر کے زمرے کے تحت آتے ہیں۔

نواہی :

نواہی جمع ہے نہی کی یعنی کسی کام سے منع کرنا، جملہ اسلامی پابندیاں حرام، ناجائز، مکروہات اور ممنوعات نہی کے زمرے میں آتے ہیں۔ جملہ اوامر اور عبادات کا اگر عمیق تجزیہ کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ ان سب سے ایک چیز کا حصول مطلوب ہے، اور وہ ہے انسانیت کے ظاہری اور باطنی (روحانی اور مادی) وجود کی ترقی اور تحفظ۔ البتہ عبادات میں انسانیت کی روحانی اور باطنی پہلو کی زیبائش اور نکھار زیادہ ہے بہ نسبت مادی اور ظاہری جسم کے۔

مثلاً عقائد اسلامی کو لیجئے۔

اسلامی عقائد میں سب سے بنیادی چیز عقیدہ توحید اور عقیدہ صفات ہے۔

۱۔ توحید۔ میں قوت اور جمعیت، سے کوئی ذی عقل انسان انکار نہیں کر سکتا ہے۔ اس کی ضد تعدد اور تفریق، میں جو انتشار، مخالفت، ضعف، پراگندگی اور دشواریاں ہیں اس سے بھی انسان انکار نہیں کر سکتا۔

نتیجہ، توحید کا عقیدہ انسان کی روح، ذہن، تصور، قصد و ہمت اور یقین و اطمینان کے لئے باعث قوت و سکون ہوگا۔

یعنی جس انسان کے باطن اور دل و دماغ میں ایک ایسا عقیدہ جس میں قوت ہی قوت

ہو عمر بھر کے لئے جاری وساری رہے، تو اس انسان میں روحانی اور ذہنی قوت کا پیدا ہونا ایک بدیہی اور منطقی بات ہے۔ جس سے کوئی بھی ماہر نفسیات اور ماہر روحانیات انکار نہیں کر سکتا۔

۲۔ صفات۔ اللہ تعالیٰ کی صفات عموماً وجودی (مثبت) اور تعمیری (کمال کی) ہیں۔ مثلاً حی، صاحب حیات، عالم، قادر، خالق، رازق، رحمٰن، رحیم وغیرہ جملہ صفات میں کمال وخوبی، فیض وجود اور عدل واحسان جیسے پاکیزہ اور نورانی معانی اور تعمیری تصورات موجزن ہیں اور حکماء، فلاسفروں اور سائنس دانوں کا اس پر اتفاق ہے، کہ انسان کی صحت، قوت اور حسن کے لئے شرط اوّل یہ ہے، کہ اس کے خیالات اور تصورات حسین، پاکیزہ اور تعمیری ہوں۔

۳۔ عبادات۔ میں سے نماز کو لیجئے لباس، مکان، بدن کی طہارت، وقت کی پابندی کی مشق، جسمانی ریاضت خیالات اور تصورات کا ایک نقطہ پر مرکوز اور یکجا کرنا، بندگی اور نیابت کے حسین جذبہ کو بار بار دھرانا، اور قرآنی ہدایت کی بار بار تازگی، غرض یہ تمام نورانی افعال نماز ہی کے سبب وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ نماز کی افادیت کی وضاحت کے لئے ماہرین نفسیات کی آراء سنئے۔

ماہرین روحانیات، مسمریزم کی تعلیمات میں بنیادی چیز یہ بتاتے ہیں، کہ انسان قوت ذہنی اور قوت ارادی کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنے پر قادر ہو جائے۔ اس کی مشق کے لئے یہ لوگ طالب علموں کو چند مہمل، اور بے معنی کلمات بتاتے ہیں، کہ ان کلمات کو کسی اندھیرے اور پرسکون مقام پر دھراتے رہو اور تصورات اور افکار کو ادھر اُدھر سے سمیٹ کر ان الفاظ پر یکجا اور مرکوز کرنے کی کوشش کرو۔ یا ان سے شمع بینی کی مشق کرواتے ہیں، نتیجتاً ماہرین مسمریزم اور روحانیت میں، ناقابل یقین روحانی قوت دیکھنے میں آتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص مسنون طریقے سے نماز پڑھتا رہے، تو اس کی روحانی اور ذہنی قوت میں بے پناہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

موجودہ سائنسی دور اور روحانی قوت

امریکہ کے سائنسی رسالہ ڈسکور (Discouyer) نے مارچ ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع کیا ہے، جس کا عنوان ہے (Psychic Task Force) اس مضمون کا لب لباب یہ ہے، کہ امریکہ کی بری، بحری اور فضائی فوجوں کے اعلیٰ ترین ادارے پینٹاگون (Pentagon) کے ماہرین روحانیات نے فیصلہ کیا ہے، کہ انسان کے نفس اور ذہن کی قوتوں اور روحانی صلاحیتوں کو جنگی اغراض کے لئے استعمال کیا جائے کیونکہ وہ ایسے ہتھیار بنانا چاہتے ہیں، جنہیں ذہنی قوت اور ارتکاز توجہ کے ذریعہ استعمال کیا جاسکے اس غرض کے لئے جو منصوبہ انہوں نے بنایا ہے اس کا نام ہے "نفس کی قوتوں کے جنگی استعمال کے امکانات کی تحقیق" اس منصوبہ پر سالانہ چھ ملین ڈالر خرچ کئے جارہے ہیں۔

امریکی افواج کے سرکاری ترجمان "ملٹری ریویو" کے دسمبر ۱۹۸۰ء کے شمارے میں لیفٹیننٹ کرنل جان الیگزینڈر کا ایک مضمون چھپا ہے۔ جس کا عنوان ہے دی نیو مینٹل بیٹل فیلڈ (The New Mental Battle Field) یعنی جدید ذہنی میدان جنگ۔

جان الیگزینڈر کا دعویٰ ہے کہ ایسے ہتھیار ایجاد ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں جنہیں بائیو انرجی (قوت حیات یا ذہنی قوت) کے ذریعے مہلک طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(بحوالہ اخبار جنگ پنڈی، ۶ جون ۱۹۸۱ء اور نیس امروہوی)

غرض یہ کہ نماز سے انسان کی روحانی قوت میں اضافے کی سچائی پر آج سائنس بھی گواہی دے رہی ہے۔

۴۔ زکوٰۃ۔ کی ادائیگی گویا کہ انسانیت کے ساتھ ہمدردی، ایثار اور قربانی ہے، جس کی خوبی پر جملہ آسمانی اور انسانی تعلیمات گواہ ہیں۔

۵۔ صوم۔ جسمانی اور روحانی صحت کے علاوہ مطالبوں کے تسلیم کروانے کا وہ مسلّم

طریقہ ہے کہ جسے اس جدید دور میں بھی بین الاقوامی طور پر اپنایا جارہا ہے۔ مگر دوسرے ناموں سے اور دوسرے اغراض کے لئے۔ جیسے دین جمہوریت میں "بھوک ہڑتال" اور موٹاپے کے لئے ڈائیٹنگ یعنی غذا کم کرنا، صوم کی ظاہری نقول ہی ہیں۔ اس کے علاوہ شریعت نے تزکیہ ظاہر وباطن کے لئے رمضان شریف میں عبادات فرض کی ہیں، اور ہر روزہ دار بلاریب واضح طور پر محسوس کرتا ہے کہ روزہ سے انسانیت کی تکمیل کا حقیقی درس ملتا ہے۔

۶۔ حج۔ انسانیت کے بین الاقوامی ربط، وحدت اور قوت کا مظاہرہ ہے۔ انسانیت کے عظیم محسن اور ہیرو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کارناموں کا تذکرہ کرنا اور رب کائنات کی بندگی کے عہد کی تجدید کرنا مناسک حج میں سے ہے۔ پس حاصل عبادات یہی ہوا کہ انسان کے انفرادی اور اجتماعی وجود کی ترقی اور تحفظ کو یقینی بنایا جائے اور یہی انسان کی فطری اور طبعی چاہت ہے کہ اس کا وجود روبہ ترقی اور محفوظ ہو۔

اسلام کی منہیات اور ممنوعات کا فلسفہ

اسلام نے جن چیزوں کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔ ان سب کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں ایک ہی چیز مطلوب نظر آتی ہے۔ اور وہ ہے انسان کے ظاہر اور باطن (روحانی اور مادّی جسم) کو ضرر اور گزند سے بچانا جو کہ شریعت کا اصول ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے۔ "کل مسکر ومفتر حرام" ہر نشہ آور اور اعصاب کو کمزور کرنے والی چیز حرام ہے۔ قرآن کریم نے شراب کے فوائد کی نسبت اس کے مضر اثرات کے زیادہ ہونے پر اسے ممنوع قرار دیا۔ جنس پرستی کے دیو کو اسلام نے ایک محدود دائرہ کے اندر مقید کر کے انسانیت کو تباہ کن بیماریوں سے تحفظ دیا اور کئی معصوم جانوں اور عصمتوں کو ہوس کا نشانہ بننے سے بچا لیا۔

جنسی بے راہ روی کے نتائج

امریکہ میں ایڈز کے وائرس کے پھیلاؤ کی بڑی وجہ جنسی بے راہ روی ہے۔ "ایک اندازے کے مطابق دنیا میں ہر سال پچیس کروڑ افراد جنسی تعلق کی وجہ سے جراثیم منتقل ہونے سے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور سنہ ۲۰۰۰ء تک تین کروڑ افراد ایڈز کا شکار ہو جائیں گے"۔ (اخباری رپورٹ)

یورپ میں ناجائز اولاد اور اسقاط حمل کی بھرمار

اسی اخباری اطلاع کے مطابق "برطانیہ کی فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ڈورین میسی نے کہا ہے کہ "برطانیہ میں ہر تین منٹ بعد ایک لڑکی اسقاط حمل کراتی ہے، کمسن حاملہ لڑکیوں کی تعداد خطرناک حد تک پہنچ گئی ہے، جسکی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جائے گا" (امریکہ میں ہر چوتھا بچہ ناجائز ہے) "امریکہ میں گذشتہ پندرہ برس کے دوران نو عمر (دس سے بیس سال تک کی عمر) ماؤں کی شرح میں ریکارڈ اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۸۹ء کے دوران پیدا ہونے والے ہر چار بچوں میں سے ایک غیر شادی شدہ ماں سے ہے (حرامی ہے)"۔

شراب ایڈز کے مرض کی معاون ہے

بھارتی ڈاکٹر این نائر کی تحقیق ہے کہ شراب کے استعمال سے جسم کی قوت مدافعت کم ہو جاتی ہے، اس طرح شراب ایڈز کے لئے معاون کا کام انجام دیتی ہے۔

(روزنامہ پاکستان، ۵ دسمبر ۱۹۹۱ء کا خصوصی اشاعت ولادت قائد اعظم کالم نمبر ۲، ونڈ کور و اخبار ۱۹ دسمبر ۱۹۹۱ء)

غرض یہ کہ اسلام نے کھانے پینے کی جتنی چیزیں حرام کی ہیں، ان سے انسان کے اخلاق یا جسم پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جس کے اقرار پر سائنس بھی مجبور ہوتی

جا رہی ہے، بلکہ برائی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ بعض مجرموں اور تخریب کاروں کے متعلق جلوسوں اور مظاہروں میں مطالبے ہوتے ہیں، کہ ان مجرموں کو سرعام پھانسی دی جائے مگر اس کا اثر کچھ نہیں۔

شرعی سزاؤں کا رعب زیادہ مگر وقوع بہت کم ہے

شریعت کی سخت ترین سزاؤں میں سے دو سزائیں ایسی ہیں، جن کے خلاف یورپ اور امریکہ کی فاحشہ عورتیں بہت واویلا کرتی ہیں۔ یہ دو سزائیں زنا کی سزا "سنگ سار کرنا" اور چوری کی سزا "ہاتھ کاٹنا" ہیں۔ مگر یاد رہے کہ باوجود اس کے کہ ان سزاؤں کی دہشت زیادہ ہے، لیکن جن لوگوں کو شرعی قوانین کا علم ہے، وہ جانتے ہیں کہ عملاً اس کا وجود نیست کے برابر ہے۔

مثلاً زنا کے ثبوت کے لئے شریعت نے ایسی سخت شرائط عائد کی ہیں، کہ اس کا ثبوت قریباً ناممکن ہے بجز اس کے کہ زانی خود جاکر جج کے سامنے اقرار کرے۔ اگر ثبوت کے بغیر کسی فرد نے کسی پر زنا کی تہمت لگادی اسے خود "حدِ قذف" کی سزا بھگتنا ہوگی اس طرح شریعت نے زنا کی وبا کے پھیلاؤ پر گویا تالے لگا دیئے۔

ہاتھ کاٹنے کی سزا کے لئے بھی اتنی شرائط ہیں، کہ موجودہ دور کی چوری کے واقعات میں ہاتھ کاٹنے کے موقعوں میں پانچ فیصد تک پہنچنا مشکل ہوگا۔ تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

اگر ان سزاؤں کا سخت ہونا تسلیم بھی کیا جائے تو بھی زنا، چوری جیسی برائیاں معاشرے کے لئے کینسر یا بغاوت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ "اور کیا آج کل کینسر کے علاج کے لئے اسپتالوں میں ہاتھ پاؤں نہیں کاٹے جاتے"۔

اگر آج کل کوئی فرد یا قوم بغاوت کی روش اپنائے تو کیا گورنمنٹ ان پر سنگ باری، آتش باری اور گولہ باری نہیں کراتی؟

مثال کے طور پر خلیجی جنگ میں متحدہ افواج کی عراق کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر کروڑوں من گولہ باری جسے اقوام عالم کے "دار القضاء" اقوام متحدہ کی اسمبلی نے جائز قرار دیا۔ افغانستان، فلسطین، کشمیر وغیرہ ممالک پر بمباری دیکھئے مگر پھر بھی "بدنام صرف ایک سزا" ہے اور وہ ہے اسلام کی سزا "سنگ باری" جو کہ انسانی معاشرے کی اصلاح کے لئے دی جاتی ہے۔

؎ صد سال مے تواں بریں انصاف گریستن

غرض یہ کہ اسلامی سزاؤں، ممنوعات اور پابندیوں کا واحد مقصد معاشرے کے وجود کی صحت کو تحفظ دینا ہے، اور انسان کی فطرت اور طبیعت یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کی صحت کو تحفظ دینے کے لئے ہر قربانی دینا اپنا مفاد سمجھتا ہے۔

دین اسلام سہولت پسند دین ہے

معترضین کی یہ بات کہ دین اسلام مشکل اور سخت ہے، اس لئے آج کل کے زمانہ میں نظام اسلام کا نفاذ ناقابل عمل ہے یہ بات بے بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ○

(البقرہ۔ آیت: ۱۸۵)

"اللہ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے اور تمہارے اوپر سختی اور تنگی نہیں کرتا"۔

ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر ○

(القمر۔ آیت: ۱۷)

"تحقیق ہم نے قرآن کو نصیحت کا آسان دستور العمل بنایا ہے، کوئی ہے راہ راست پر آنے والا"۔

پچھلے مضمون میں آپ پڑھ آئے ہیں، کہ اسلام کے جملہ احکامات در حقیقت انسانی وجود کی بقا، ترقی اور تحفظ کے لئے ہیں، اور انسان کی فطرت ہے کہ جو عمل اس کی ذات کے لئے منافع بخش ہو وہ اسے آسان اور مرغوب نظر آتا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی احکامات کے فوائد اور ممنوعات کے نقصانات موجودہ سائنسی زبان میں سمجھائے جائیں۔ معلم کل حضور ﷺ اس حقیقت کے پیش نظر کہ دین اسلام میں آسانی ہی آسانی ہے۔ مبلغین اسلام کو تاکیداً ہدایت فرماتے تھے۔

بشروا ولا تنفروا، یسروا ولا تعسروا ○

"لوگوں کو خوشخبریاں سنایا کرو اور انہیں دین سے بیزار نہ کرو لوگوں پر آسانی کرو اور تنگی نہ کرو"۔

سوال نمبر ۱۳

کیا جمہوریت کو مسلمان بنایا جاسکتا ہے؟

کیا یہ ممکن نہیں کہ مروّجہ جمہوریت کی اس طرح اصلاح کی جائے کہ جمہوریت بھی بحال رہے اور اسلام کی صورت بھی اختیار کر جائے۔ یعنی کچھ لو اور کچھ دو کی اساس پر ان دونوں دینوں کے درمیان مصالحت کی جاسکے؟

جواب :

ان دونوں ادیان میں بعض ایسے بنیادی نکات ہیں، جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ مخالف اور (Opposite) اپوزٹ نکات ہر ایک کے قوام اور وجود کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا ایک ہونا ناممکن ہے۔ جس طرح کہ دو اعداد (گنتی کی چیزیں) ایک طاق اور دوسرا جفت مثلاً پانچ اور چھ ان دونوں اعداد میں کوئی ایسی مصالحت کرنا کہ دونوں ایک بھی ہو جائیں اور دونوں کی اپنی حقیقت اور حیثیت بھی برقرار رہے ناممکن ہے۔

بجز اس کے کہ ایک کی اصلیت اور حقیقت ختم کر دی جائے اور صرف لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے اسکے نام کی رٹ لگائی جائے کہ لو بھائی الحمدللہ اس جفت عدد کو ہم نے طاق کی صفت سے بھی مشرف کر دیا اور یہ ہے "طاق جفت"۔

دین اسلام کا قوام اور اس کی بنیاد

وہ بنیادی نکات کیا ہیں تفصیل دیکھئے:

دین اسلام کے وجود کی بنیاد یہ ہے کہ۔ اقتدار اعلیٰ، حاکمیت اور "مقتدر اتھارٹی" صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور حق و باطل اور حلال و حرام کا ماخذ اور معیار اللہ کی اطاعت اور اطاعت رسول ﷺ ہے۔ یا بالفاظ دیگر قرآن و سنت ہیں۔ اس پر مزید شرط یہ بھی ہے کہ "قرآن و سنت" کے نظام کی حقانیت اور سچائی پر ایمان بھی ہو۔ پس اگر کوئی معاشرہ کی مصلحت اور ضرورت کے تحت قرآن و سنت پر مبنی نظام حکمرانی نافذ بھی کرتا ہے، مگر اس قوم کو اس نظام کی حقانیت اور صداقت پر ایمان و یقین نہیں، تو یہ معاشرہ اسلامی معاشرہ نہیں کہلا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی کافر موٹاپا کم کرنے کے لئے رمضان کے روزے رکھنے شروع کر دے تو روزہ رکھنے سے وہ مسلمان نہیں بن سکتا۔

دین اسلام کی ان بنیادی چیزوں میں سے اگر ایک کی بھی نفی کر دی جائے تو وہ دین اسلام ہر گز نہ ہو گا۔

علیٰ ھذا القیاس ابو جہل اور دوسرے مشرکین حج کے ایام میں طواف بیت اللہ شریف کے دوران یوں تلبیہ پڑھتے تھے۔

لبيك اللهم لبيك لا شريك لك الا شريكً تملكه وما ملك.

"اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کے لئے حاضر ہوئے ہیں تیرا کوئی خود مختار شریک نہیں ہے بجز اس شریک کے جو کہ تیرا مملوک ہے۔ یعنی وہ ذاتی حیثیت سے تیری خدائی میں

شریک نہیں بلکہ تو نے اسے خدائی کے اختیارات دیے ہیں"۔
مشرکین مکہ ببانگ دہل اعلان کرتے تھے کہ ہمارے معبودان باطلہ اور ان کی مملوک چیزوں کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ لیکن اللہ نے ان کو اقتدار اعلیٰ میں سے ایک حصہ منتقل کیا ہے مگر باوجود اس کے وہ مشرک ٹھہرائے گئے۔ لہٰذا اقتدار اعلیٰ میں کسی بھی حیثیت سے گو کہ ادنیٰ ہو، غیر اللہ کی شرکت کے بعد نہ انسان مسلمان رہ سکتا ہے، اور نہ اس کا دین دین اسلام رہتا ہے۔

دین جمہوریت کا قوام اور اس کی بنیاد

جمہوریت کی بنیاد اس پر ہے کہ اقتدار اعلیٰ، حاکمیت، مقتنہ اتھارٹی، حق اور باطل، حلال اور حرام کا ماخذ اور معیار عوام کی اکثریت کی رضامندی ہے۔ عوام کی اکثریت کے اقتدار اعلیٰ کی اس شق کو جب دین جمہوریت سے کسی بھی مرحلے پر منفی کیا جائے تو جمہوریت اسی لمحے معدوم اور نیست ہو جائے گی۔ اس حقیقت سے نہ تو خدا پرست انکار کر سکتا ہے اور نہ جمہوریت پرست۔ اس واضح تفریق کے بعد کس کی جرأت ہے، کہ وہ ان دونوں ادیان کو جوڑ کر حقیقی معنوں میں ایک تیسرے دین "اسلامی جمہوریت" کا مرکب تیار کر سکے؟

سوال نمبر ۱۴

کیا نظام اسلام کے لئے "اسلامی جمہوریت کے نام کو یا اس کی اصطلاح کو استعمال کیا جا سکتا ہے؟"۔

جواب :

جہاں تک نام اور اصطلاح کی بات ہے تو بذات خود اس میں کوئی برائی نہیں۔ تھوڑے بہت تعلق کی بنا پر عموماً دو مختلف چیزوں کے نام کا اطلاق ایک دوسرے پر کیا جا سکتا

ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بہادر انسان کو شیر کہا جا سکتا ہے۔

چونکہ دین اسلام میں کئی مواقع ایسے آتے ہیں، جہاں اکثریت کی رائے پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً خلیفہ کا انتخاب یا کوئی ایسا مسئلہ جس کے بارے میں نص قرآن وحدیث موجود نہیں اور اس مسئلے کے دونوں پہلوؤں کے متعلق دلائل یکساں وزنی ہوں تو ایسی صورت میں قائد ایوان شوریٰ اکثریت کی رائے پر فیصلہ دے سکتا ہے۔ مگر اس لئے نہیں کہ یہ اکثریت بذات خود ایک شرعی دلیل ہے، بلکہ محض قرعہ اندازی کی حیثیت سے اور طیب قلوب کے لئے چنانچہ اس تعلق شورائیت کی بنا پر اگر کوئی شخص نظام اسلام کو جمہوریت یا اسلامی جمہوریت کا نام دیدے تو بذات خود اس میں کوئی قباحت نہیں۔

لیکن شریعت کا ایک قانون ہے کہ اگر کسی نام اور اصطلاح کے دو مفہوم اور معانی ہوں اور ان میں ایک معنی از روئے اسلام غلط اور ناجائز ہو، اور ایک معنی صحیح اور درست ہو، تو مسلمان کے لئے لازم ہے کہ اس نام یا اصطلاح کے استعمال سے اجتناب کرے۔ کیونکہ مسلمان اگرچہ اس کے صحیح اور درست معانی مراد لے گا مگر کوئی غیر اس کو غلط معانی اور مفہوم پر حمل کرے گا۔ لہٰذا مسلمان پر لازم ہے کہ ایسے ناموں اور اصطلاحات کی جگہ کوئی ایسا نام یا ایسی اصطلاح استعمال کرے جس میں غلط معانی اور مفہوم کی سرے سے گنجائش ہی نہ ہو۔

مثلاً عربی کا ایک لفظ ہے "راعنا" اس لفظ کا عربی میں مفہوم یہ تھا کہ ہماری رعایت کیجئے۔ صحابہ کرامؓ یہ لفظ عموماً ایسے موقعہ پر نبی اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر عرض کرتے جب وہ حضور ﷺ کی کسی بات کو نہ سمجھ پاتے تو کہتے "راعنا" ہماری رعایت اور لحاظ کیجئے۔ یعنی دوبارہ فرمایئے یا ہماری طرف توجہ فرمایئے۔ مگر یہود کی زبان میں اس لفظ کو احمق، متکبر یا بددعا "سنو خدا تجھے نہ سنائے" کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ نیز یہود جب حضور ﷺ کی مجلس میں اس لفظ کو استعمال کرتے تو دبی زبان میں عین (ع) کی زیر کو کھینچ کر "راعینا" ادا کرتے جس کے معنی ہیں "ہمارا چرواہا" یعنی ہمارا "بیوقوف" نعوذ باللہ۔

چنانچہ حکم ربانی نازل ہوا کہ:

یایھا الذین آمنوا لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا ○

(البقرہ۔ آیت: ۱۰۴)

"اے ایمان والو (حضور ﷺ سے گفتگو کرتے وقت) راعنا نہ کہا کرو انظرنا کہا کرو"۔

دیکھئے قرآن کریم نے مسلمانوں کو ایسے الفاظ کے استعمال سے منع فرمایا ہے، جن کا کوئی غلط اور کافرانہ معنی بھی مراد لیا جاسکتا ہو۔ اور اس کی جگہ کوئی دوسرا ایسا لفظ استعمال کرنے کا حکم دیا ہے، جس میں کسی غیر اسلامی معنوں کی گنجائش نہ ہو۔ اس قرآنی حکم سے مفسرین نے ایک قانون بنایا کہ جو الفاظ اپنے اندر صحیح معانی کے ساتھ ساتھ کسی فاسد معنی کا احتمال رکھتے ہیں، ایسے الفاظ کے استعمال سے اجتناب کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔ اگرچہ وہ انہیں نیک نیتی اور صحیح معنی میں استعمال کرتے ہوں۔

چنانچہ مفسر قرآن علامہ شوکانیؒ اپنی مشہور تفسیر "فتح القدیر" میں اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:

وفی ذالك دلیل علی انه ینبغی تجنب الالفاظ المحتملة للسب والنقص وان لم یقصد المتکلم بها ذالك المعنی المفید للشتم سدا للذریعة ورفعا للوسیلة وقطعا للمفسدة. (تفسیر فتح القدیر جلد۱، صفحہ ۱۳۴)

"اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ پرہیز کریں ایسے الفاظ کے استعمال سے جن کے اندر فاسد معنوں کا احتمال ہو اگرچہ کلام کرنیوالے کی نیت میں برائی نہ ہو تاکہ برے معانی کا سدباب ہو اور فساد کی جڑ کٹ جائے"۔

اسی طرح حضور ﷺ نے کئی ایسے اسماء اور الفاظ سے ممانعت فرمائی ہے، جن کے معنوں میں کسی فاسد معانی کی گنجائش ہو۔ مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا "لا تقولوا عبدی ولکن قولوا فتایا...... " "یعنی اپنے غلام کو عبدی نہ کہو بلکہ میرا جوان کہو"۔ اس اصول اور قاعدہ

کے تحت مسلمانوں کو چاہئے کہ دین اسلام کے لئے نیک نیتی سے بھی جمہوریت کا نام استعمال کرنے سے اور اس کے لاحقے اور سابقے سے قطعاً اجتناب کریں۔

خاص کر آج کے دور میں جب کہ دین جمہوریت کے مکروہ چہرے سے پردہ اٹھ چکا ہے بلکہ جمہوریت کے لفظ کی جگہ دین اسلام کے لئے اسلامی نظام یا اسلامی شریعت یا اسلامی شورائیت جیسے الفاظ اور اصطلاحات استعمال کیا کریں۔

سوال نمبر ۱۵

کہا جاتا ہے کہ اگر جمہوریت غیر اسلامی عمل ہوتا تو اس کے طفیل پاکستان جیسا اسلامی ملک کیوں وجود میں آتا؟

جواب :

یہ دعویٰ غلط ہے کہ پاکستان جمہوریت کے جذبے کے تحت بنا ہے۔ اگر پاکستان کو وجود میں لانے کی غرض وغایت دین جمہوریت قائم کرنا ہوتی تو پھر متحدہ ہندوستان کی تقسیم کی نوبت کیوں پیش آتی۔ کیونکہ ہندو بھی تو جمہوریت چاہتے تھے اور آج بھی وہاں جمہوریت ہی ہے۔ بلکہ وہ نعرہ شاید آج بھی لوگوں کے حافظہ میں گونج رہا ہوگا، جس کے جذبے کے تحت پاکستان بنانے کے لئے برصغیر کے مسلمانوں نے بے دریغ جانی اور مالی قربانیاں دیں۔ وہ نعرہ تھا "پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ" انصاف کیجئے کہ یہ کلمہ طیبہ دین اسلام کا عنوان ہے یا دین جمہوریت کا۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان بنانے کا یہ اساسی نعرہ ان لوگوں کے منہ پر ضرب کاری ہے۔ جو کہتے ہیں کہ پاکستان مغرب کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے لئے یا مشرق کی اشتراکی جمہوریت کے لئے بنا تھا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان اگر بنا تو اسلام کے نام پر بنا اور جب ٹوٹا تو جمہوریت کے نتیجے میں اور دو عظیم جمہوری پارٹیوں اور ان کے جمہوری قائدین

کی رسہ کشی کی نحوست سے ٹوٹا۔ (سانحہ سقوط مشرقی پاکستان)

اگر بالفرض مان لیا جائے کہ پاکستان جمہوریت کے طفیل وجود میں آیا تھا، تو بھی یہ ضروری نہیں کہ ایک چیز جب کسی امر خیر کے لئے ذریعہ بنے تو وہ چیز بھی بذات خود خیر اور اچھی ہو۔

امام بخاریؒ نے اس مسئلہ پر مستقل باب قائم کیا ہے جس کے تحت یہ حدیث شریف درج کی ہے۔

باب ان الله یؤید الدین بالرجل الفاجر

عن ابی هریرة قال شهدنا مع رسول الله ﷺ فقال لرجل ممن یدعی بالاسلام هذا من اهل النار فلما حضر القتال قاتل الرجل قتالا شدیدا فاصابته جراحة فقیل یا رسول الله الذی قلت له انه من اهل النار فانه قد قاتل الیوم قتالاً شدیدا وقدمات فقال النبی ﷺ الی النار قال فکاد بعض الناس ان یرتاب فبینماهم ذالك اذ قیل انه لم یمت ولکن به جراحا شدیدا فلما کان من الیل لم یصبر علی الجراح فقتل نفسه فاخبر النبی ﷺ بذالك فقال الله اکبر اشهد انی عبد الله ورسوله ثم امر بلالا فنادی فی الناس انه لا یدخل الجنة الا نفس مسلمة وان الله لیؤید هذا الدین بالرجل الفاجر. (بخاری جلد ۱، صفحہ ۴۳۰)

"باب ہے اس میں کہ اللہ دین اسلام کی مدد فاسق وفاجر شخص سے بھی کراتا ہے"

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ہم حضور ﷺ کے پاس موجود تھے آپ ﷺ نے ایک شخص کے بارے میں فرمایا جو مسلمان کہلاتا تھا کہ یہ شخص جہنمی ہے، پھر جب جہاد شروع ہوا تو اس شخص نے کافروں کے خلاف سخت جنگ لڑی اور زخمی ہوا۔ کسی نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول جس کے متعلق آپ نے جہنمی ہونے کی بات کی تھی اس نے تو

زبردست جنگ لڑی اور قتل ہوا۔ حضور ﷺ نے فرمایا جہنم میں گیا۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ اس بات کے سبب قریب تھا کہ بعض لوگ شک میں پڑ جاتے اسی اثنا میں کہا گیا کہ وہ آدمی مرا نہیں بلکہ سخت زخمی ہوا تھا۔ جب رات ہو گئی تو اس شخص نے زخموں کی تاب نہ لا کر خودکشی کرلی۔ جب حضور ﷺ کو اس کی خودکشی کی خبر دی گئی تو آپ نے فرمایا اللہ اکبر، میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں، پھر بلال سے منادی کرائی کہ "سنو مسلمان ہوئے بغیر کوئی شخص جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اور بے شک اللہ دین اسلام کی مدد فاجر انسان سے بھی کراتا ہے"۔

لہٰذا اگر جمہوریت کی وساطت سے کوئی خیر وخوبی وجود میں آجائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جمہوریت ایک اسلامی عمل ہے۔

سوال نمبر ۱۶

کیا اسلام کے نظام حکمرانی کا کوئی مدون اور عملی نمونہ موجود ہے؟

جواب :

یقیناً موجود ہے اگر موجود نہ ہوتا تو رہتی دنیا آج تک دور فاروقی جیسے عدل وانصاف کے لئے نہ ترس رہی ہوتی۔ نظام اسلامی کے لئے اللہ تعالیٰ جیسی رحیم ورحمٰن ذات کے نازل کردہ اصول وقوانین آج اس پندرھویں صدی میں بھی قرآن وسنت کی صورت میں بلا کم وکاست جوں کے توں محفوظ ہیں۔ اسلامی علوم کے ماہرین نے ان اصول وقوانین کو منضبط اور ترتیب دار شکل میں مدون کیا ہے، جو کہ آج بھی نظام حکمرانی کے سیاسی، انتظامی، عدالتی، تعزیراتی، مالی واقتصادی، عسکری اور خارجہ پالیسی کے ہر شعبے پر "قابل قدر مجلات" اور قوانین کے نمبر دار مجموعوں کی صورت میں دستیاب ہیں۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کفر واستعمار نے جن اسلامی ممالک میں غلبہ حاصل کیا

وہاں انہوں نے بنیادی طور پر کوئی نیا نظام، قانون نافذ نہیں کیا بلکہ اسی اسلامی قانون میں ایسی ترامیم کر دی ہیں، کہ اسی کو کافرانہ بنادیا ہے۔ اگر دیانت و ایمانداری سے مسلمان اسکالر اور ماہرین شریعت ان قوانین کی کافروں کی کافرانہ ترمیمات سے تطہیر اور چھانٹی کا کام شروع کر دیں تو بہت جلد مروّجہ قوانین قضاء و تعزیرات اسلامی بنائے جاسکتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۷

کیا حقیقی اسلامی نظام کا نفاذ آج کل ممکن ہے؟

جواب :

مکمل نظامِ اسلام کا نفاذ ہر دور میں ممکن ہے، مگر اس کے لئے قربانیاں دینا شرط ہے۔

بلکہ یہ بنیادی اصول ذہن نشین کیجئے کہ ہر بلندی، ترقی اور کمال (خواہ مادی ہو یا روحانی، جسمانی ہو یا اخلاقی اور صفاتی) کے لئے محنت، مشقت اور جدو جہد اسی کمال اور عروج کی مناسبت سے کرنا پڑتی ہے۔ اس کے برعکس تنزل اور پستی میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ فطرت کا ایک اٹل قانون ہے۔ چھوٹے بچے کو دیکھیں دن بھر کھیل کود میں اسے مشقت تو کیا بلکہ مسرت حاصل ہوتی ہے، مگر مکتب جانے میں اسے گویا پہاڑ سر پر اٹھانا پڑتا ہے۔ کسی بھی تعلیمی اور فنی ڈگری کے حصول کے لئے ۱۵۔ ۲۰ سال تک خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ پاک و ہند میں دین جمہوریت کی آمد کو نصف صدی کا عرصہ ہو گیا ہے۔ مگر نہ صرف پاکستان میں بلکہ ہندوستان جیسی خالص سیکولر اسٹیٹ میں بھی ہر الیکشن کے موقع پر کتنی قیمتی جانیں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے مظاہروں، جلوسوں اور فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں، کتنی توڑ پھوڑ اور جائیدادوں کا ضیاع ہوتا ہے۔ اسی سوشلزم، کمیونزم کے نفاذ کے لئے (اس کے پیروکاروں کو) کروڑوں انسانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا ہے۔ تفصیلات کے شائقین میری تالیف "جہاد افغانستان" پڑھیں۔ تو معلوم ہو کہ کسی معاشرے کے لئے اسلامی نظام کے بلند

ترین مقام اور معراج پر فائز ہونا بغیر قربانیوں کے کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟

سوال نمبر ۱۸

اسلام میں حکمرانی کا بہتر نظام موجود ہے، تو پاکستان کا اسلامی معاشرہ ہر انتخاب میں علماء اسلام کو کیوں مسترد کرتا ہے نیز صدر ضیاء مرحوم کو کیوں ناکامی ہوئی؟

جواب :

قدرت کا ایک فطری قانون ہے کہ ہر چیز (خواہ جاندار ہو یا غیر جاندار) غیر ارادی طور پر ماحول کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ سبزہ زار کے کیڑے مکوڑوں اور پرندوں کو دیکھئے بلاریب سبز ہوں گے بجز چند ایک کے۔ سنگلاخ، پہاڑی علاقوں، بیابانوں اور ریگستانی علاقوں کے حیوانوں کو دیکھئے ماحول کے رنگ میں اس شدت سے رنگے ہوتے ہیں کہ اگر وہ کسی جگہ جامد اور ساکن ہو کر بیٹھ جائیں تو آپ کو نظر نہیں آئیں گے، اگرچہ آپ اس کے پاس کھڑے ہوں۔ اور یہ بھی ایک مسلم اصول ہے کہ ظاہری ماحول کا اثر غیر ارادی اور لاشعوری طور پر انسان کے ذہن اور دل و دماغ پر اس شدت سے ہوتا ہے کہ اس سے اپنے آپ کو بچانا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

اگر کسی جگہ میت پر ماتم، نوحہ اور گریہ وزاری کا ماحول بن چکا ہو اور اس ماحول میں کوئی اجنبی شخص آجائے تو اس کا ہنسنا اور قہقہہ لگانا ناممکن ہو جاتا ہے، اگرچہ اس سے پہلے اس کے دل و دماغ خوشی اور سرور سے لبریز ہوں بلکہ غیر ارادی طور پر اسے غمزدہ ہونا پڑے گا۔ یہی کیفیت کسی محفل سرور کے ماحول میں آنے والے کی ہو گی کہ اس پر خوشی اور سرور کی کرنیں پڑیں گی۔

پاکستانی معاشرے پر دین جمہوریت کا رنگ و روغن

پاکستانی معاشرے میں ایک طرف تو اندرونی طور پر حزب اختلاف اور حزب اقتدار بلکہ ہر سیاسی پارٹی کے لیڈر بشمول کئی نامور علماء اسلام کے دن رات تقریروں اور تحریروں میں صرف ایک راگ الاپتے پھرتے ہیں، کہ غریب، محنت کش اور مظلوم عوام کی جملہ مصیبتوں کا واحد علاج جمہوریت ہے۔ اور دوسری طرف جمہوریت کی آزادی تقریر و تحریر کے بل بوتے پر اسلام دشمن قوتیں اعلانیہ طور پر دین اسلام اور اس کے علمبردار علماء کے خلاف توہین آمیز پروپیگنڈہ میں سرگرم عمل ہیں۔ عورتیں جو کہ نصف آبادی سے زیادہ ہیں انہیں گمراہ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ اگر مولویوں کی حکومت آگئی تو تمہیں گھر کی چار دیواری میں قید کر دیں گے، تمہاری گواہی مرد کی گواہی سے آدھی سمجھی جائے گی، تمہیں میراث میں مرد سے آدھا حصہ ملے گا، تمہارے خاوند چار چار بیویاں رکھیں گے اور علماء ان باتوں کی تردید نہ تو جمہوریت کے ماحول میں کر سکتے ہیں، اور نہ کرنا چاہتے ہیں، اس لئے کہ انہیں عورتوں سے ووٹ لیکر ممبر بننا ہوتا ہے۔ تو کیوں عورتوں کی ناراضگی مول لیں۔

اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ جمہوریت پرستوں کے دوش بہ دوش علماء صاحبان بھی جمہوریت کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، اور اسلام پر جمہوریت پرستوں کے حملے کے وقت یہ حضرات ممبری کے لالچ میں خاموش ہو جاتے ہیں۔

اخبار جنگ میں بیگم ریحانہ سہگل نے مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کو ان کی اس وکالت پر جو انہوں نے جدت پسند عورت کی حمایت میں کی بطور داد "ترقی پسند مولانا" کے لقب سے نوازا۔ (جنگ لاہور ۶ مارچ ۱۹۹۲ء صفحہ ۲، کالم ۴)

اس پر مزید شومئی قسمت دیکھئے کہ اسی دین جمہوریت نے ایک ہی مذہب اور مسلک کے نامور علماء کرام کا شیرازہ بکھیر دیا۔ چنانچہ ۱۹۹۰ء کے الیکشن میں خالص مذہبی جماعتوں

کے نامور علماء کا کئی ایک سیٹوں پر براہِ راست مقابلہ رہا۔

بیرون ملک سے دین جمہوریت کے بڑے بڑے بت پاکستانی معاشرے کا ذہن دین جمہوریت کے سانچے میں ڈھالنے اور دین اسلام کے خلاف بنانے میں جملہ ممکنہ ذرائع استعمال کر رہے ہیں۔ اس جمہوری ماحول میں اسلام کے علمبرداروں کا عوامی سطح پر مسترد ہونا یا صدر ضیاء الحق مرحوم کا ناکام ہونا بالکل فطری اور منطقی بات ہے۔ اسلامائزیشن کی پالیسی کا یہ عمل اور نتائج اس بنا پر نہیں کہ نعوذ باللہ پاکستانی مسلمان دین اسلام سے بیزار ہیں، یا وہ اسلام کے نظام، اسلام کی افادیت کے منکر ہیں، بلکہ سب کچھ ماحول کے فطری قانون کا نتیجہ ہے یعنی دین جمہوریت کے ماحول کا ایک فطری رنگ ہے جس میں معاشرہ رنگ چکا ہے اور جب تک یہ ماحول ہو گا یہی نتیجہ برآمد ہوتا رہے گا۔

نفاذ اسلام کا طریقہ کار

سوال نمبر ۱۹

وہ کونسا طریقہ ہو گا جس کے نتیجہ میں نظام اسلامی کامیابی سے اصلی شکل میں نافذ ہو سکے؟

جواب :

یہ طریقہ مروّجہ جانے پہچانے طریقوں سے ہٹ کر بالکل نیا انقلابی طریقہ ہو گا جس کے متعلق حضور ﷺ نے پیشین گوئی فرمادی ہے۔

بدء الاسلام غریبا وسیعود غریبا کما بدء فطوبیٰ للغرباء۔

امام لغت القرآن علامہ راغب اصفہانی لفظ "غریب" کی تشریح یوں کرتے ہیں۔

کل متباعد غریب و کل شیء فیما بین جنسہ عدیم النظیر غریب وعلی

هذا قوله علیه السلام بدء الاسلام غریبا وسیعود کما بدا.

(المفردات للراغب الاصفہانی مادہ (غرب) صفحہ ۳۶۴)

"ہر وہ چیز جو لوگوں کی رسائی اور سمجھ سے بالاتر ہو اس کو غریب کہا جاتا ہے، اور ہر وہ چیز جو اس کی ہم جنس چیزوں میں لاثانی اور بے مثال ہو غریب کہلاتی ہے۔ اور اسی معنی کے لحاظ سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کی ابتدا جس نادر اور انوکھے طریقے سے ہوئی تھی اس کی انتہا بھی ابتدا جیسی ہوگی پس خوشخبری اور مبارکباد ہے ان کے لئے جنہوں نے اس غریب طریقے کو اپنایا"۔

اس حدیث کے بہت سے اسرار میں سے جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے، کہ انقلاب اسلامی لانے اور دین اسلام کے پھیلنے پھولنے کی ابتداء جس غیر معروف، نادر اور انجانے طور طریقے سے ہوئی انتہاء میں بھی دین اسلام کے پھیلنے پھولنے اور اسلامی انقلاب لانے کے لئے وہی طریقۂ کار اپنانا ہوگا۔

دین اسلام کی انوکھی اور غریب ابتدا کی ایک جھلک

اسلام کی ابتدا سے پہلے کرۂ ارض پر اور خاص کر سرزمین عرب اور اس کے قرب وجوار میں جتنے ادیان اور نظام ہائے زندگی عملاً نافذ تھے۔ خواہ آسمانی تھے یا انسانی وہ سب اصولی لحاظ سے تین قسموں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ توحید کے علمبردار، اہل کتاب یہود ونصاریٰ۔

۲۔ شرک کے علمبردار، عرب بشمول عجم۔

۳۔ دہریت کے قائل۔

ان سب کا سیاسی نظام زندگی بھی اصولاً تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ آمریت : جس کے زمرے میں شہنشاہیت، پاپائیت اور سرداری نظام وغیرہ

آتے ہیں۔

۲۔ جمہوریت : یونان کی جمہوریت سے لیکر عرب قبائل کے قبائلی نظام جمہوریت تک۔

۳۔ اباحیت : اشتراکی نظام۔

تاہم ان مختلف ادیان، مذاہب اور نظام ہائے حکمرانی میں جو چیز قدر مشترک تھی وہ تھی وقت اور حالات کے تقاضوں کے ساتھ مصلحت کے لئے کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی کے تحت ہم آہنگی پیدا کرنا یا دوسرے الفاظ میں "جیو اور جینے دو" کے اصول کے تحت زندگی گزارنا۔

اہل کتاب میں سے عیسائیوں کی توحید کو دیکھئے۔ جیسے عقیدہ تثلیث یعنی تین خداؤں کو ماننے کا عقیدہ اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کا بیٹا ہے، یہود کی توحید کہ عزیز علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے۔ مشرکین مکہ کہتے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، اور مشرکین جب سخت مشکلات میں پھنستے تو خالص توحید اپناتے اسی طرح جمہوریت اور ملوکیت بھی خود غرضی کے لئے مصلحت اور کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی پر گامزن تھی اور ہے۔

دین اسلام نے اپنی ابتدا میں انسانوں کے جملہ جانے پہچانے مذاہب، ادیان، سیاسی نظاموں اور ازموں کے سروں کو لا الہ الا اللہ کی تلوار کی پہلی ضرب سے قلم کر کے رکھ دیا۔ "لا الہ" کا مطلب یہ کہ کسی کو حکمرانی کا حق نہیں، کسی کے لئے اقتدار اعلیٰ نہیں، کسی کو قانون بنانے کا حق نہیں، کوئی طاقت کا سرچشمہ نہیں، کہیں صداقت نہیں، کوئی جائز و ناجائز بنانے والا نہیں، اور کوئی معبود و آقا نہیں "الا اللہ" بجز اللہ کے۔

چونکہ اس اعلان نے ہر اعلیٰ اور ادنیٰ، مرد اور عورت، آقا اور غلام خواہ وہ کسی بھی پیشے سے متعلق تھا کی حریت اور آزادی یہاں تک ختم کر دی کہ کسی کو اپنی جان و مال، بیوی اور اولاد میں بھی کوئی اختیار نہیں، تمام اختیارات کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان اسکا عبد (غلام)

ہے وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اختیارات نیابتاً استعمال کرے گا۔ البتہ انسان انسان کی غلامی سے آزاد اور حر ہو گا۔ یہی تھی وہ عجیب و غریب، نادر اور انوکھی ابتدا جسے سنتے ہی مختلف ادیان، مذاہب، اور مختلف سیاسی نظریات رکھنے والے مردوزن، بوڑھوں، نوجوانوں، غریبوں اور امیروں کے ہر طبقے اور افراد نے اجنبی جان کر رد کیا۔

چنانچہ وہ کہتے تھے کہ:

اجعل الالھة الھا واحدا ان ھذا لشیء عجاب ○

(سورہ ص۔ آیت: ۵)

"کیا اس نے (پیغمبر نے) جملہ معبودوں اور حاکموں کے بدلے صرف ایک معبود و حاکم بنادیا بے شک یہ بڑی عجیب اور انوکھی بات ہے"۔

ما سمعنا بھذا فی الملة الآخرة ان ھذا الا اختلاق ○

(سورہ ص۔ آیت: ۷)

"ہم نے تو اس سے پہلے ایسی عجیب و غریب بات کسی بھی دوسرے دین اور ازم میں نہیں سنی یہ تو ایک خود ساختہ بات ہے (یہ حضور ﷺ کی طرف ویسی ہی نسبت ہے جس طرح آج کل ترقی پسند لوگ کہتے ہیں یہ ملاؤں کے ملاازم کی باتیں ہیں)"۔

جب حضور ﷺ کو کافروں نے کچھ لو اور کچھ دو کی پیشکش کی

قال الذین لا یرجون لقاءَ نا ایت بقرآن غیر ھذا او بدلہ قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی ○

(یونس۔ آیت: ۱۵)

"وہ لوگ کہتے ہیں جنہیں ہم سے ملاقات کی امید نہیں کہ اس کے سوا کوئی

اور قرآن لے آ، یا اسے بدل دے (اس میں ترمیم کرلے) تم کہہ دو کہ
میرا کام نہیں کہ اپنی طرف سے ترمیم کر کے اسے بدل دوں میں تو اسی
دین کی تابعداری کرتا ہوں جسے میری طرف وحی کیا جاتا ہے"۔

دین اسلام کی انوکھی اور غریب ابتدا کی دوسری جھلک

تاریخ انسانیت میں آج تک جتنی تحریکیں چلی ہیں وہ عموماً انگور کی بیل کی مانند کسی ظاہری خوشنما نعرے اور سہارے کے بل بوتے پر پھلی پھولی ہیں۔ حالانکہ ان میں ذاتی طور پر اتنی قوت اور خوبی نہیں ہوتی تھی کہ اپنے پاؤں پر کھڑی رہ سکیں۔ مثلاً کسی نے قومیت اور وطنیت کا دلکش اور مرغوب نفس ابلیسانہ نعرہ بلند کر کے نیشنلزم اور قوم پرستی کا سہارا لیا۔

اور کسی نے عوام کو حاکم بنانے، یا حریت عامہ، عمومی آزادی دلانے اور ہر انسان کو اپنی مرضی کے مطابق بلا روک ٹوک مالک بنانے کے سبز باغ دکھائے اور جمہوریت کا نعرہ بلند کیا۔

کسی نے مفت خور، فضول خرچ اور بے ہمت لوگوں کو مفت دولت اور جائیدادیں، دولت مندوں سے دلوانے کے سبز باغ دکھا کر انہیں سوشلزم کے نام سے مسحور کیا، تو کسی نے سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور سرداروں کو خرید کر آمریت اور ملوکیت قائم کی۔ اور بعض لوگوں نے مذہب اور روحانیت کے نام پر جنت کے ٹھیکیدار بن کر سوداگری کے جال پھیلائے۔ یہ لوگ احبار اور رہبان، چرچ اور کلیسا یا پاپائیت کے مختلف ناموں سے متعارف ہوئے۔ جنہوں نے خواہشات نفس کی تکمیل کے لئے ہر برائی سے مصلحت کی راہ اختیار کی اور ہر ظلم کو روا رکھا۔

حضور ﷺ کو دعوت اسلام کے لئے یہ تمام مواقع میسر تھے۔ قومیت کا جذبہ عرب قوم میں مقابلتاً عجم سے زیادہ بھرپور انداز میں موجود تھا، جب کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ عرب کے

زرخیز علاقوں یمن، شام وغیرہ اور تجارتی شاہراہوں اور بندرگاہوں پر روم اور فارس کے عجم قابض تھے۔ عوام کی اکثریت قبائلی سرداروں (شیوخ) کی غلامی میں افلاس اور ظلم کا شکار تھی۔

حضور ﷺ کو اللہ نے فصاحت وبلاغت اور بے مثال زور خطابت اور قوت بیان سے نوازا تھا۔ توحید کے نعرہ کے سوا آپ جو نعرہ بھی بلند کرتے عرب قوم کے جوشیلے نوجوان اور عوام آپ کے گرد جمع ہو جاتے اور پھر آپ بہ تدریج اس قوم کا رخ بڑی آسانی سے توحید کی طرف موڑ سکتے تھے یا کم از کم دعوت اسلام کے ساتھ کسی مرغوب نعرہ مثلاً اسلامی نیشنلزم یا اسلامی عربیت وغیرہ کی پیوندکاری کر کے عوام کا دل موہ سکتے تھے۔

مگر حضور ﷺ نے ان تمام مرغوب نفس بتوں اور طاغوتی ازموں کا سر قلم کر کے وحدہ لاشریک کا اعلان کیا اور بظاہر اختلاف کی ایسی فصیل کھڑی کر دی کہ عزیز ترین رشتہ دار بھی کٹ کر اجنبی ہو گئے۔ دین اسلام کا یہ ابتدائی طریقۂ کار بھی اتنا غریب اور نادر تھا کہ اس وقت تو کیا آج بھی ایسی خود اعتمادی اور استغناء و توکل کی مثال کوئی تحریک اور ازم پیش نہیں کر سکتی۔

اسلام کی رکن سازی کا معیار غریب اور انوکھا ہے

عموماً کوئی انقلاب لانے کے لئے بیرون ملک اور اندرون ملک سازش کر کے عسکری قوتوں یا اثر ورسوخ کے ارباب کو ہمنوا بنایا جاتا ہے۔ مگر حضور ﷺ کو اس مرحلے پر عجیب وغریب ہدایات ملیں، کہ آپ تحریک اسلام کی رکنیت سازی میں کسی کی جاہ وجلال اثر ورسوخ، دولت اور ثروت کو ہرگز معیار نہ بنائیے بلکہ اسلام کے ساتھ عقیدت، اخلاص اور قربانی دینے کا جذبہ معیار بنا کر ایسے افراد کو ڈھونڈ کر جمع کریں جو اپنی زندگی تک کو تحریک اسلام پر قربان کرنے کو حقیقی کامیابی اور دائمی زندگی سمجھیں خواہ ایسے افراد بلال حبشیؓ،

صہیبؓ رومی جیسے غلام یا ابن ام مکتوم جیسے اندھے ہی کیوں نہ ہوں۔

اسلام کا پھلنا پھولنا بھی عجیب و غریب تھا

کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لیے اس عالم اسباب میں جو چیز شرط اوّل سمجھی جاتی ہے وہ ہے ظاہری اسباب کا مناسب طور پر مہیا ہونا۔

مگر تحریک اسلام کی مثالی کامیابی اور اس کے پھلنے پھولنے کے لئے پوری اسلامی تاریخ میں آپ کو کہیں یہ چیز نظر نہیں آئے گی، بلکہ الثاہر جگہ ظاہری اسباب اسلامی تحریک کی ناکامی کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ بطور خرق عادت، معجزات اور کرامات کے غیب کی طرف سے ہر جگہ اسلام کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے۔

اسلام کو سینے سے لگانے والے بھی عجیب و غریب صفات کے لوگ تھے

آج کل کی سیاست میں کامیاب اور عاقل ترین شخص وہ ہے، جو اپنوں اور پرایوں میں ہر دلعزیز اور مقبول ہو یا آج کل کی اصطلاح میں غیر جانبدارانہ روش اور پالیسی پر گامزن ہو، ایسی روش رکھنے والے کو "اعتدال پسند" جیسے خوش نما لقب سے یاد کیا جاتا ہے، شاید حافظ شیرازی نے اسی پالیسی کے متعلق فرمایا ہے:

ے با مسلمان اللہ اللہ با برہمان رام رام

قرآن کریم اس روش کو یوں تعبیر کرتا ہے "مذبذبین بین ذالك لا الی هؤلاء ولا الی هؤلاء" یعنی نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ شاید اسی مصلحت کے پیش نظر بنیاد پرستی کے الزام سے بچنے کے لئے، اور اعتدال پسندی کے اعزاز کے حصول کے لئے "اسلامی

سوشلزم" اور "اسلامی جمہوریت" کی جدید اصطلاحات ایجاد کی گئیں۔ مگر مروّجہ اور معروف روش سے ہٹ کر صحابہ کرام نے عجیب اور نرالی شان اپنائی تھی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

محمد رسول اللہ والذین معہ اشدآء علی الکفار رحمآء بینھم۝

(الفتح۔ آیت: ۲۹)

"محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں کفار کے بارے میں بہت سخت ہیں آپس میں رحم دل ہیں"۔

ایک لطیف نکتہ :

صحابہ کرام کی ان نرالی صفات (کہ کافروں کے لئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں اور آپس میں شیر و شکر ہیں) کے سورہ الفتح میں ذکر سے اس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے، کہ کفر پر فتح اور غلبہ کے حصول کے لئے بنیادی صفات یہی (اشدآُ علی الکفار رحمآُ بینھم) دو ہیں۔

کفر پر غلبہ اور فتح کے حصول کے لئے اسلام کا عجیب و غریب طریقہ

کسی قوت اور تہذیب کو شکست دینے اور اس پر فتح حاصل کرنے کے لئے عموماً جس طریقہ کو مؤثر ترین اور بہت بے ضرر سمجھا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ پہلے دشمن کی قوت کو اندر سے کھوکھلا کیا جائے۔ اس غرض کے حصول کے لئے اپنوں کو دشمن کی شکل وصورت میں دشمن کے اندر داخل کیا جائے، اور پھر اندرونی طور پر مختلف ہتھکنڈوں سے اسے گزند پہنچا کر کمزور کیا جائے۔ اس طریقہ مقابلہ کو گوریلا جنگ کہا جاسکتا ہے، یعنی دشمن کا دشمن کے ہتھیار سے مقابلہ کیا جائے۔ علی گڑھ کالج کے بانی سر سید احمد خان نے بظاہر اسی نظریہ کے تحت

مسلمانوں سے کہا تھا کہ انگریز کے مقابلہ کے لئے ضروری ہے، کہ مسلمان ہوتے ہوئے
خالص انگریزی تعلیم، انگریزی تہذیب کو کامل خدوخال کے ساتھ اپناؤ۔ اور مصطفی کمال
اتاترک بھی اسی نظریہ کے حامی تھے۔

مگر اس روش کی خامی یہ ہے، کہ اگر دشمن پر غلبہ اور فتح حاصل ہو بھی جائے تو بھی یہ
خطرہ ہوتا ہے، کہ اپنے لوگ دشمن کا رنگ لے کر فتح کے بعد مفتوح دشمن کی نقل اور فوٹو
اسٹیٹ نہ بن جائیں۔

چنانچہ اس کے لئے اسلام نے یہاں بھی غریب اور انوکھی روش اپنائی، وہ یہ کہ اسلام
نے اپنے پیروکاروں کو سختی سے حکم دیا کہ کافروں کی تہذیب، ان کا لباس، ان کی شکل
وصورت، ان کے رسم ورواج، ان کی نشست وبرخاست، ان کے میل میلاپ، ان کی دوستی
ورشتہ داری اور ان کے بودوباش تک سے ہجرت کر کے الگ تھلگ رہ کر مقابلہ کرو۔ حضور
ﷺ نے ہدایت کی "خالفوا الیهود والمشرکین" یہود اور مشرکین کے خلاف کیا کرو۔

قصہ کوتاہ :

دین اسلام نے تمام مراحل کی ابتدا ایک ایسے غریب ونادر انداز میں کی ہے، جس
سے انسانیت نہ اس زمانہ میں آشنا اور مانوس تھی اور نہ آج مانوس ہے۔

آج کل اسلامی انقلاب لانے کے لئے جب تک وہی تمام مراحل نہ اپنائے جائیں
جس کی طرف حضور ﷺ اشارہ فرما چکے ہیں، تب تک اسلامی نظام کا قیام ممکن نہیں۔

باب نوزدہم

نفاذ اسلام کے لئے قوت نافذہ کا وجود شرط ہے

نبی کریم ﷺ نے مکی دور نبوت میں اسلام کی قانون سازی کے کام، یا اس کے فوائد و مصالح کو قطعاً نہیں چھیڑا، بلکہ اسلام کے لئے ذہن سازی کے کام اور عقائد پر زور دیا اور دائرہ اسلام کے لئے شرط لگا دی کہ اسلامی عقائد اور اللہ کی حاکمیت کے سوا باقی سب کچھ طاغوتیت ہے۔

۱۔ لہٰذا آج علماء اسلام کو تمام مصلحتیں اور سیاستیں بالائے طاق رکھ کر ”لا الہ الا اللہ“ کی تلوار سے جملہ طاغوتی نظاموں اور ان کی پیوند کاریوں کے سر قلم کر کے خالص نظام اسلام کے لئے عوام کی ذہن سازی شروع کرنی ہوگی۔

۲۔ علماء کرام اور ان کے پیروکاروں کو جمہوریت کی برائیوں کی وجہ سے اس کی اچھائیوں سے بھی پرہیز کرنا ہوگا۔ جیسے شراب کے نفع سے اس کے نقصان کے سبب پرہیز کیا جاتا ہے۔

۳۔ جمہوریت کے لفظ سے اجتناب کرنا ہوگا، اور جمہوریت کے جملہ موہومہ فوائد کی جگہ نظام شریعت اور اس کے حقیقی فوائد سے لوگوں کو متعارف کرانا ہوگا۔

۴۔ عامۃ المسلمین کی ذہن سازی اس طرح کرنا ہوگی، کہ ملک میں اسلامی نظام لانے کے لئے حکومت اور اقتدار خالص اور مکمل مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے، یعنی ایسے افراد بر سر اقتدار آجائیں۔ وہ افراد کیسے ہوں تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

(الف) جن کا ایمان و یقین ہو کہ مسلمانوں کے لئے قرآن و سنت کے برخلاف لمحہ بھر کے لئے کسی اور نظام کے تحت کام کرنا قرآن و سنت اللہ و رسول سے غداری ہے۔

(ب) ان کا یہ بھی ایمان و یقین ہو کہ نظام زندگی اور نظام حکومت کے کسی بھی شعبہ میں شریعت کے خلاف کسی بھی ازم اور انسانوں کے بنائے ہوئے نظام کے قوانین کا اجرا یا اس کے تحت کام کرنا "عملی کفر" ہے۔

(ج) انہیں نظام حکمرانی کے ہر شعبہ میں قرآن و سنت کے احکامات یعنی جائز و ناجائز اور حلال و حرام کا ضروری علم ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کسی اسلامی دارالعلوم کے فارغ التحصیل مولوی ہوں بلکہ قرآن و سنت کے مستند علوم کا ضروری علم رکھتے ہوں خواہ انہوں نے کسی بھی طریقے سے یہ علوم صحیحہ حاصل کئے ہوں۔

(د) ان کی صورت اور سیرت یعنی عملی زندگی میں اسلام کے بنیادی ارکان و فرائض کی موجودگی لازمی اور دائمی ہو، اور وہ بظاہر جملہ حرام اور قطعی ناجائز اعمال سے پرہیز و اجتناب کرتے ہوں۔

(ہ) ان کی تقریر و تحریر میں قرآن و سنت پر مبنی نظام اسلام کے برعکس کسی بھی دوسرے ازم اور نظام سے وابستگی، پرچار اور دعوت کی کوئی جھلک موجود نہ ہو۔

ان صفات سے موصوف انتظامیہ کا دوسرا نام "قوت اجرائیہ" یعنی اسلامی قوانین کو جاری کرنے والی قوت، یا "قوت نافذہ" یعنی اسلامی قوانین کو نافذ کرنے والی قوت ہے۔

۵۔ مروّجہ انتخابات میں ایسی تبدیلی لانا لازمی ہوگی، جس کے نتیجہ میں مذکورہ صفات کے حامل افراد کا برسر اقتدار آجانا یقینی ہو جائے۔

۶۔ مقننہ یعنی منتخب شوریٰ کی قانون سازی کے لئے شرط یہ ہوگی کہ اس کی اساس شرعی دلیل کی قوت اور صحت ہو۔ اکثریت برائے اکثریت کی کوئی شرعی حیثیت نہ ہو۔

مسلمان ملت کا ذہن مسلمان بنانا بہت آسان کام ہے

اللہ کا شکر ہے کہ آج بھی مسلمانوں کے ہر طبقہ زندگی میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے تڑپ رکھنے والوں کی کمی نہیں۔ اسلامی نظام کی علمبردار جماعتوں کے علاوہ سیاسی رہنماؤں، وکلاء، اساتذہ، طلباء، جج صاحبان اور مال دار طبقے میں یقیناً ایسے حضرات موجود ہیں، جو اسلام کو دل وجان سے چاہتے ہیں۔

اگر یہ حضرات چھوٹے فروعی مسائل اور ذاتی انا سے بالاتر ہو کر عوام کو اس بات کے لئے تیار کرنے کا متفقہ فارمولا اور طریق کار وضع کریں کہ جب تک انتخابات میں ایسی تبدیلی نہ لائی جائے، جس کے نتیجہ میں حقیقی مسلمان انتظامیہ (قوت اجرائیہ) برسر اقتدار آجائے تب تک مروجہ انتخابات کا بائیکاٹ سب کا ملی اور اسلامی فریضہ ہے، تو یقین جانئے کہ عامۃ المسلمین کو ایک سال کے اندر اندر اس کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ خواجہ ناظم الدین مرحوم کے دور اقتدار میں مختلف مکاتب فکر کے علماء نے پوری قوم سے اپنے مرتب کردہ ۲۲ نکات کی حمایت کا اعتماد حاصل کیا تھا۔

البتہ اگر کوئی مشکل مسئلہ ہے، تو وہ اسلام کی علمبردار جماعتوں کے عہدے داروں کا (محض نام کے) عہدوں پر متفق ہونا ہے، یا دوسرے لفظوں میں ان کا ذاتی مفادات کی قربانی دینا ہے۔ تو اس کے لئے کم از کم ممکنہ صورت یہ ہے، کہ تمام جماعتیں باری باری متحدہ شوریٰ کا کنوینر بدلتی رہیں۔ جیسا کہ ضیاء کے دور میں ایم آر ڈی نے کیا تھا۔ اگر اس پروگرام پر ابتدائی مرحلہ میں قابل قدر افراد جمع نہ بھی ہو سکیں تو بھی جتنے احباب اخلاص اور للہیت کے ساتھ متحد ہو جائیں وہی کافی سمجھے جائیں۔ یقیناً اس غریب ابتدا کا بھی غریب ٹولہ حضور ﷺ اور قرآن کی بشارت سے سرفراز ہوگا "فطوبی للغرباء"

"کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله"

دین اسلام نے اوّل قوت اجرائیہ مہیا کی پھر قانون سازی کی

حضور ﷺ نے تیرہ سالہ مکی زندگی میں قانون سازی کی بجائے پوری قوت ایک مخلص نظریاتی جماعت پیدا کرنے میں صرف کی۔ اور مدینہ منورہ میں اسی قوت نافذہ کے ذریعے فوراً ایک اسلامی ریاست عملاً قائم کی، پھر بتدریج دس سال کے عرصے میں قانون سازی کا کام مکمل کیا۔

آج ہمارے پاس قوانین اسلامی کا مکمل مجموعہ قرآن وسنت اور فقہاء امت کے اجماع کی صورت میں موجود ہے۔ نیز اجتہاد کے بارے میں اجماع امت کے قواعد وضوابط بھی موجود ہیں، اس لئے روزانہ قانون سازی کے لئے ادارے کمیٹیاں اور کمیشن بنانا ضیاع وقت کے سوا کچھ نہیں۔ موجودہ دستور اور آئین میں اسلامی دفعات موجود ہیں، مگر بے سود ہیں۔ اور ہر دفعہ ان پر بحث کرنے سے جھگڑے اور نزاع کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے ہے کہ اسلامی قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قوت نافذہ اور قوت اجرائیہ موجود نہیں ہیں، لہٰذا اگر انقلاب اسلامی لانا ہے تو قوانین سے پہلے قوانین کے نفاذ کے لئے حقیقی مسلمانوں کو جن کے اوصاف اوپر بیان ہو چکے ہیں برسر اقتدار لانا ہوگا۔

اسلامی قوت اجرائیہ کا اوّلین فریضہ

بین الاقوامی طور پر یہ ایک مسلمہ امر ہے، کہ ہر نظریاتی ملک کی انتظامیہ کے لئے شرط ہے کہ ان کا ظاہر اور باطن ملک کے بنیادی نظریے میں رنگا ہوا ہو۔ اس انتظامیہ کا پھر اوّلین فریضہ یہ ہوتا ہے، کہ ملک کے بنیادی نظریے کا تحفظ اس انداز سے یقینی بنائے کہ ملک بھر میں کسی بھی شعبہ میں کوئی بھی فرد ملک کے نظریے کے خلاف دعوت وپرچار نہ کر سکے۔ نہ تقریر میں، نہ تحریر میں، نہ کتاب اور لٹریچر کی صورت میں، نہ اخبار، نہ ریڈیو اور ٹی وی کے

ذریعہ، نہ جلسے جلوس اور مظاہروں کے ذریعے اور نہ خفیہ اور زیر زمین تحریکوں کے ذریعے۔
قوتِ فاقدہ کی وجہ سے چین میں پچھلے سال مغربی جمہوریت کے حق میں طلباء کے مظاہرے کو ٹینکوں سے کچلا گیا۔ اسی طرح پچھلے ۷۰ سالہ لینن ازم کے دور میں کوئی مائی کا لعل پورے روس میں لینن ازم کے خلاف زبان سے ایک لفظ نہ نکال سکا۔

مغرب میں مغربی جمہوریت کے بنیادی اصول "اکثریت" کی مخالفت کا کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ لہٰذا دین اسلام کی نظریاتی مملکت کی انتظامیہ کا بھی اوّلین فریضہ یہ ہوگا کہ ملک کے جملہ شعبوں میں دین اسلام کے بنیادی عقائد اور قرآن و سنت پر مبنی نظام کے خلاف ہر قول و عمل کو ممنوع قرار دے کر ملک کی تطہیر کرے۔ چاہے یہ قول و عمل، نصابِ تعلیم بشمول فلسفہ نفسیات، جنسیات، پولیٹیکل، سائنس وغیرہ میں ہو، یا یہ قول و عمل سیاسی پارٹیوں کے منشور یا نظریات یا نشریاتی اور اشاعتی اداروں یا کسی فرد کی تصنیف و تالیف یا تحریر و تقریر میں نظر آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر ضروری امر کو اسلامی تعلیمات کے مطابق کرنا ہوگا تاہم اس کام کی تکمیل کے لئے تدریجی طریقہ اپنانا ہوگا۔

قوت اجرائیہ کے اس اقدام میں ظاہری مشکلات

مغربی جمہوریت میں پھلے پھولے معاشرہ کو اسلامی نظام کی کسی بھی شعبے میں ابتدا عجیب و غریب نظر آئے گی، جب کہ اس کی یہی غریبی درحقیقت اس کی حقانیت کی علامت ہوگی۔ بیشتر تبدیلیوں مثلاً تعلیمی نصاب، ریڈیو، ٹی وی، اخبارات کے موضوعات میں تبدیلیاں یا سیاسی میدان میں اسلامی تبدیلیاں لانے میں سرے سے کوئی مشکل نہیں ہے۔ سائنس اور فلسفہ کے سلسلۂ علل یا سبب ارتقاء میں صرف اتنا اضافہ یا جائے گا، کہ یہ نظام اتفاقی یا اندھی، بہری، بے جان مادہ کی کارکردگی نہیں بلکہ ایک علیم و حکیم و قدیر ذات کی مشیت کے تحت ہے۔

البتہ بعض شعبوں مثلاً سودی نظام کو غیر سودی بنانے اور ماحول کو مسلمان بنانے میں کچھ قربانیاں دینا پڑیں گیں، مگر وہ اتنی ہرگز نہیں ہونگی جتنی قربانیاں سوشلزم اور کمیونزم کے لئے دی گئیں۔ اور اتنی بھی نہیں ہونگی جتنی جمہوریت کے ہر انتخاب میں دینا پڑتی ہیں، البتہ لوگوں کی جہالت اور یورپ کی پروپیگنڈہ مہم کا زبردست دباؤ پڑے گا، جس کے لئے ثابت قدم رہنا از حد ضروری ہوگا۔

آئی جے آئی کے دور میں وفاقی وزراء نے سود کے جواز میں جو بے سروپا بیانات دیئے وہ میرے اس اندیشے کا ثبوت ہیں۔ چنانچہ وفاقی شرعی عدالت کے ۱۴ نومبر ۱۹۹۱ء کے سودی نظام کے امتناع کے تاریخی فیصلے کے بعد وفاقی وزیر خزانہ سردار آصف احمد علی نے "سود جائز ہے" کا فتویٰ صادر کیا اور وجہ یہ بیان کی کہ "اگر سودی نظام کو ختم کر دیا جائے تو پاکستان کے پورے مالیاتی نظام کی بنیادیں ہل جائیں گی"۔

(روزنامہ پاکستان لاہور۔ ۱۶ جنوری ۱۹۹۲ء)

اس پر ملک بھر کے علماء نے سردار صاحب کو متنبہ کیا کہ سود کو حلال سمجھنا کفر وار تداد کے مترادف ہے۔ مگر موصوف اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ اسی دوران ایک اور وفاقی وزیر اور عوامی نیشنل پارٹی کے صدر اجمل خٹک صاحب کا بیان اخبار میں چھپا، موصوف نے فرمایا کہ:

"سود حرام ہے، لیکن معاشی ڈھانچے کو برقرار رکھنے کے لئے اجتہاد کرنے کی ضرورت ہے"۔ (اخبار جنگ لاہور۔ ۸ مارچ ۱۹۹۲ء صفحہ ا کالم ۱)

نہ جانے خٹک صاحب کے اجتہاد سے کس قسم کا اجتہاد مراد ہے، تاہم یہ بات یقینی ہے کہ جو لین دین، ربوٰی اور سود ہو اس میں کسی قسم کے اجتہاد کی گنجائش از روئے اسلام باقی نہیں رہتی۔ سود کی حرمت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے خود نص قرآنی میں صادر فرمایا ہے، اور نصوص قطعیہ میں کسی انسانی اجتہاد کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ سردار صاحب نے دعویٰ کیا

ہے، کہ اسلام میں سودی نظام کا کوئی متبادل نظام نہیں ہے۔ اگر سردار صاحب کے سر میں عقل سلیم کا تھوڑا سا حصہ ہوتا تو وہ اس قسم کا دعویٰ نہ کرتے۔

کیوں کہ کرۂ ارض پر پاکستان کے رقبے سے کئی گنا عظیم رقبہ پر قرآن وسنت کا خالص نظام حکمرانی خلافت راشدہ کے دور میں نافذ رہ چکا ہے۔

اور موجودہ ترقی یافتہ دور میں سود کی ملکیت کو ناجائز اور ممنوع ٹھہرا کر بھی دنیاوی لحاظ سے کمیونزم اور سوشلزم کا نظام معیشت کامیابی سے چل رہا ہے۔ معلوم نہیں پھر بھی ان کو سود کے بغیر ڈھانچہ گرتا ہوا کیوں محسوس ہو رہا ہے۔ جب کہ وہاں ڈھانچہ برقرار ہے۔

تو بتائیے کہ مغرب کی سرمایہ دارانہ اور مشرق کی اشتراکی، ہر دو انتہا پسندانہ معیشتوں کے درمیان اسلام کا معتدلانہ اقتصادی نظام کیونکر نا ممکن ہو سکتا ہے۔ افراط و تفریط یعنی کمی اور بیشی کی دو طرفہ انتہا پسندی کے درمیان اعتدال اور میانہ روی کے مقام کی موجودگی ایک منطقی اور سائنٹیفک بات ہے، اور وہ ہے اسلامی اقتصادیات۔ اسلام میں ''مضاربت'' نفع و نقصان اور شراکت کی اقسام مثلاً شرکت ''شرکت عنان'' اور ''شرکت وجوہ'' کے کتنے ابواب ہیں، جن میں سرمایہ، محنت اور ہنر کا لحاظ رکھتے ہوئے نفع اور نقصان کی تناسب اور عادلانہ تقسیم موجود ہے۔ تجارت، مزارعت، باغبانی، آجر، مستاجر حتیٰ کہ دلالی کمیشن ایجنٹ اور رفاہ عامہ کے لئے قرض حسنہ کے ابواب بھی موجود ہیں، خواہ ترقی آسمان پر جا پہنچے اسلام کا اقتصادی نظام اس کے دوش بدوش چل سکتا ہے، لیکن ان کے قابل عمل ہونے کے لئے واحد شرط یہ ہے کہ آپ دل و جان سے مسلمان ہو جائیں اور اسلام میں مکمل داخل ہو جائیں۔ اگر آپ مغربی جمہوریت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کا بلا سود مالیاتی نظام چاہتے ہیں، تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ آپ عین آدھی رات کو اپنے سر پر دوپہر کا سورج دیکھنا چاہتے ہیں۔

؎ ایں خیالست و محال است و جنون

قوت اجرائیہ کا دوسرا فریضہ نصابِ تعلیم کو علوم الانبیاء یعنی عبادات اور تسخیر کائنات کے سانچے میں ڈھالنا

ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے نصاب تعلیم کو علوم الانبیاء علیہم السلام کے نہج پر ملکی زبان میں رائج کریں، البتہ "اصطلاحات" خواہ سائنسی ہوں یا فنی ان میں عربی اور فارسی کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ پچھلے صفحات میں "مسلمانوں کے سربراہ کے لئے شرائط اور اوصاف" کے عنوان کے تحت "اقسام العلوم الاسلامیہ" کے ضمن میں علوم الانبیاء پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

البتہ اتنی بات یہاں ذکر کرتا ہوں کہ انبیاء کے علوم کے دو شعبے ہیں۔

(۱) علوم العبادات (۲) علوم تسخیر کائنات۔

ان علوم کی ترویج و تحصیل کے خرچ اور اخراجات میں فیاضی، کھیل کود کے اخراجات میں "بخل" اور روز مرہ ضروریات زندگی کے اخراجات میں "کفایت شعاری" کو رہنما اصول کے طور پر اپنایا جائے۔ علوم الانبیاء کے عنوان کے ضمن میں یہ بات خود بخود سامنے آگئی ہے، کہ معلمین، متعلمین، تعلیم اور طریقہ تعلیم چاروں اجزا بطریقہ اسلام ہونے چاہئیں۔ نیز علوم الانبیاء کے عنوان کے تحت تا قیامت جملہ دنیاوی اور روحانی ترقیاں حتیٰ کہ مادّی کائنات کو برق رفتاری سے پھلانگنے تک کے امکانات آجاتے ہیں، جن کی تکمیل اسرافیل علیہ السلام کے صور پھونکنے پر مکمل ہوسکے گی۔

قوت اجرائیہ کا تیسرا فریضہ نظام اسلام اور اس کی ترقی کے تحفظ کو یقینی بنانا

چونکہ اس مادی دنیا میں "خیر" کے دوش بدوش "شر" اور اصلاح و تعمیر کے پہلو بہ پہلو فساد و تخریب ہمیشہ موجود رہتا ہے بقول حافظ۔

ازیں چمن گلے بے خار کس چید آری
چراغ مصطفوی با شرار بو لہبی است

اس لئے حکومت کا فرض ہو گا کہ ملک و ملت کو جہاد کے لئے جدید ترین آلات حرب و ضرب اور جذبہ جہاد سے مالامال رکھے اور عیش و عشرت اور ناز و نعم کی زندگی کی جگہ ملت کو مہم جویانہ اور مشکل پسندانہ زندگی میں مشغول رکھے۔ اقبال کہتا ہے ۔

تنش از سایۂ بال تذرو لرزہ میگرد
چوں شاہین زادۂ اندر قفس با دانہ میسازد

ترجمہ : جب شاہین کا بچہ قفس کے اندر مفت خوری کا عادی بن جائے۔ تو وہ چکور جیسے پرندوں کا سایہ پڑنے سے بھی لرز اٹھتا ہے۔

فطرتی قوانین اللہ تعالیٰ نے کچھ اس طرح بنا دیے ہیں کہ بلندی، عروج اور ترقی کے حصول اور بقا کے لئے جہدِ مسلسل، جفاکشی، مشکل پسندی اور مہم جوئی، گویا کہ بنیادی شرائط ہیں۔ جب تک کسی فرد یا قوم نے اپنے اندر مشکلات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی صفت پیدا نہیں کی اس کی ترقی تو کیا اس کی بقاء بھی محفوظ نہیں رہی۔

نشان مرد حق با تو بگویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام الناس کا اعزاز آتش نمرود سے گذر کر، حجاز کی صحرا نوردی کر کے اور اہل وعیال کے رشتہ محبت پر چھری چلا کر حاصل ہوا۔

وقت کی کمی اور مقام کی تنگی کے باعث اتنا عرض کروں گا کہ از آدم علیہ السلام تا ابن دم فطرت کا قانون ہے، کہ جہدِ مسلسل باعث کمال وبقاء ہے اور سہل پسندی، نازک بدنی اور ضعیفی باعث زوال وفنا ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

محنت ہی پہ موقوف ہے آسائش گیتی
کھوئی میری راحت میری راحت طلبی نے

اختتامی کلمات

الحمدللہ الهادی کہ آج مورخہ ۱۵ر مارچ ۱۹۹۲ء یہ مسودہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

☆☆☆

﴿ کچھ مصنف کے بارے میں ﴾

شمس الرحمٰن حقانی کے قلم سے

ملک کے دینی حلقوں میں جنوبی وزیرستان کا ذکر ہو تو مولانا نور محمد کا نام اُبھرتا ہے، جنہوں نے اپنی دینی خدمات، جرات و بسالت اور حق گوئی و بے باکی کے باعث دینی و علمی حلقوں میں اپنے لئے قابل قدر مقام پیدا کیا ہے اور مشکلات و مصائب کے جانکسل دور سے گزرتے ہوئے آج وہ پورے علاقہ کے مسلمہ دینی و قومی رہنما کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں مولانا نور محمد جنوبی وزیرستان کے صدر مقام وانا کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب اور دارالعلوم کے مہتمم ہیں یہ دارالعلوم وہی ہے جو بھٹو حکومت کے دور میں بلڈوزروں کے ذریعہ وانا کے بازار کو مسمار کر دینے کے بعد بند کر دیا گیا تھا اور مولانا نور محمد پابند سلاسل ہو گئے تھے۔

خاندان: مولانا نور محمد ۱۹۳۶ء میں بنوں کے قریب بستی بیزان خیل میں ایک معروف علمی اور روحانی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نسب یہ ہے۔ مولوی نور محمد ابن مولوی نظر محمد ابن مولوی فتح محمد ابن مولوی احمد نور آپ وزیر قوم کے احمد زئی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور کئی پشتوں سے آپ کے خاندان میں دینی علوم اور روحانی تزکیہ و تربیت کا سلسلہ چلا آتا ہے۔ آپ کے والد محترم مولانا نظر محمد مرحوم نے ۳۵ء میں بنوں کے گرم علاقہ سے نقل مکانی کر کے جنوبی وزیرستان کے سرد مقام شکی کو اپنا مستقر بنایا اور پھر اس علاقہ میں رہنے والی بیزان خیل قوم آپ کو نے پیش امام ٹھرالیا۔

تعلیم: مولانا نور محمد کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں ہوئی اور والد مرحوم سے استفادہ کرنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں داخلہ لیا اسی سال مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ بحیثیت صدر مدرس قاسم العلوم میں تشریف لائے تھے، پانچ سال تک مدرسہ قاسم العلوم میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی ڈیرہ اسماعیل خان کی سیٹ کے لئے آپ نے 2 مہینے کی مسلسل سیاسی مہم چلائی۔ اور بنوں اور کوهاٹ کی سیٹوں کے لئے آپ کی پر جوش تقاریر نے لوگوں میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا تھا۔ مفتی صاحب کے زیر تربیت رہ کر آپ نے اپنی ذہنی و علمی صلاحیتوں کو مستحکم کیا۔ اسی دوران ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت نے پورے ملک کے مسلمانوں کو قادیانی گروہ کی اسلام دشمن سرگرمیوں اور عزائم کی طرف متوجہ کیا تو مولانا نور محمد نے وزیرستان میں وزیر قوم کو اس تحریک کی ضرورت و اہمیت سے آگاہ کرنے کے لئے سرگرم محنت کی اور قادیانیوں کے دجل و فریب کا پردہ چاک کر کے ان کے خلاف وزیر قوم کو بیدار کیا۔ آپ کی تعلیمی استعداد مضبوط تھی ہر سال نمایاں کامیابی حاصل کرتے رہے، بلکہ متعدد مواقع پر انعامات حاصل کئے اور دورہ حدیث کے امتحان میں بھی تمام ساتھیوں پر فائق رہے، اللہ

رب العزت نے آپ کو حافظہ کی نمایاں قوت دی ہے مسلم شریف کے سبق کے دوران ایک بار حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے کسی محدث کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس محدث کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ اسے اپنی ماں کا دودھ پینا تک یاد تھا، تو مولانا نور محمد صاحب نے فوراً عرض کیا کہ حضرت مجھے بھی نہ صرف اپنی ماں کا دودھ پینا بلکہ اس کا ذائقہ بھی یاد ہے۔

ذوق خطابت۔ ۱۹۵۵ء میں دورہ حدیث مکمل کیا اور سند فراغت حاصل کی۔ ملتان میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زیارت ومجلس سے بھی شادکام ہوتے رہے۔ شاہ جی کے ساتھ آپ کی عقیدت ومحبت کا یہ عالم تھا کہ شاہ جی کی علالت کے مواقع پر اکثر کہتے کہ اگر زندگی کا عطیہ کسی کو دینا ممکن ہوتا تو میں اپنی باقی ماندہ زندگی شاہ جی کو عطیہ دے دیتا امیر شریعت کی محبت وعقیدت کے ساتھ ساتھ ان کی خطابت اور اسلوب کلام سے بھی استفادہ کرنے کا موقع ملا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جنوبی وزیرستان میں مولانا نور محمد کا شمار ایک کامیاب اور جادو بیان مقرر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

طب وحکمت: سند فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے بوہڑ گیٹ ملتان میں ڈاکٹر فیروز الدین کے پاس ایک سال کا عرصہ گزارا طب وحکمت کے روزمرہ پیش آنیوالے مسائل کے بارے میں معلومات وواقفیت حاصل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ روزگار کا کوئی مستقل بندوبست کر کے دین کی بے لوث خدمت کی جاسکے۔

وانا کی خطابت: ۱۹۵۶ء میں وانا وزیرستان میں اپنے والد مرحوم کی معاونت میں درس وتدریس اور خطابت کے فرائض سنبھال لئے یہ وہ دور تھا جب تمام قبائل میں وزیر قبیلہ جہالت وپسماندگی کے حوالہ سے زیادہ معروف تھا ایک خاصی تعداد خانہ بدوشی اور گلہ بانی کے ساتھ زندگی بسر کرتی اور اسلام کے بنیادی ارکان تک سے واقف نہیں تھی اور رسوم وبدعات، جہالت وعصبیت، خانہ جنگی اور رقص وسرود کا ہر طرف دور دورہ تھا چنانچہ آپ کو اُن تمام فتنوں کا سامنا کرنا پڑا آپ کے مواعظ میں بے راہروی کی مخالفت نمایاں ہوتی تھی جس کی وجہ سے بیشتر طبقے آپ کے مخالف بلکہ دشمن ہو گئے۔ مگر آپ نے عزم واستقامت کا دامن نہ چھوڑا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر ان رکاوٹوں اور مخالفتوں کی پروانہ کرتے ہوئے اپنے مشن پر کاربند رہے اور بالآخر مخالفت کے بادل آہستہ آہستہ چھٹ گئے اور ایک وقت وہ بھی آیا جب علاقہ کے لوگوں کی بے پناہ عقیدت اور جذبہ اطاعت کے باعث آپ کو جنوبی وزیرستان کا بے تاج بادشاہ کہا جانے لگا۔

جامع مسجد کی تعمیر: ۱۹۶۲ء میں آپ نے وانا کی جامع مسجد کی تعمیر کا کام شروع کیا جو آج جنوبی وزیرستان کی عظیم اور خوبصورت مسجد کی حیثیت سے لوگوں کی توجہات کا مرکز ہے۔ جامع مسجد سیاہی مائل سنگ مرمر سے بنائی

گئی ہے اور اس کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے مسجد کی تعمیر کا کام دس سال میں مکمل ہوا اور اس کے ساتھ ہی آپ نے دارالعلوم وزیرستان کی بنیاد ڈالی جس میں اس وقت چھ سو سے زائد طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں درس نظامی کے مروجہ علوم بمع دورہ حدیث شریف کے ساتھ ساتھ حفظ وقرات قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے اور ظہر کے بعد (ایف۔اے) تک مروجہ سکول کا نصاب بمع کمپیوٹر کلاسز پڑھایا جاتا ہے اور مدرسہ البنات کا شعبہ بھی قائم کیا گیا ہے جس میں دینی اور عصری علوم کی تعلیم کے لئے علیحدہ باپردہ (۷) معلمات کام سرانجام دے رہی ہیں بنات کے شعبے میں فی الحال ۱۵۰ لڑکیوں کا دارالاقامہ میں رہنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ آئندہ اس تعداد میں اضافے کے پروگرام کو خصوصی اہمیت دی جائے گی۔ اس شعبے میں کل تعداد بنات کی تقریباً (۲۵۰) تک ہے اور آئندہ یہ تعداد کافی حد تک بڑھ سکتی ہے۔ اس وقت ۳۵ اساتذہ دارالعلوم میں تدریس وتعلیم کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں دیگر اخراجات کے علاوہ طلبہ کی رہائش، خوراک، علاج اور دیگر ضروریات کی کفالت بھی دارالعلوم کے ذمہ ہے اور یہ سب اخراجات کسی مستقل آمدنی کے بغیر صرف اہل خیر مسلمانوں کے صدقات وعطیات سے پورے ہوتے ہیں۔

اصلاحی خدمات: مولانا نور محمد نے علاقہ میں رسوم وبدعات کے علاوہ ناچ گانے، منشیات اور دیگر اخلاقی جرائم کے سد باب کے لئے بھی جراتمندانہ جدوجہد کی وزیر قوم میں اپنی مسلمہ حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے قضاء کا شرعی نظام اس حد تک قائم کیا کہ علماء کو حکم بنا کر لوگوں کے تنازعات کے فیصلے شریعت کے مطابق کرتے رہے۔

بھٹو سے ملاقات: سابق وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جنوبی وزیرستان میں مولانا نور محمد کی مقبولیت اور اثر ورسوخ کو دیکھتے ہوئے آپ کو اپنے دام میں لانے کو کوشش کی ایک بار وزیرستان میں ان سے ملاقات ہوئی۔ دوسری مرتبہ راولپنڈی میں پرائم منسٹر ہاؤس میں بلا کر پیپلز پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی اور مختلف قسم کی پیش کشیں کیں مگر آپ نے انہیں ٹال دیا۔

انتقام کی زد میں: اس انکار کے بعد علاقہ میں آپ کے اثر ورسوخ کو توڑنے اور مقبولیت کو کم کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال کئے گئے مسعود قبیلہ کے ساتھ وزیر قبیلہ کی روایتی مخالفت اور رقابت کو ابھارنے کے لئے سازشیں کی گئیں دونوں قبائل کے درمیان نفرت اور اشتعال کو اس حد تک بڑھایا گیا کہ بات مسلح تصادم تک پہنچ گئی اور گمل روڈ کا حساس تنازعہ انتہا تک جا پہنچا۔ اسی فضا میں مولانا نور محمد کو جون ۷۵ء میں وانا چھاؤنی میں مذاکرات کے بہانے بلا کر گرفتار کر لیا اور تین سال کے لئے ڈیرہ اسماعیل خان جیل بھیج دیا گیا علاقہ کے عوام اور قبیلے

صورت حال معلوم ہونے پر چھاؤنی کا محاصرہ کر کے ۱۲ گھنٹے کے اندر ان کی رہائی کا الٹی میٹم دیا جس کے اندر انہیں رہا کرنا پڑا۔ مگر منتقم مزاج حکومت نے اس شکست کا انتقام یوں لیا کہ ملیشیا اور دیگر سرکاری فورسز کے ذریعے وانا کے بازار پر گولہ باری کی گئی پھر ٹینکوں کی مدد سے فوج کشی کی گئی اور بلڈوزر چلا کر جلے ہوئے مکانات کو سطح زمین کے ساتھ برابر کر دیا گیا۔ حملہ آوروں نے مولانا نور محمد کے گھر کا سامان لوٹ لیا، موٹر کار ضبط کر لی، بلڈوزر کے ذریعہ مکان مسمار کر دیا، دارالعلوم کے ایک بڑے حصہ کو مسمار کر کے طلبہ کا سامان لوٹ لیا اور دارالعلوم کو سر بمہر کر دیا، جامع مسجد کو فوج نے قبضہ میں لے لیا مسجد کے سر بفلک میناروں پر مورچے بنالیے اور پورے علاقہ میں کرفیو لگا دیا۔ مولانا نور محمد کو ان کے دس شاگردوں اور بھائی سمیت گرفتار کر لیا۔ مولانا موصوف کو جرگہ سے دس سال قید دلوائی، ان کے بھائی حافظ لعل محمد کو پانچ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ جبکہ ان کے رفقا شہزادہ سردار غلام رسول اور غازی محمد کو ۴ سال، سعد اللہ خان، سراج الدین اور تاج محمد کو دو دو (۲) سال قید کی سزا دی گئی اس پر بس نہیں بلکہ اس وقت کے پولیٹیکل ایجنٹ مسٹر عبد اللہ نے مولانا نور محمد کے جملہ خاندان کو عورتوں اور بچوں سمیت علاقہ بدر کر دیا حتی کہ بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان میں انکی اقامت گاہوں پر بھی پولیس مسلسل چھاپے مارتی رہی اور مولانا نور محمد کے بڑے بیٹے تاج محمد کو بھی گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔

مارشل لاء حکومت: بھٹو حکومت کے خاتمہ کے بعد علاقہ کے عوام کو یہ توقع ہو گئی کہ مارشل لاء حکومت ان صریح مظالم کی تلافی کرے گی مگر ایسا نہ ہوا اور مولانا نور محمد اپنی سزا قانون کے مطابق پوری کر کے رہا ہوئے ان کی رہائی کے بعد دارالعلوم اور جامع مسجد کو ان کے حوالہ کر دیا گیا جہاں آپ پورے وقار اور شان و شوکت کے ساتھ دینی وعلمی خدمات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے مولانا نور محمد کی اسارت کے دوران ان کے ایک اور بھائی مولوی نیاز محمد کو بھی حکومت نے مفرور قرار دے دیا اور مجبوراً انہوں نے پہاڑوں میں پناہ لی۔ پولیس نے متعدد بار ان کی گرفتاری کے لئے چھاپے مارے مگر کامیاب نہ ہو سکے مولانا موصوف کی رہائی کے بعد وہ بھی وانا میں آگئے اور ان کے خلاف قائم مقدمات واپس لے لئے گئے۔ آج مصائب وآلام کے بادل چھٹ چکے ہیں اور تمام سازشیں تار عنکبوت کی طرح ہوا میں بکھر چکی ہیں مگر مونالا نور محمد اور ان کا خاندان پوری عزت و وقار کے ساتھ علاقہ کے عوام کی دینی وقومی رہنمائی میں مصروف ہے اور تاریخ نے ایک بار پھر حقیقت کو دنیا کے سامنے آشکارا کر دیا ہے۔ سچائی کو اگر عزم واستقامت کا ساتھ نصیب ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے شکست دینے میں کامیاب نہیں ہوسکتی اور حق بہر حال غالب آکر رہتا ہے۔ ۱۹۹۷ء میں جب قبائلی عوام کو ووٹ کا حق ملا تو جنوبی وزیرستان ایجنسی سے احمد زئی وزیر قبیلہ سے تعلق رکھنے والے آپ پہلے شخص تھے جس نے قومی اسمبلی کی سیٹ بھاری اکثریت سے جیتی۔ اور اسمبلی میں قبائلی ممبران کی مشہور خاموشی کو توڑتے ہوئے متحرک رہ کر فعال کردار ادا کیا اور ہر موقع پر اسلامی اقدار اجاگر

کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور آخر کار آپ کی مساعی سے قومی اسمبلی سے شریعت بل پاس ہوا۔ آپکی تصانیف کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

آپ کی تصانیف

1 "علوم الانبیاء اور تسخیر کائنات" موضوع کے لحاظ سے ایک نئی تحقیقی کاوش ہے اور اس کتاب میں امت مسلمہ کے لئے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جدید علوم سے استفادہ کے لئے نئے زاویوں کا تعین کیا گیا ہے۔

2 "ایضاح المقال فی رؤیت الھلال" یہ بھی آپ کی حالات کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فقہی نقطہ نگاہ سے ایک لاجواب تصنیف ہے جس میں رمضان اور عید کا چاند نظر آنے، شہادت لینے اور اس بارے میں حکم کرنے کے شرعی اختیارات کو زیر بحث لایا گیا۔

3 "جہاد افغانستان" مولانا نور محمد جنوبی وزیرستان کی مرکزی جامع مسجد اور دارلعلوم میں تعلیمی و دینی خدمات سر انجام دینے کے ساتھ ساتھ افغانستان کے جہاد آزادی کے ایک بڑے معاون اور مددگار کی حیثیت سے بھی مصر وف جہد و عمل ہیں اور روس جیسی عظیم قوت کے مقابلہ میں بے سروسامانی کے باوجود جہاد جاری رکھنے والے افغان مجاہدین کی امداد و حمایت کے لئے نہ صرف سرگرم ہیں بلکہ اس اہم دینی فریضہ کی بروقت ادائیگی کے لئے وزیرستان اور پاکستان کے دیگر دینی و عوامی حلقوں کو بھی دعوت دے رہے ہیں۔ کتاب "جہاد افغانستان" ان کے اسی جذبہ صادقہ کی آئینہ دار ہے۔

4 "پیش آمدہ نئے مسائل کی فقہی تحقیق" یہ کتاب تحقیق کے لحاظ سے انشاء اللہ لاجواب رہے گی۔ پریس میں جانے کے لئے تیار ہے۔ اس میں درپیش جدید کاروباری معاملات و مسائل کے ٹھوس دلائل کی روشنی میں حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر عالم اور مفتی کے لئے انشاء اللہ یہ ایک گراں قدر تحفہ ثابت ہوگا۔

5 "اسلامی انقلاب اور جہاد اسلام" شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا نور محمد صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی نئی تالیف "اسلامی انقلاب اور جہاد اسلام" کا انداز اگرچہ سابقہ تصنیف سے مختلف ہے، مگر موضوع اور سیاق وسباق کے حوالے سے اسی سلسلہ کی اہم کڑی ہے۔ یوں تو کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس کے نام سے ہی بخوبی لگایا جاسکتا ہے مگر اسے پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی پوری زندگی جہاد فی سبیل اللہ میں گزاری ہے۔ دور حاضر میں امت مسلمہ کو بالعموم اور مجاہدین اسلام کو بالخصوص درپیش چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ان شاء اللہ! یہ تصنیف منارۂ نور اور اسلامی انقلاب کی منزل کے حصول میں مہمیز ثابت ہوگی۔ آخر میں ہم اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا گو ہیں کہ خداوند ذوالجلال مولانا نور محمد کی ان خدمات جلیلہ کو قبولیت کے ساتھ سرفراز فرمائیں اور اسی جذبہ کے ساتھ دینی و قومی خدمات کو جاری رکھنے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔

مصنف کی دیگر تصانیف

- ☆ جہاد افغانستان
- ☆ علوم الانبیاء اور تسخیر کائنات
- ☆ زکوۃ اور عشر کے چند معرکۃ الآراء مسائل
- ☆ شجرکاری کے فوائد شریعت اور سائنس کے آئینے میں
- ☆ نور الابصار فی عشر الاشجار (فارسی)
- ☆ مسئلہ خضاب میں مسلک اعتدال
- ☆ رمضان شریف میں انجکشن لگوانے کا حکم
- ☆ ڈاڑھی کے دینی اور دنیاوی فوائد
- ☆ مشترکہ خاندانی نصاب اور شرعی حجاب
- ☆ اسلامی انقلاب اور جہاد اسلام
- ☆ ایضاح المقال فی رؤیۃ الہلال
- ☆ وزیر اور وزیرستان (زیر ترتیب)
- ☆ دیار غیر (زیر ترتیب)
- ☆ جدید فقہی رسائل و مسائل (زیر ترتیب)